WWW.PAKSOCIETY.COM
اپریل 2015
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

## انٹرویو



## ناول



## مکمل ناول



## ناولٹ



## افسانے



## نظمیں غزلیں




زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا--- روپے

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز



اپریل 2015
جلد 29 شمارہ 8
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91، بی پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

شعاع کا اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے کچھ متعین کردہ قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ انسان اس کائنات کا مرکز و محور ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کو قوانین قدرت کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو دونوں جہان میں اس کے لیے کامیابی اور کامرانی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ قدرت کے متعین اصولوں سے انحراف تباہی و بربادی ہے۔ غلط راستوں پر چل کر وقتی کامیابی ضرور حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن غلط راستوں کا انتخاب کرنے والے بالآخر ناکام ہی ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت کا ایک قانون مکافات عمل بھی ہے۔ ظلم، جبر، زیادتی کرنے والے بچ نہیں سکتے۔ انہیں جلد یا بدیر سزا ضرور ملتی ہے۔

زندگی میں راست سوچ اور درست عمل ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ صحیح سمت کا شعور سب سے بڑی دانائی ہے۔ رہنمائی بھی انہیں ہی ملتی ہے جو ذوق سفر رکھتے ہیں۔ اور کامیاب وہی ہوتے ہیں جو جستجو کرتے ہیں۔

## سیاہ حاشیہ،

صائمہ اکرم کا نام قارئین کے لیے نیا نہیں ہے۔ انہوں نے بے شمار افسانے، ناولٹ اور ناول لکھے ہیں۔ صائمہ کی تحریروں کی نمایاں خوبی کہانی کا بہاؤ ہے۔ ان کے کردار ہمیشہ فیصلہ کن اور دوٹوک رویہ اختیار کرتے ہیں جس کی بنا پر کہانی تیزی سے آگے بڑھتی ہے اور قاری کی توجہ بھٹکنے نہیں پاتی۔

"دیمک زدہ محبت" کے بعد وہ آپ کے لیے "سیاہ حاشیہ" لے کر آئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی آپ کو پسند آئے گا۔

## اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول ۔ پہلی بار،
- نگہت سیما کا مکمل ناول ۔ خواب تھا کوئی،
- زرین آرزو کا مکمل ناول ۔ زندگی پھر مسکرائی،
- صائمہ اکرم اور نازیہ کنول نازی کے ناولٹ،
- کنیز نور علی، ایمل رضا، زینت زدونی اور نیر کاشف کے افسانے،
- عادل مراد اور مریم مراد کا بندھن،
- سمیرا حمید آپ کے سوالات کے ساتھ ۔ روبرو،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہم آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

اک لفظ کُن ہی باعثِ نقش و نگار ہے
یارب تُو کائنات کا پروردگار ہے

یہ عرش و فرش، لوح و قلم، مہر و ماہ و نجم
ہر شے پہ یا کریم تجھے اختیار ہے

معبود ہے تُو ہی یہاں مسجود ہے تُو ہی
ہر چیز تیرے سامنے سجدہ گزار ہے

میرے مقدّرات کی تحریر کو بدل
بندہ نوازیوں کا تیری انتظار ہے

تُو ہے غفور، تُو ہی رحیم و کریم بھی
بندوں کے حال پر کرم بے شمار ہے

اے برگؔ اس کی کون ثنا کر سکے یہاں
یہ حمد شاعری کا میری شاہکار ہے

برگؔ یوسفی

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفّی، ہر آن تسلّی ہے!
ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل، سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہے درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مولانا محمد علی جوہر

ادارہ

## دنیا میں تکلیف

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آزمائشوں کے ذریعے سے اس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے) اور جب اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے' یہاں تک کہ قیامت والے دن اس کو پوری سزا دے گا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا۔

''بدلے میں بڑائی آزمائش میں بڑائی کے ساتھ ہے' (یعنی آزمائش جتنی عظیم ہوگی' بدلہ بھی اسی قدر عظیم ہوگا)۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتا ہے تو اس کو آزمائش سے دوچار فرما دیتا ہے' چنانچہ جو (اس سے) راضی ہوتا ہے' اس کے لیے (اللہ کی) رضا ہے اور جو (اس کی وجہ سے اللہ سے) ناراض ہوتا ہے' اس کے لیے (اللہ کی) ناراضی ہے۔''

(اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا ہے: اس کی سند حسن ہے۔)

### فوائد و مسائل :

1 ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آزمائشیں بھی اس دنیا میں مومن کے لیے ایک نعمت ہیں' جن سے بقدر آزمائش' اس کے گناہ معاف ہوتے اور عنداللہ اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے' اس لیے ہر آزمائش اور تکلیف میں صبر و رضا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ شرف و فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی' بلکہ بے صبری سے گناہوں میں مزید اضافہ ہوگا۔

2 ۔ خیر اور شر کا خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اہل اللہ کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ہر خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور شر کی نسبت اپنی جانب کرتے ہیں جیسا کہ آدم علیہ السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء کی منقول دعاؤں سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر شر انسانوں کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے کیونکہ اس کا کوئی امر حکمت اور خیر سے خالی نہیں ہوتا اور پھر ہم اس بات کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک کام ایک آدمی کے حق میں شر ہوتا ہے اور دوسرے کے حق میں خیر۔

3 ۔ حدیث میں مذکور جملے ''جب اللہ کسی بندے سے برائی کا ارادہ کرتا ہے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہوں کی وجہ سے بڑی آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے' اور اسے خیر سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

## صبر

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک لڑکا بیمار تھا۔ ابو طلحہ (جب کام کاج کے لیے) باہر چلے گئے تو لڑکا فوت ہو گیا۔ جب واپس آئے تو پوچھا۔

''میرے بیٹے کا کیا حال ہے؟''

تو ام سلیم نے کہا اور وہ بچے کی ماں تھیں۔

''وہ پہلے سے کہیں زیادہ سکون میں ہے۔''

چنانچہ بیوی نے ان کے سامنے رات کا کھانا رکھا جو انہوں نے تناول کیا' پھر بیوی سے قربت کی۔ جب ابوطلحہ فارغ ہو گئے تو بیوی نے بتلایا کہ (بچہ تو فوت ہو گیا ہے) اب اسے دفنا دو!"

چنانچہ جب انہوں نے صبح کی تو ابوطلحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ سارا ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے پوچھا۔

"کیا تم نے رات کو قربت کی تھی؟"

انہوں نے جواب دیا "ہاں!"

آپؐ نے دعا فرمائی۔

"اے اللہ! ان دونوں کے لیے برکت عطا فرما۔"

چنانچہ (اس دعا کے نتیجے میں' مدت مقررہ کے بعد) ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ (حضرت انس فرماتے ہیں کہ) مجھ سے ابوطلحہ نے کہا (ابوطلحہ حضرت انس کی والدہ ام سلیم کے دوسرے خاوند' یعنی حضرت انس کے سوتیلے باپ تھے۔ ان کے پہلے خاوند مالک بن نضر تھے' جو اسلام لانے کی بجائے شام چلے گئے تھے۔ اور وہیں فوت ہو گئے۔ ان کی والدہ نے اس کے بعد ابو طلحہ سے نکاح کر لیا۔) "اس بچے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ" اور کچھ کھجوریں بھی ساتھ دے دیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "کیا اس کے ساتھ کوئی چیز ہے؟"

انہوں نے کہا: ہاں' کچھ کھجوریں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کھجوریں لے لیں اور ان کو منہ میں چبایا' پھر وہ اپنے منہ سے نکال کر بچے کے منہ میں ڈال دیں اور (یوں) اسے گھٹی دی اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عیینہ نے کہا "انصار کے ایک آدمی نے انہیں بتایا کہ میں نے (اس) پیدا ہونے والے (لڑکے) عبداللہ کی اولاد سے نو لڑکے دیکھے' سب کے سب قرآن کے قاری تھے۔

## صبر

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا جو ام سلیم کے بطن سے تھا' فوت ہو گیا۔ تو ام سلیم نے اپنے گھر والوں سے کہا۔

"تم ابوطلحہ کو ان کے بیٹے کے بارے میں مت بتلانا' میں خود ہی ان کو یہ بات بتلاؤں گی۔"

چنانچہ ابوطلحہ آئے تو ام سلیم نے رات کا کھانا ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے کھایا پیا۔ پھر پہلے سے کہیں زیادہ بن سنور کے ان کے پاس آئیں۔ قربت کی پھر کہا۔

"اے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ! ذرا بتلاؤ کہ اگر کچھ لوگ کسی گھر والوں کو کوئی چیز عاریتاً (عارضی طور پر) دیں' پھر وہ اپنی عاریت کے طور پر دی ہوئی چیز واپس مانگیں تو کیا ان کے لیے جائز ہے کہ وہ دینے سے انکار کر دیں؟"

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں۔"

چنانچہ ام سلیم نے کہا۔ "تم اپنے بیٹے کے بارے میں اللہ سے ثواب کی امید رکھو۔"

(یعنی تمہارا بیٹا بھی' جو اللہ ہی کی دی ہوئی امانت تھی' اس نے اسے واپس لے لیا ہے۔)

یہ سن کر وہ غضب ناک ہوئے اور فرمایا۔

(جب میں گھر آیا تو کچھ بتلائے بغیر) تو نے مجھے یوں ہی چھوڑے رکھا کھانے پینے اور قربت کے بعد تو نے مجھے میرے بیٹے کی (وفات کی) خبر دی؟ (اس کے بعد) وہ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ ہوا وہ بیان کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر دعا فرمائی۔

"اللہ تعالیٰ تم دونوں کے لیے تمہاری اس رات میں برکت عطا فرمائے۔"

چنانچہ ام سلیم کو حمل قرار پا گیا۔

(راوی حدیث) حضرت انس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے۔ حضرت ام سلیم بھی (اپنے خاوند' ابوطلحہ کے ہمراہ)

آپؐ کے ساتھ تھیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب (سفر سے) مدینہ واپس تشریف لاتے تو رات کو تشریف نہ لاتے۔

جب یہ قافلہ مدینے کے قریب پہنچا تو ام سلیم کو درد زہ (زچگی کے عین وقت جو درد ہوتا ہے) شروع ہو گیا۔ چنانچہ ابو طلحہ ان کی خدمت کے لیے رک گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سفر جاری رکھا۔

حضرت انس نے کہا: "ابو طلحہ کہتے تھے: "اے رب! تو جانتا ہے کہ مجھے یہی پسند ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے باہر جائیں تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں اور جب آپ مدینے میں داخل ہوں تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی داخل ہوں۔ اور تو دیکھ رہا ہے کہ میں رک گیا ہوں" (جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے گئے ہیں۔)

ام سلیم نے (یہ سن کر) کہا: "ابو طلحہ! اب مجھے وہ درد محسوس نہیں ہو رہا جو پہلے مجھے ہو رہا تھا' اس لیے چلو۔"

چنانچہ ہم وہاں سے چل پڑے۔ جب وہ دونوں مدینہ پہنچ گئے تو انہیں پھر درد زہ شروع ہو گیا (جو پہلے ابو طلحہ کی دعا سے وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا۔) چنانچہ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا' تو میری والدہ (ام سلیم) نے مجھے کہا۔

"اس کو اس وقت تک کوئی دودھ نہ پلائے جب تک تم صبح صبح اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش نہیں کر دیتے۔"

چنانچہ صبح ہوتے ہی میں اسے اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ آگے باقی حدیث بیان کی (جو پہلے گزر چکی ہے)۔ (بخاری و مسلم)

**فوائد و مسائل:** 1۔ اس حدیث سے ہمیں معاشرتی زندگی کے لیے بہت سی ہدایات ملتی ہیں' مثلاً "ایک صابر و شاکر عورت کا کردار۔ کہ بچہ فوت ہو گیا لیکن کوئی جزع فزع' واویلا' بین اور نوحہ و ماتم نہیں کیا' حتیٰ کہ خاوند جب گھر آتا ہے تو پہلے ایک خدمت گزار بیوی کی طرح خاوند کی تمام ضروریات کا اہتمام کرتی ہیں اور اس کے بعد خاوند کو نہایت اچھوتے انداز سے بچے کی وفات کی اطلاع دیتی ہیں۔ جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خاوند کی خدمت اور اسے آرام و سکون پہنچانا ایک مسلمان عورت کا اولین فرض ہے۔

2۔ گھر میں خاوند کے لیے بناؤ سنگھار اور زیب و زینت کا اہتمام کرنا مستحسن ہے۔

3۔ ولادت کے بعد بچے کو کسی نیک آدمی کے پاس لے جا کر اس سے تحنیک کروانا (گھٹی دلوانا) جائز ہے۔

4۔ مصیبت میں جو اللہ کے فیصلے پر راضی رہتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے بہترین بدلہ عطا فرماتا ہے۔

5۔ مجاہدین کے ساتھ' خواتین بھی جہاد میں شریک ہو سکتی ہیں اور اپنی حدود میں رہ کر مجاہدین کی جو خدمت وہ بجا لا سکتی ہیں' بجا لائیں' مثلاً" زخمیوں کی مرہم پٹی' بیماروں کی تیمار داری' پانی روٹی وغیرہ کا انتظام۔

6۔ ایسا تعریض و کنایہ (توریہ) جائز ہے جس سے دوسرا شخص مغالطے میں پڑ جائے' تاہم وہ جھوٹ نہ ہو۔

7۔ میت گھر میں موجود ہو تو کھانا وغیرہ پکایا اور کھایا جا سکتا ہے' البتہ مستحسن یہ ہے کہ ہمسائے یا کوئی اور عزیز میت کے گھر والوں کے لیے کھانے کا بندوبست کریں۔

8۔ اہل علم کو چاہیے کہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کرے یا وہ کسی آدمی کو کسی مسئلے میں پریشان دیکھیں یا کسی کی کوئی اچھی بات ان کے سامنے آئے تو ان کے لیے دعا کریں۔

9۔ کسی کام کے جائز یا ناجائز ہونے میں شک ہو تو اہل علم سے دریافت کر لینا چاہیے۔

## طاقت ور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"طاقت ور وہ نہیں ہے، جو پچھاڑ دے 'اصل طاقت ور (پہلوان) وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔) (بخاری و مسلم)

**فائدہ :** اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ غصے میں انسان کو بے قابو نہیں ہونا چاہیے' بلکہ غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

## غصہ

حضرت سلیمان بن صرور رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور دو آدمی ایک دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا چہرہ (مارے غصے کے) سرخ ہو گیا' اور اس کی رگیں پھول گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسے دیکھ کر) فرمایا۔

"ترجمہ : میں ایک کلمہ جانتا ہوں' اگر یہ اسے پڑھ لے تو اس کا غصہ دور ہو جائے۔ اگر یہ شخص کہے

"اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔"

"میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔"

تو اس کا جوش و غضب ختم ہو جائے گا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کر۔" (بخاری و مسلم)

**فائدہ :** غصے کے وقت یہ شعوری احساس کہ یہ غصہ شیطانی وسوسہ ہے' مجھے شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے' یقیناً" غصے کے ازالے کے لیے بہترین نسخہ ہے۔ کاش کہ! مغلوب الغضب قسم کے لوگ اس نسخے پر عمل کر کے دیکھیں۔

## غصہ پینے والا

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص غصے کو پی جائے جب کہ وہ اسے نافذ کرنے پر قادر بھی ہو' اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اسے تمام مخلوقات کے سامنے بلائے گا اور اس سے کہے گا' کہ وہ جس حور عین کو چاہے اپنے لیے پسند کر لے۔"

(اسے ابوداؤد اور ترمذی رحمتہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔)

**فوائد و مسائل :** حور' حوراء کی جمع ہے' نہایت سفید رنگ کی خوب صورت عورت۔ عین' عیناء کی جمع ہے' موٹی آنکھوں والی۔ مراد دونوں سے' خوب صورت ترین عورت ہے' جو مومنوں کو جنت میں ملے گی۔

2 ۔ اس میں اس شخص کی فضیلت اور ضبط نفس اور اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے' جو قدرت و طاقت اور وسائل سے بہرہ ور ہونے کے باوجود' محض اللہ کا حکم سمجھ کر غصے کو پی جاتا ہے اور غصے سے بے قابو ہو کر اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

## وصیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی۔

"مجھے وصیت فرمایئے!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "غصہ نہ کیا کرو۔"

اس نے کئی مرتبہ اپنی درخواست دہرائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہر مرتبہ) اسے یہی وصیت کی: "غصہ مت کیا کرو!" (بخاری)

**فوائد و مسائل : 1 ۔** غصہ جو مذموم ہے اور جس سے روکا گیا ہے' یہ وہ غصہ ہے جو دنیاوی معاملات میں ہو۔ لیکن جو غصہ اللہ اور اس کے دین کے لیے ہو' یعنی اللہ کی حرمتیں پامال کرنے پر انسان کو غصہ آئے' تو یہ غصہ محمود و مطلوب ہے۔

2 ۔ جس کے مزاج میں تیزی اور غصہ ہو' اسے بار بار غصہ نہ کرنے کی تلقین کی جائے تاکہ اسے اپنی اس

کمزوری کا احساس ہو اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کرے۔

3 ۔ غصے سے شیطانی مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے' اس لیے یہ بہت ہی بری چیز ہے' اسی لیے اس موقع پر شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

4 ۔ عالم دین اور مربی کو مزاج شناس ہونا چاہیے' تاکہ وہ لوگوں کو ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق وعظ و نصیحت کرسکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خوبی تھی کہ آپ ہر سائل کو اس کے حالات اور طبیعت کے مطابق نصیحت فرماتے۔

5 ۔ بزرگوں سے ملنے اور ان سے نصیحت کی درخواست کرنے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور انسان کو اپنی کمزوریوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ دور حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جس کو دین کی چند باتیں معلوم ہو جائیں' وہ اپنے آپ کو علما سے بے نیاز سمجھ بیٹھتا ہے' حالانکہ اصلاح نفس اور حصول تقویٰ کی سرپرستی ضروری ہے۔

## آزمائشیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن مرد اور مومن عورت پر اس کی جان' اولاد اور مال میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں (جن سے ان کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں) یہاں تک کہ جب وہ اللہ کو ملتے ہیں (ان کو موت آتی ہے) تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: اس کی سند حسن صحیح ہے۔)

**فائدہ :** اس سے معلوم ہوا کہ مومن بطور خاص' آزمائشوں کا ہدف رہتا ہے اور اس میں اس کے لیے بھلائی کا پہلو یہ ہے کہ ان سے اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں' بشرطیکہ وہ صبر کا دامن پکڑے رکھے اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے۔

## عہدہ نہ ملنے پر صبر

حضرت ابویحییٰ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری آدمی نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عامل نہیں بناتے (کسی سرکاری کام پر مقرر نہیں فرماتے) جس طرح فلاں شخص کو آپ نے عامل بنایا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بلاشبہ تم میرے بعد اس صورت حال سے دوچار ہوگے کہ دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔ چنانچہ تم صبر کرنا' یہاں تک کہ مجھے (قیامت والے دن) حوض پر ملو۔" (بخاری و مسلم)

**فوائد و مسائل :** 1 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیش گوئی فرمائی تھی' وہ پوری ہو گئی' جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

2 حوض' وہ حوض کوثر ہے جو آپؐ کو جنت میں یا میدان محشر میں عطا کیا جائے گا' جہاں آپ اپنے دست مبارک سے اپنے متبع اور موحد مسلمان کو شراب طہور کے جام پلائیں گے' جس سے پینے والا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

3 عہدوں کی طلب اچھی بات نہیں ہے۔ ایسے طلب گاران عہدہ و منصب کو عہدے دینے سے روکا گیا ہے' البتہ صرف اس صورت میں عہدہ طلب کرنا جائز ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کو اس کا اہل تر سمجھے اور کوئی دوسرا اس جیسا سمجھ دار' معاملہ فہم اور صاحب زہد و تقویٰ نہ ہو جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کیا تھا۔

### سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- نیلم منیر

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹوگرافر ---------- موسیٰ رضا

# بندھن

## عادل مراد ہمراہ مریم مراد

شاہین رشید

بندھن کے سلسلے میں آج ہم وحید مراد کے صاحب زادے عادل مراد سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں۔ سینئر فنکار ہوں یا ان کی اولاد' دو باتیں مشترکہ ہوتی ہیں۔ گفتگو میں نرمی اور شائستگی اور وقت کی پابندی اور یہ چیزیں ہم نے آج کے فنکاروں میں نہیں دیکھیں۔ انٹرویو اس طرح دیتے ہیں۔ گویا ہم پر احسان کررہے ہوں' ابھی نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد۔ آدھے گھنٹے بعد کہیں گے "ارے ابھی تو مصروف ہیں۔ مزید ایک گھنٹے بعد کریں۔۔۔ پھر وہ وقت بھی آجاتا ہے تو۔۔۔ "چلیں کل کرلیں" یا پھر فون ہی نہیں اٹھاتے۔۔۔ خیر۔

"کیسے مزاج ہیں عادل مراد صاحب! آپ کے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"ڈراموں میں تو آپ کو دیکھتے ہی رہتے ہیں' آج کچھ فیملی انٹرویو ہوجائے' کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل بالکل۔۔۔ ضرور کریں۔"

"تو بتائیے کہ شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا۔۔۔ اور بچے کتنے ہیں اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"جی 27 دسمبر 2004ء میں ہماری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے دو بیٹے ہیں ہمارے' بڑے کا نام ایان ہے جو آٹھ سال کا ہے اور چھوٹا ارمان سات سال کا ہے۔"

"یہ بتائیے کہ مریم صاحبہ سے کہاں ملاقات ہوئی اور لو میرج ہے آپ کی یا ارینج؟"

"یہ باتیں تو آپ مریم سے پوچھیں۔ ویسے ہماری ارینج میرج ہے اور یہ میری امی کی پسند ہیں۔ کوئی ریلیشن بھی نہیں ہے۔ بس یہ تو اتفاق تھا کہ مریم کو دیکھا۔ فیملی میں بات ہوئی اور پھر رشتہ بھیجا اور بس میں نے انہیں لاہور میں ایک دعوت میں دیکھا تھا۔"

"میرا یہ ماننا ہے کہ پہلے انسان چیز کی پیکنگ دیکھتا ہے اور گھر لاکر جب پیکنگ کھلتی ہے تو پھر پتا چلتا ہے کہ اندر کیا ہے' تو جب مریم آگئیں تو کیسا پایا؟"

قہقہہ۔ "بہت زیادہ مختلف نہیں پایا' لیکن جب انسان ایک دوسرے کے قریب رہتا ہے تو پھر کھل کر سامنے بھی آتا ہے اور اچھائیاں برائیاں بھی سامنے آجاتی ہیں اور میں نے مریم میں اچھائیاں زیادہ دیکھی ہیں۔"

"سسرال کا کنبہ کتنا بڑا ہے۔ سالیاں کتنی ہیں؟ اور بیگم ہاؤس وائف ہیں؟"

"ماشاء اللہ تقریباً" 9 سالیاں ہیں۔۔۔ اور میرے سسرال والے لاہور میں رہتے ہیں اور ہم کراچی میں رہتے ہیں' بیگم ہماری بینکر ہیں۔"

"مزاج کی کیسی ہیں؟ لڑائی جھگڑا کرتی ہیں؟"

"مزاج کی تیز ہیں' بہت لڑائی جھگڑا کرتی ہیں اور گھر میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ملک کی طرح ہم بھی حالت جنگ میں رہتے ہیں۔ میں مذاق کررہا ہوں' اسے آپ سچ نہ سمجھ لیجئے گا۔ ویسے یہ ہے کہ جب ایک بولتا ہے تو دوسرا خاموش رہتا ہے تاکہ بات آگے نہ بڑھے۔"

"یقیناً" آپ مذاق کررہے ہوں گے' ورنہ دس سال نہ گزرتے۔ خیر فضول خرچ ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ اس معاملے میں تو وہ قابل تعریف ہے کہ بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہے۔ گھر کو سنبھالنا۔ چیزوں کو قرینے سے رکھنا' کوئی فضول خرچی نہ کرنا اس کی خوبیوں میں شامل ہے۔"

"اپنی کمائی اپنے تک محدود رکھتی ہیں یا ہاتھ بٹاتی

ہیں؟اور بیوی کو کمانا چاہیے کہ نہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ ضرورت ہی نہیں پڑتی اور ضرور کمانا چاہیے۔ اس کا ٹیلنٹ اور پڑھائی ضائع نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ بھی کام کرتے ہیں' بیگم بھی' دونوں ہی صبح نکل جاتے ہوں گے تو گھر کو مینیج کون کرتا ہے' کیا جوائنٹ فیملی ہے؟"

"جوائنٹ فیملی کیا ہوگی' بس میری مدر ہوتی ہیں ہمارے ساتھ اور ٹائم مینیج ہوجاتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ گھر میں میڈ بھی ہے' کک بھی ہے اور دیگر کام کرنے والی بھی ہے۔"

"شادی کے بعد ایک مرد کی لائف میں کتنی تبدیلی آتی ہے؟"

"مرد کی زندگی میں کافی تبدیلیاں آتی ہیں' آہستہ آہستہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے' جب ملک سے باہر تھا تو اکیلا رہتا تھا۔ کوئی ذمہ داری نہیں تھی تو میں سمجھتا ہوں کہ مرد کی زندگی میں تو بہت زیادہ چینج آتا ہے۔"

"محبت میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا ہے یا کمی آتی ہے؟"

"کمی تو نہیں آتی' شاید اظہار کم ہوجاتا ہے اور یہ فرق بھی آجاتا ہے کہ سالگرہ ہو یا شادی کی سالگرہ' سادگی سے مناتے ہیں۔"

"منہ دکھائی میں کیا دیا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟اور منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

"منہ دکھائی میں کچھ بھی نہیں دیا تھا' کیونکہ مجھے اس رسم کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کسی نے بتایا' نہ کسی نے مجھ سے پوچھا منگنی تقریباً ایک سال رہی' صرف بات ہوتی تھی کیونکہ میں ملک میں تھا ہی نہیں ہماری شادی بھی آج کے وقت کی طرح بہت دھوم دھام سے نہیں ہوئی' بہت سادگی کے ساتھ ہوئی اور مجھے مہندی کی رسم زیادہ اچھی لگی جوتا چھپائی میں خرچا بہت ہوتا ہے' (قہقہہ)..... اور ہنی مون کے لیے بھی گئے تھے۔"

"ظاہر ہے نوسالیاں ہوں گی تو خرچ تو ہوگا۔ بیگم کی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"ذمہ داری کا احساس ہے یہ اچھی عادت ہے اور بری عادت یہ ہے کہ شارٹ ٹمپر ہیں اور ہر بات میں شارٹ ٹمپر ہیں۔ ضدی بھی ہیں۔ اچھی عادت میں ایک یہ بھی ہے کہ کھانا اچھا پکاتی ہیں اور فرمائش کرکے کافی کھانے پکواتا ہوں اور مجھے زیادہ تر کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں جو کہ مریم اچھا پکاتی ہیں۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟اور بیوی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"میں تو وہ ہی محاورہ استعمال کروں گا کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے..... ایک ذمہ داری ہے جو نبھانی پڑتی ہے' مگر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ نئی جنریشن آجاتی ہے اور زندگی حسین ہوجاتی ہے اور بیوی کا خوب صورت ہونا انتہائی ضروری ہے..... (قہقہہ)..... سب سے پہلے تو انسان شکل ہی دیکھتا ہے۔"

"رشتے بنتے آسمانوں پہ ہیں اور ٹوٹتے زمین پہ' کون خطاکار ہوتا ہے' بیوی' شوہر یا رشتے دار؟"

"اگر میاں' بیوی کا رشتہ مضبوط ہو تو تیسرا ہاتھ اس میں آ نہیں سکتا اور اگر میاں' بیوی میں ہی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے تو پھر کسی کی بھی مداخلت سے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"اور جناب!جن لوگوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی' ان کے لیے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

ہنستے ہوئے..... "ہاں جب تک بچ سکتے ہو' بچو اور شادی کریں تو اپنے ساتھ اپنے پارٹنر کی Compatibility (ذہنی مطابقت) کے ساتھ کہ زندگی بڑا لمبا سفر ہے اور اگر آپ کے پارٹنر کا مائنڈ آپ کے ساتھ نہیں ملتا اور Compatibility آپ کے ساتھ نہیں ہوتی تو یہ جتنا خوب صورت ساتھ ہے' اتنا کمزور بھی ہے' یا جتنا خوب صورت سفر

ہے اتنا برا بھی ہو سکتا ہے۔"

"چلیں جی.... اب ذرا آپ کی بیگم سے بھی دو چار سوال ہو جائیں۔"

"کیوں نہیں.... ضرور۔"

## مریم عادل

"مریم عادل.... کیا حال ہیں آپ کے؟"

"اللہ کا شکر ہے.... اور آپ؟"

"جی الحمدللہ۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔ ماشاءاللہ دس سال ہو گئے آپ کی شادی کو.... اور آپ دونوں ہمارے ہاتھ ہی نہیں آئے؟"

"آپ نے کوشش ہی نہیں کی کبھی' ہم تو بڑی آسانی سے ہاتھ آجاتے ہیں۔"

"جی یہ تو ہے کہ سینئر لوگ اور اچھے آرٹسٹ بڑی آسانی سے نہ صرف ہاتھ آجاتے ہیں' بلکہ وقت کی بھی بہت پابندی کرتے ہیں۔ جبکہ آج کل کے آرٹسٹ اللہ معاف کرے' بہت نخرے دکھاتے ہیں.... خیر یہ بتایئے کہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"بس جاب.... بچے اور گھر.... یہ ہی مصروفیات ہیں میری۔ اس کے علاوہ کسی کام کے لیے ٹائم نہیں ملتا۔ میں بینک میں ہوں۔ صبح ساڑھے چھ بجے اٹھتی ہوں۔ تیار ہو کر اور بچوں کو تیار کر کے ایک بیٹے کو سات بجے اسکول چھوڑتی ہوں اور دوسرے کو ساڑھے آٹھ بجے' پھر بینک جاتی ہوں۔ لنچ بریک میں گھر آتی ہوں' بچے آچکے ہوتے ہیں۔ عادل پک کرتے ہیں بچوں کو.... بچوں کو دیکھ کر اور ضروری کام کر کے پھر واپس بینک چلی جاتی ہوں اور پھر شام کو جم سے ہوتی ہوئی آتی ہوں۔ بینک سے گھر تک میری دس منٹ کی ڈرائیو ہے' ایک گھنٹے کی بریک ہوتی ہے اور چونکہ مجھے بینک میں کام کرتے ہوئے کافی سال ہو گئے ہیں۔ اس لیے پندرہ منٹ آگے پیچھے ہو جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میں بنیادی طور پر لاہور سے تعلق رکھتی ہوں اور وہیں میری پرورش ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی' شادی کے بعد کراچی آگئی۔ ہم سات بہن' بھائی ہیں' چھ بہنیں اور ایک بھائی ہے اور گریجویٹ ہوں میں۔

14 اگست میری پیدائش کا دن ہے۔"
"اچھا؟ عادل صاحب تو کہہ رہے ہیں کہ میری 9 سالیاں ہیں۔"
قہقہہ... "اچھا... اصل میں میرے بھائی، بہنیں شاید کچھ زیادہ ہیں، اس لیے انہیں یاد نہیں رہتا۔ بس چھیڑتے رہتے ہیں اور میں ہنستی رہتی ہوں۔ پہلے تو بچے اتنے ہی ہوتے تھے اور اب تو بس دو یا تین ہوتے ہیں۔ کیونکہ آج کل کے بچے بہت ڈیمانڈنگ ہوتے ہیں، اس لیے بچے دو ہی اچھے۔ ہم تو بڑے آرام سے اپنے والدین کی بات سن بھی لیا کرتے تھے اور مان بھی لیا کرتے تھے، مگر اب ایسا نہیں ہے۔"
"آج کے بچے بر گر فیملی سے بھی تو تعلق رکھتے ہیں اور کمپیوٹر دور کے بچے ہیں۔"
"آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن میں نے اپنے بچوں کی تربیت بڑے سادا طریقے سے کی ہے، باہر جاکر کھانا بھی چھ ماہ میں ایک آدھ دفعہ ہی ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہم گھر پہ ہی کھاتے ہیں۔ چونکہ لاہور سے تعلق ہے، کشمیری فیملی ہیں تو آپ کو پتا ہی ہوگا کہ لاہوریوں کو کھانے پینے کا بہت شوق ہوتا ہے، تو بچے بھی کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ عادل بھی کھانے پینے کے شوقین ہیں، لیکن اتنے نہیں ہیں جتنی میری فیملی ہے۔"
"کب، کہاں ملاقات ہوئی عادل سے....؟"
"میری امی کی ایک دوست ہیں جو کہ میری ساس کی بھی دوست ہیں تو ایک جگہ پہ ڈنر تھا تو وہاں پہ ان سے ملاقات ہوئی تھی، پہلے انہوں نے مجھے دیکھا اور بعد میں میں نے انہیں دیکھا۔"
"وحید مراد صاحب کے چاہنے والوں کی تعداد آج بھی بہت زیادہ ہے تو جب ان کے بیٹے کا رشتہ آیا تو کیا تاثرات تھے آپ کے؟"
"اچھا تو لگا... لیکن یہ اس وقت امریکہ میں رہتے تھے اور میں پاکستان سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی... میں چاہتی تھی کہ میری شادی جہاں بھی ہو، لیکن میرے والدین مجھ سے نزدیک ہوں۔ کیونکہ میری ایک بہن امریکہ میں ہے اور اتنی دور سے آنا جانا آسان نہیں ہوتا تو مجھے تھوڑا سا اعتراض تھا، مگر جب ان کی امی سے فیملی ملی، ان کی بہن سے ملے، باتیں کلئیر ہوتی گئیں اور رشتے بنتے چلے گئے تو پھر بات پکی ہوگئی۔"
"جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ اچھا لگا ایک مشہور بندے سے رشتہ جوڑ کر؟"
"جی بالکل... یہ بات بھی درست ہے کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں، کبھی سوچا ہی نہیں تھا اس رشتے کے بارے میں، عادل سولہ سترہ سال امریکا میں رہے ہیں ہمیں لاہور میں، تو کبھی ذہن میں بھی نہیں تھا کہ میرا فیوچر ان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔"
"ڈر لگتا تھا کہ اتنا عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں، پتا نہیں کیسے ہوں گے؟"
"میرا ہمیشہ سے اس بات پر یقین رہا ہے کہ شادی ایک "جوا" ہوتی ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا اس بات سے کہ کوئی باہر رہے یا یہاں رہے.... جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور باہر سے زیادہ ہمارے یہاں کا (پاکستان کا) ماحول خطرناک ہے اور جب تک مل کر نہ رہیں کوئی ایک دوسرے کو جان نہیں سکتا۔"
"سسرالی فیملی کو کیسا پایا آپ نے؟"
"میری ساس بہت اچھی ہیں، بہت فرینڈلی ہیں، بہت سوشل ہیں، پورا گھر میں سنبھالتی ہوں، وہ کبھی مداخلت نہیں کرتیں۔"
"بہت مشہور بات ہے کہ "ساس کبھی ماں نہیں ہوتی" ایسا ہے؟ لڑائی جھگڑا ہوا؟"
"قصور دونوں سائیڈ سے ہوتا ہے، ایک سائیڈ سے نہیں، اللہ کا شکر ہے کہ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا، کیونکہ لڑائی جھگڑے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا، ہنستے ہوئے... گھر پہ رہیں تو شاید لڑنے کا ٹائم بھی مل جائے۔"
"آپ کی ساس بھی بہت سوشل ہیں، کبھی کہا کہ بہو آپ گھر بیٹھو اور چھوڑو جاب کو... یا پسند کرتی ہیں

آپ کا جاب کرنا؟"

"نہیں... بالکل بھی نہیں کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی فری ہینڈ ہے جو میرا دل چاہتا ہے میں کرتی ہوں مجھے کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور پسند کرتے ہیں میری جاب کو بہت لبرل ہیں جو پہنیں جو کھائیں جب آئیں جب جائیں کوئی پابندی نہیں کسی بھی قسم کی بھی۔ درحقیقت بڑے عزت اور پیار چاہتے ہیں اور وہ ہم انہیں دیتے ہیں تو وہ ہم سے خوش رہتے ہیں آپ بیاہ کر آئیں اور آتے ہی یہ چاہیں کہ سب کچھ ہماری مرضی سے ہو تو ایسا ممکن نہیں ہے نئے گھر میں اپنی جگہ بنانے کے لیے آپ کو کچھ سال تو لگتے ہی ہیں۔"

"لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم علیحدہ گھر میں رہیں جہاں کوئی تیسرا نہ ہو آپ کی بھی ایسی کوئی خواہش تھی؟"

"نہیں میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی بلکہ میں تو چاہتی تھی کہ بھرا گھر ہو کیونکہ میں ایک بھرے ہوئے گھر سے آئی تھی... تو جب میں بیاہ کر آئی تھی تو بڑی پریشانی ہوئی تھی... تو جب تک بچے نہیں ہوئے بڑا مشکل لگتا تھا وقت گزارنا۔"

"عادل بتا رہے ہیں کہ شادی سادگی سے ہوئی تھی؟"

"جی... آج کل کے حساب سے تو سادگی سے ہی ہوئی تھی اور میں کہتی ہوں کہ سادگی سے ہی ہونی چاہیے۔ شادی ہماری لاہور میں ہوئی تھی اور ولیمہ کراچی میں ہوا تھا اور میں تو کہوں گی کہ جو پیسہ ماں باپ شادی میں خرچ کرتے ہیں وہ اپنے بچوں کو گفٹ کر دیا کریں تو زیادہ بہتر ہے۔"

"کتنی بھی اچھی زندگی گزر رہی ہو جب مرد کے دماغ کا میٹر گھومتا ہے تو پھر وہ اسلام کی آڑ میں دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اگر عادل نے ایسا کیا تو...؟"

"اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے میں تو پانچ کی اجازت دے دوں گی قہقہہ... کیونکہ زبردستی آپ کسی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے چار کریں دو کریں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا بس مجھے علیحدہ کر دیں کیونکہ میں کمپرومائز نہیں کر سکتی۔"

"عادل اپنے والد کی طرح رومانٹک مزاج ہیں؟"

ہنستے ہوئے... "نہیں جی کوئی خاص نہیں ہاں کبھی روٹھ جاؤں تو پھر باہر ڈنر پہ لے جاتے ہیں ورنہ تو ہم گھر پہ ہی کھاتے ہیں۔"

"آپ انہیں میک اپ میں پسند ہیں یا بغیر میک اپ کے؟"

"میں بہت سادگی پسند ہوں... مجھے عادت ہی نہیں ہے زیادہ میک اپ کی جب کہیں جانا ہوتا ہے تو میں عادل سے پہلے تیار ہو جاتی ہوں اور ان کا انتظار کرتی ہوں کہ یہ تیار ہوں تو چلیں... ہمارے یہاں الٹا حساب ہے۔"

"کہیں جاتے ہیں آپ دونوں تو لوگ ان کو پہچانتے ہوں گے آپ گھبراتی ہیں؟"

"ان سے زیادہ لوگ ان کی امی کو پہچانتے ہیں کیونکہ وہ کافی سوشل ہیں اور میں بالکل بھی نہیں گھبراتی کہ لوگوں کا پیار ہی ہے جو آپ کا اتنا نام ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے آپ کو عزت دی ہے تو اس کی قدر بھی کریں۔"

"عادل مزاج کے کیسے ہیں بجٹ بنا کر خرچ کرتے ہیں آپ دونوں؟"

"مزاج کے بہت اچھے ہیں دل کے بہت اچھے ہیں مزاج ٹھنڈا گرم مکس ہے اور میرا بھی ایسا ہی ہے اور ہم

دونوں ہی دل میں کوئی بات نہیں رکھتے جو گلہ شکوہ ہوتا ہے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ عادل تو بجٹ کا خیال نہیں رکھتے جو آیا خرچ کر دیتے ہیں' جبکہ میں بہت دیکھ بھال کے خرچ کرتی ہوں۔ اگر میرے پاس زیادہ بھی ہے تو ضائع نہیں کرتی۔ جو عورت خود جاب کرتی ہے اُسے پیسوں کی قدر ہوتی ہے۔"

"عادل بتا رہے ہیں کہ انہوں نے آپ کو منہ دکھائی میں کچھ نہیں دیا تھا۔ کیسا لگا تھا؟ اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟"

"بہت عجیب لگا اور اگلے دن میری کزنز اور میری بہنوں نے پوچھا تو میرے پاس چونکہ کافی جیولری تھی تو میں نے ان میں سے دکھا دی۔ بعد میں ان سے گلہ کیا تو کہنے لگے کہ مجھے تو اس رسم کا پتا ہی نہیں تھا' لیکن خیر عادل دل کے اتنے اچھے ہیں اور اتنا میرا خیال رکھتے ہیں کہ مجھے کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا اور ہنی مون کے لیے امریکہ گئے تھے ہم اور میری نظر میں ہنی مون منانا ضروری نہیں ہے' بلکہ میں تو اسے ویسٹ آف منی کہتی ہوں اور عادل کا چونکہ پلان بن رہا تھا' امریکہ جانے کا تو سب نے کہا کہ تم بھی چلی جاؤ' ہنی مون ہو جائے گا۔" مریم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کبھی روٹھ کر میکے جانے کا اتفاق ہوا اور میکہ دور ہونا چاہیے یا نزدیک....؟"

"نہیں جی.... میکہ دور ہے نزدیک ہوتا تو ضرور چلی جاتی' عادل کہتے ہیں میکہ نزدیک ہونا چاہیے' اکثر کہتے ہیں ہم میکے کیوں نہیں جاتیں' بچوں کے اسکول اور اپنی جاب کی وجہ سے بھی جلدی میکے نہیں جاسکتی۔"

"لڑکیوں کا یا بیوی کا کمانا ضروری ہے؟"

"میں کہتی ہوں کہ آج کل کے معاشرے میں ضروری ہے' کیونکہ وقت اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا' اگر آپ اپنے پیروں پہ کھڑے ہوں تو کوئی برائی نہیں ہے' ایکسٹرا چیز اگر آرہی ہے تو اس میں آپ کے بچوں کا ہی فائدہ ہے' اب وہ دور آگیا ہے کہ عورت کی کمائی کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر باعزت جاب مل رہی ہے تو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور پھر اپنی کمائی کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے' کسی کو جواب نہیں دینا پڑتا۔"

"کوئی بات جو آپ دس سالوں میں عادل سے نہیں کہہ سکیں' اب اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہتی ہیں۔"

"مجھ میں ایک ہی بری عادت ہے کہ میں دل میں کوئی بات نہیں رکھتی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ یہ اچھی عادت نہیں ہے' مگر میرا خیال ہے کہ بات کو فوراً" کلیئر کر دینا اچھی عادت ہے۔"

"عادل کہہ رہے ہیں کہ شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا بہت ضروری ہے' آپ بتائیں کہ کیا لڑکے کا خوب صورت ہونا بھی ضروری ہے؟"

"لڑکے کا بہت حسین ہونا ضروری نہیں ہے' لیکن اتنا ضرور ہو کہ آپ برداشت کر سکیں.... اور لڑکوں کی نیچر اچھی ہونی چاہیے' کیونکہ وہ ساری زندگی رہتی ہے۔ بعض مرد بہت خوب صورت ہوتے ہیں' مگر نیچر اچھی نہیں ہوتی۔"

"آپ کی جب لڑائی ہوتی ہے تو کیا گھر والوں کو بتاتی ہیں؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں' اگر آپ میں کوئی بات ہے تو ایک دوسرے سے کہہ دیں' کیونکہ میاں' بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ آپ لڑتے بھی ہیں تو تھوڑی دیر کے بعد پہلے جیسے ہو جاتے ہیں۔"

"اور آپ سے یہ آخری سوال کہ جب عادل صاحب کمرے میں آئے تھے تو پہلا جملہ کیا بولا تھا آپ سے؟ اور لڑکیوں سے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

ہنستے ہوئے۔ "یہ تو یاد نہیں.... سچ کہہ رہی ہوں.... اور لڑکیوں سے یہ ہی کہنا چاہوں گی کہ شادی میں سب سے بڑی چیز کمپرومائز ہوتی ہے اور شروع کے کچھ سال آپ اپنے میاں کو اور سسرال کو دیں گی تو اس کے بعد ہر چیز آپ کی ہوگی۔"

اور اس کے ساتھ ہی دونوں سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆

- سالگرہ نمبر کی خصوصی پیشکش مصنفین سے سروے،
- عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات"،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہد الست"،
- نعیمہ ناز کا مکمل ناول "آئینہ"،
- فاخرہ جبیں اور سحر ساجد کے ناولٹ،
- عنبرین اعجاز، سعدیہ ملک، کنیز نور علی، تمثیلہ زاہد اور ایمل رضا کے افسانے،
- ماضی کی فنکارہ "ایمن خان" سے ملاقات،
- مذاق رات کے ڈی جے "محسن عباس حیدر" سے باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

**خواتین ڈائجسٹ کا اپریل 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔**

# روبرو

## سمیرا حمید

ادارہ

سب تعریفیں خدا بزرگ و برتر کے نام جو ہر تخلیق کی ابتدا اور اس کی تکمیل پر قادر ہے۔

مصنف وقت کی نبض پر سانس لیتا ہے اور جہاں میں پھیلی رمزیں بوجھتا ہے۔ تاریخ کی پرتیں کھولتا، انسان کو کھوجتا، ذات کو کھنگالتا، سرگوشیوں کو سنتا، گویائی پر کان دھرتا اور بصارت کے ماخذ کو ڈھونڈتا، مصنف اپنے قلم سے کائنات کو آشکار کرتا ہے۔

پوری انسانی تہذیب جس کے قلم کے عروج پر زوال سے بچی رہتی ہے وہ "مصنف" ہے۔ میں قصہ گو ہوں سمیرا حمید۔

میرے نام کا عربی اور فارسی مطلب "قصہ گو" ہے۔ عرب، دمشق، بغداد وغیرہ میں باقاعدہ قصہ گو ہوا کرتے تھے اس لیے یہ مطلب مجھے مبہوت کیے رکھتا، کہ یہ قصہ گو لوگوں کے مجمع میں اپنی پُراثر آوازوں سے قصہ گوئی کرتے ہیں اور رات میں، جو کہ قصے سنانے کے لیے بہترین وقت سمجھا جاتا ہے، کے دوران ان کے اطراف مشعلیں اور چراغ روشن رہے ہوں گے۔

اور اب میں اس مطلب پر اس لیے مبہوت رہ جاتی ہوں کہ میں خود بھی مشعلوں اور چراغوں کی روشنی میں قصہ گوئی کر رہی ہوں۔ میری مشعلیں اور چراغ آپ ہیں، وہ روشنی کہ اگر میسر نہ ہو تو اندھیرے ہر شاہکار کو نگل لیں۔

میں خدا کے بعد ہر پڑھنے والی آنکھ اور متاثر ہونے والے ذہن کی شکر گزار ہوں۔ آپ نے ناول یارم کو پڑھا، یارم کے کرداروں کو، واقعات کو، جملوں کو پسند کیا سراہا، مجھے داد دی، دعائیں دیں، یہ سب میرے لیے معمولی ہرگز نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ میں انہیں کسی اعزاز سے کم پاتی ہوں۔ آپ کرداروں کے لیے حساس ہوئے، ان سے محبت کی، ان کے ساتھ ہنسے، ان کے لیے غمگین ہوئے، ان کے دکھ اور خوشی کو اپنے دل پر محسوس کیا۔ آپ کے ان محسوسات کی مجھے ہمیشہ قدر کرتے رہنا ہے، اور مجھے اس حقیقت کا بھی پابند رہنا ہے کہ قصہ گو کے گرد اگر اہل سماعت اپنے شوق کو لیے موجود نہ ہوں تو وہ آفاقی داستانیں سنائے یا طربیہ قصے وہ بہرحال اپنی حیثیت میں بے مول ہوگا۔

اور آپ یہ بھی جان لیں کہ لکھنے والا ہاتھ جس قدر اہم ہے پڑھنے والی آنکھ بھی اتنی ہی اہم ہے اور میں ان پڑھنے والی آنکھوں کی اہمیت کو فراموش نہیں ہونے دوں گی۔

یارم، یارم میرے لیے کیا ہے شاید میں اس سوال کا جامع جواب کبھی نہ دے سکوں، ہاں میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ میں تھوڑی بہت اس قابل ہو سکی کہ اس ناول پر تکبر سے پاک فخر کر سکوں۔

یارم ایک سال یا اس دورانیے کی کہانی نہیں ہے، جس میں یہ لکھی یا سوچی گئی، یہ ان کئی سالوں کی کہانی ہے جن میں میں تجربات اور مشاہدات کرتی رہی اور تجزیے نکالتی رہی۔ یارم کے لیے میں نے کہانی کی بنت، کرداروں کی آمد اور تشکیل، لفظوں کے استعمال میں نئے انداز اپنانے کی کوشش کی۔ کہانی، کہانی کی بنت، کردار نگاری، منظر نگاری اور لفظوں کا بہترین چناؤ میرے پہلے ہدف ہوتے ہیں۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس قدر بہتر لکھ سکوں اسے لکھنے کی کوشش کرتی رہوں۔ میں نہ ایک بڑی مصنفہ ہوں نہ ادیب، نہ لکھاری اور میں پھر وہی کہوں گی کہ چند کہانیاں لکھ

لینے سے کوئی ادیب نہیں بن جاتا میں بھی نہیں بنی۔ ہاں بس میں کوشش کرتی ہوں اور صرف اس غور و فکر میں رہتی ہوں کہ کس طرح میں اپنے کام کو اور بہتر کر سکتی ہوں۔ میں اپنی کوشش اور غور و فکر میں کتنی کامیاب رہی اس کا فیصلہ ہر پڑھنے والے کو اور وقت کو کرنا ہے اور کرتے رہنا ہے۔ میں نے جانفشانی، لگن، محنت اور بھرپور ارتکاز سے لفظوں، کرداروں، تصورات، خیالات کو مجسم کر کے بصورت "یارم" پیش کر دیا ہے۔

ناول یارم میں میں نے اپنے آئندہ ناولوں کے کرداروں کو بھی متعارف کروایا ہے اور میں انہیں گاہے بگاہے کہانی میں لاتی رہی ہوں۔ پہلا کردار خلیفہ کا ہے (خلیفہ، کردار اور ناول کا نام) یہ کردار قسط نمبر چھ میں آیا ہے۔ تین مختلف اور الگ الگ ناولوں کے کردار اور ناول قسط آٹھ میں آئے۔ فشاری (کردار کا نام، دوسرا ناول) توبہ باف (ناول کا نام) اور آمنہ اور محمد بخش (چوتھے ناول کے کردار) اور آخری قسط میں میں نے اپنا ایک ناول گیت رکھ کر لکھا۔

"مشک آہو نے نیل کی وسعتوں کو پاٹا اور زقند بھرتا ہرنی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھر دونوں ان دونوں کے گرد چوکڑیاں بھرنے لگے اور پھر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے اور اصفہان کے قالین باف نے زر احمر کے تاروں سے انہیں شاہکار میں بدل دیا اور ان میں ایک گہرے گیت راز کو نقش کر دیا جو ان کی رونمائی تک راز ہی رہنے والا ہے۔" آخری قسط میں موجود یہ سطریں، یہ راز میری سب سے زیادہ عزیز کہانی کے بارے میں ہے۔ ناولوں اور کرداروں کو میں جس ترتیب سے لائی ہوں ضروری نہیں کہ وہ اسی ترتیب سے لکھے جائیں، یا پہلے صرف یہی لکھے جائیں۔

اب میں آپ سب کے سوالات کی طرف آتی ہوں، وہ سوالات جنہیں پڑھ کر میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ آپ نے کتنی باریک بینی سے ناول کا مطالعہ کیا۔ میری کوشش ہو گی سب کے سوالات کے جوابات دینا۔

بہت سے قارئین نے امرحہ اور عالیان کے ناموں کا مطلب پوچھا ہے۔ امرحہ (خوشی، اچھی خبر) عالیان (عالی مرتبہ) دونوں نام عربی ہیں۔ اور مجھے بہت حیرت ہے کہ آپ نے کارل کے بارے میں اتنا کچھ پوچھا ہے، لیکن اس کے نام کا مطلب نہیں پوچھا۔

پہلے تین سوال لاڑکانہ سے حذیفہ ابوبکر نے کیے ہیں کہ امرحہ کا نام امرحہ ہی کیوں رکھا؟"

برننگ مین والے سین کی انسپریشن کہاں سے ملی؟

اور اگر ویرا اعلا ظرفی نہ دکھاتی تو کہانی کی صورت کیا ہوتی؟

میں ان ناموں کا انتخاب کرتی ہوں جن کی ادائیگی مناسب ہو۔ تلفظ یا ساؤنڈ میرے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ سب کرداروں کے نام، جملے، بیانیہ یا یوں کہہ لیں ایک ایک لفظ تلفظ کی جانچ اور پرکھ کے بعد لکھے گئے۔ امرحہ اور لیڈی مہر کے نام پہلے کچھ اور تھے، جنہیں ساؤنڈ کی وجہ سے میں نے ان موجودہ ناموں سے تبدیل کر دیا۔ تو نام امرحہ اپنے معنی اور ساؤنڈ کی وجہ سے مجھے کہانی اور کردار کے عین مطابق لگا تو میں نے اس کا انتخاب کر لیا۔

علامتی، ظاہری، مخفی، ہر معنی میں برننگ مین امرحہ کے دکھ اور اس سین کی جذباتی کیفیت سے مطابقت رکھتا تھا۔ ایک برننگ مین ایک برننگ وومین۔ ڈریگن بریڈ بہار کا آغاز جہاں امرحہ کو پروپوز کیا گیا کا الٹ برننگ مین جہاں عالیان کو کوئی تیسرا پروپوز کر رہا تھا۔ ایک نئے سال، نئے وقت اور بہار کا ماخذ "بریڈ" ایک خاتمے کی علامت "آگ"۔ ایک دن اور ایک رات۔ تو یہ وہ مطابقت یا وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر میں نے برننگ مین کا انتخاب کیا۔ براہ راست کوئی تحریک یا محرک نہیں جس سے میں متاثر ہوئی تھی۔ بس یہ میرے تصورات تھے جنہیں میں نے تعمیر کیا اور دنیا بھر میں ہونے والے تہوار اور ایونٹس مجھے متاثر

کرتے ہیں اور مجھے انہیں اپنی کہانیوں میں شامل کرنا اچھا لگتا ہے۔

اگر ویرا اعلا ظرفی نہ دکھاتی تو کہانی تھوڑی بدل جاتی اور سب کے درمیان کئی سالوں کے فاصلے آجاتے اور سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک اور غلط ہو جاتے۔ لیکن چونکہ ویرا کی شخصیت میں انا' خود غرضی اور ضد نہیں تھی اس لیے اس نے ویرانے میں جاکر رونا مناسب سمجھا اور اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ جن دو لوگوں کے جذبات میں قدر مشترک ہو' ان کے جذبات کے حق میں احترام سے فیصلہ دے دینا قابل ستائش ہوتا ہے۔' اور ویرا نے یہ ستائش حاصل کی۔

مصباح کھاریاں سے پوچھ رہی ہیں کہ یارم کا نام یارم ہی کیوں رکھا اور شہرت کیسی لگ رہی ہے؟

کیونکہ لفظ یارم بیک وقت قدیم اور جدید وقت سے جڑا ہوا ہے اور فارسی کی ساری شاعری اور کلام کی طرح مجھے یہ پر معنی' مسحور کن اور محویت میں بے مثال سا لگتا ہے۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب صرف اتنا ہے کہ میں جو لکھ رہی ہوں اسے پڑھا جا رہا ہے' میرے لیے یہی کافی ہے۔ اور ہم سب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ رہے نام اللہ کا۔

سائرہ غلام نبی نے کراچی سے پوچھا ہے کہ سمیرا کی تحریر میں زبردست قوت مشاہدہ کے ساتھ ایک ایسا سچا تجزیہ ملتا ہے کہ اس سے پھر انکار ممکن نہیں رہتا اور ہم با آسانی اس سے متفق ہو جاتے ہیں' اتنی سی عمر میں اتنا باشعور ہونا کیسے ممکن ہوا؟

سائرہ! آپ کا شکریہ کہ نہ صرف آپ یارم پڑھتی رہیں بلکہ مجھے اپنی رائے سے بھی آگاہ کیا۔ میرا مشاہدہ بہت زیادہ نہیں ہے اور شاید تجزیہ بھی اور جو تھوڑا بہت ہے' وہ صرف اس لیے کہ میں غور و فکر کو بہت پسند کرتی ہوں اور کسی بھی خیال یا سوچ یا کسی کتابی بات یا کسی عظیم شخصیت کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کرتی۔ میں ہر بات کو وہ کہیں بھی کہی یا بیان کی گئی ہو یا میرے آس پاس نظر آئے' خود جانچتی اور پرکھتی ہوں' اور ایک خدشہ جو مجھے لاحق رہتا ہے اور مجھے متحرک رکھتا ہے کہ اگر میرے دماغ کا تجزیہ کیا جائے اور نتیجہ یہ سامنے آئے کہ میں نے اپنے دماغ کا دو فیصد یا بمشکل ایک فیصد حصہ ہی استعمال کیا ہے تو میں افسوس کروں گی کہ میں نے پورا دماغ استعمال کیوں نہیں کیا۔ میں افسوس کرنے والوں میں سے ہونا نہیں چاہتی اور اندھے' گونگے اور بہروں میں سے بھی نہیں۔

سعدیہ ضیاء کراچی اور ام طلحہ ایبٹ آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ یارم لکھنے کا خیال کیسے آیا اور اس کے پیچھے کیا تحریک کار فرما تھی؟

اور عمارہ حیدر مری سے پوچھ رہی ہیں کہ آپ نے دوسرا ہی ناول اتنے منجھے ہوئے انداز میں لکھا ہے کہ لگتا ہے آپ دس بارہ ناول لکھ چکی ہیں' اتنا پختہ انداز کیسے حاصل کر پائیں؟

اگر آپ کا سوال مرکزی کہانی کی طرف ہے تو میں حقیقتاً" اس بارے میں نہیں بتا سکتی کہ مرکزی خیال کب ذہن میں آیا' لیکن ہاں اس کی ابتدا میرے لکھنے سے پہلے ہوئی تھی۔ کیونکہ میں مختلف چیزوں اور خیالات پر بہت شوق سے کسی بھی مقصد کے بغیر سوچتی ہوں تو لکھاری بننے سے پہلے چند ایک واقعات ہوئے تھے کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر ایک امرحہ جیسی لڑکی اپنے ماحول سے پریشان' یورپ کی کسی یونیورسٹی میں چلی جائے تو وہ کن کن مراحل سے گزرے اور کن کن مسائل کا سامنا کرے۔ کہانی کی صورت نہیں بس ایسے ہی میں سوچا کرتی تھی۔ (جیسے کہ میں اور بھی بہت چیزوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی اور سوچتی ہوں) کچھ اسٹوڈنٹس کو میں جانتی تھی جنہوں نے امرحہ کی طرح آن لائن اسکالرشپ فارمز فل کیے' لیکن وہ سب ناکام رہے سوائے ایک کے' جسے کینیڈا کا اسکالرشپ ملا جس کا ذکر داوا امرحہ سے اپنے دوست کی پوتی کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کئی واقعات ہیں جو میرے مشاہدے میں

رہے۔ امرحہ، عالیان، کارل، ویرا، لیڈی مہر، یہ سب کہانی کے خاکے (مختصر کہانی) کے ساتھ ساتھ اور نکھر کر بنتے رہے۔ لیکن کہانی کی ابتدا بہرحال ایک لڑکی سے ہوئی۔

میں نے یارم کہانی کا خاکہ جب پہلی بار بنایا تو اسے لکھ کر پڑھ کر رکھ دیا کہ ابھی میں اسے لکھنے کے قابل نہیں ہوئی اور اگر میں نے اسے فوراً" لکھنا شروع کیا تو میں اس کا حلیہ بگاڑ دوں گی۔ آپ اسے میری عادت کہہ لیں یا فطرت ہمیں باقاعدہ کسی کام کو کرنے سے پہلے خود کو اس کے قابل بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کسی بھی کہانی کو اس لیے لکھ دینا کہ اس کا پلاٹ ذہن میں آ گیا، اس پلاٹ کے ساتھ ناانصافی ہو گی اگر ہم اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں۔ ایک تخلیق کو اپنے نام سے بگاڑ کر کسی دوسرے کی دسترس سے بھی نکال دینا قابل افسوس عمل ہے۔ جو خیالات، الہام یا وارد ہوتے ہیں، وہ ایک تخلیق کار کے لیے بیش قیمت خزانے سے کم نہیں ہوتے۔ ان خزانوں سے بے پروائی برتنے سے بہتر ہے کہ ہم انہیں زیادہ قابل لوگوں کو دے دیں یا خود کو ان کے قابل کریں۔ تو عمارہ! میں نے کوشش کی کہ میں اس کے ساتھ انصاف کر سکوں۔ اس کہانی کو باقاعدہ لکھنے کے پیچھے جو محرک تھا، وہ صرف وہ الہام تھا کہ بس میں اس کہانی کو لکھنا شروع کر دوں اور دو تین بار مزید اس کا خاکہ بنانے کے بعد میں نے اسے لکھنا شروع کر دیا۔

سحرش فاطمہ کراچی سے پوچھ رہی ہیں "کہ کون سا کردار لکھتے ہوئے مزا آیا؟"

"سب کے سب کردار لکھتے ہوئے بہت اچھا لگا سحرش! حتیٰ کہ وقتی طور پر آنے والے جم، جورڈن، ایما اور شارلٹ کے سسرال والوں تک کو لکھتے ہوئے بھی۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہر کردار نے مجھے ہمیشہ پرجوش رکھا اور ان کی کردار نگاری کرتے ہوئے میں نے خاص طرح کی خوشی محسوس کی۔"

صباحت سلیم سرگودھا سے پوچھ رہی ہیں "عالیان نے امرحہ کی بند ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر جو تکلیف محسوس کی اسے لکھتے ہوئے آپ کے کیا جذبات تھے؟"

"میں اس تکلیف کا مشاہدہ کر چکی ہوں اور اسی مشاہدے کے تحت میں نے یہ تکلیف عالیان کو دی اور اس نے انگلیوں کی جھری میں سے ذرا کی ذرا جھانکا اور پھر جھری سمیٹ لی۔ لکھتے وقت میں تکلیف سے گزرے بغیر اس تکلیف کو عالیان کے ذریعے واضح کر رہی تھی۔"

جنید کامران نے بورے والا سے پوچھا ہے "امرحہ نے کہا، لاہور میں برف باری ہوتی ہے تو کیا لاہور میں برف باری ہوتی ہے؟"

"تو کیا نہیں ہوتی؟ فرق صرف اتنا ہے کہ لاہور میں برف باری بارش کے ساتھ ژالہ باری کی صورت ہوتی ہے۔ اب امرحہ کا لاہور پر اتنا حق تو بنتا ہے کہ وہ ژالہ باری کو برف باری کہہ کر لاہور پر کروا دے۔ لاہور کو یقیناً" اس پر اعتراض نہیں ہو گا، ہمیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

فرح سہیل کراچی سے پوچھ رہی ہیں کہ مانچسٹر یونیورسٹی کو چننے کی کوئی خاص وجہ۔ کیا آپ کا کوئی رشتہ دار، کزن، یا دوست یا کوئی اور رابطہ یونی میں پڑھتا ہے کہ آپ نے اتنی اچھی طرح سے یونی کو پورٹریٹ کیا اور شروع میں سوچا تھا کہ ناول اتنا زیادہ ہٹ ہو گا؟"

"مانچسٹر ایک امن پسند یونیورسٹی ہے اور اس کا ماحول بہت دوستانہ ہے۔ اور دوسری یونیورسٹیوں کی نسبت اس کے ماحول میں مضر اثرات کم ہیں۔ پھر مجھے مانچسٹر شہر کی پرسکون فضا بہت پسند آئی، یہ ایک بڑا شہر نہیں ہے لیکن یونیورسٹی کی تقدیس کا بہرحال کسی طور خیال رکھتا ہوا سا ہے۔ یونی کی محراب مجھے بہت پسند ہے اور لائبریری بلڈنگ اور یونی کے اندر موجود دوسری بہت سی چیزیں، ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کئی وجوہات ہیں۔ ویسے مانچسٹر کی جگہ ناول کسی اور یونی پر تھا پھر میں نے عین وقت پر اپنا ارادہ بدل دیا کیونکہ وہ یونی ایک دوسری

کہانی کے لیے پرفیکٹ تھی کیونکہ وہاں اسٹیریوٹائپ اسٹوڈنٹس کی کافی تعداد تھی اور یارم کو فی الحال اسٹیریو اسٹوڈنٹس کی ضرورت نہیں تھی۔

نہیں میرا کوئی رشتہ دار یا کزن یا کوئی دوست یونی میں زیر تعلیم نہیں ہے۔ ہاں لیکن اب میں بہت سے اسٹوڈنٹس کو جاننے لگی ہوں۔ ساری یونی کا ماحول پورٹریٹ کرنا ممکن سا تھا کیونکہ ہر ڈیپارٹمنٹ کا' ہر ہال کا اپنا الگ ماحول ہوتا ہے جو اسٹوڈنٹس کے آنے جانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ہر جگہ کی ایک روح ہوتی ہے' ہر ماحول کی' ہر شہر کی' ہر چیز کی جیسا کہ پاؤلو کوئیلھو بھی کہتا ہے کہ دنیا کی 'کائنات کی ایک روح ہے۔ تو میں بس اس روح کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں ورنہ جو درس گاہیں ہوتی ہیں' وہ اپنا ماحول بدلتی رہتی ہیں اور وہاں کچھ بھی مستقل طور پر قائم نہیں رہ پاتا۔ اس لیے میں نے اپنی تخلیق اور شعور کی آنکھ زیادہ استعمال کی۔ جیسا کہ ایک پاکستانی لڑکی جو وہاں پڑھتی ہے نے مجھے کہا کہ اس نے کبھی غور نہیں کیا مانچسٹر یونی پر دھند کیسے اترتی ہے مگر لیکن جب تیسری قسط میں پڑھا تو غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ منظر واقعی مبہوت کر دیتا ہے۔ تو یہ دیکھنے والی آنکھ پر ہے کہ وہ مختلف واقعات' چیزوں اور عوامل کو کس انداز سے دیکھتی اور پھر کس انداز سے بیان کر پاتی ہے۔

اگر میں ہٹ ہونے کے بارے میں سوچتی تو متکبر ٹھہرتی.... میرا کام مکمل ارتکاز اور محنت سے لکھنا تھا' یا یوں کہہ لیں محنت اور کمال فن میرا حلف تھا اور کامیابی اللہ کا وعدہ۔ میرا کام اپنے حلف کی پاس داری تھا بس۔

فرہاد نے لاہور سے پوچھا ہے کہ "سماں ہجر والی شاعری کہاں سے لی ہے؟"

"سماں ہجر اور سماں یار یہ سب شاعری نہیں ہے فرہاد.... "یارم" میں فارسی رباعی کے علاوہ جو کچھ ہے' وہ جسے آپ شاعری سمجھ رہے ہیں' وہ میرے لکھے لفظ اور لفظوں کی ترتیب ہیں۔ انہیں شاعری نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شاعری کے پیمانے پر نہیں لکھے گئے۔ اسے آنکھ تو کیوں روتی ہے' میں ایک تمثال گر' میں سنگ آستاں' میں نے آسمانوں کی دسترس سے اسے اترتے دیکھا' وغیرہ یہ سب الفاظ کی صورت میں بیانیہ کہانی کے انداز ہیں۔ یعنی نثر ہی لیکن نثر نہیں' کہانی کے درمیاں' کہانی سے جڑے ہوئے۔"

فاریہ فاطمہ علی گڑھ انڈیا' اخت تقوی' مہراب پورا اور عشنا ملک چیچہ وطنی سے۔ ان سب کی خواہش ہے عالیان' کارل' امرحہ' ویرا وغیرہ سے ملنا" آگے لکھا ہے میں ان سب کو لکھنے والی سے ملنا چاہتی ہوں اور یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا یہ کردار حقیقت میں آپ سے ملے ہیں' اور کیا یہ کردار اصلی ہیں؟"

"میری تحریر کو آپ نے پڑھا تو آپ تو پہلے ہی مجھ سے مل چکی ہیں فاطمہ! البتہ اب آپ سے ملاقات میرے لیے خوشی کا باعث بن رہی ہے۔ کردار اصلی نہیں ہیں۔ اخت اور عشنا۔ تصوراتی بھی نہیں کہہ سکتی میں کہ میں نے انہیں اسی دنیا کے انسانوں میں سے اٹھایا ہے۔

حنا جلال لندن سے کافی سارے سوالوں کے ساتھ آئی ہیں "آپ ایسے شان دار جملے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ آپ نے پاپولر فکشن میں کلاسک لکھنے کی ہمت کی' آپ کو ڈر نہیں تھا کہ ناول ریجیکٹ کر دیا جائے گا۔ ویرا جیسی بہادر لڑکی کہاں ملی' لیڈی مہر کی کہانی کیسے ذہن میں آئی اور آپ نے اے آر رحمان' اقبال' فیض بانو قدسیہ' غالب اور پتا نہیں کون کون جنہیں آپ نے ناول میں شامل کیا اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟"

"آپ کو میرے لکھے فقرے اچھے لگے مجھے اچھا لگا جان کر۔ کہانی لکھتے ہوئے میں اس کی جنس کے بارے میں نہیں سوچتی نہ ہی اس کی درجہ بندی کرتی ہوں کہ یہ پاپولر فکشن ہے یا کلاسک یا کچھ اور۔ میری تخلیق کو جس شکل میں نمایاں ہونا ہے' جس پیمانے' ترتیب اور توازن پر اسے رکھ کر لکھا جانا ہے۔ میں ان سب کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اگر میں یہ سوچوں کہ اسے پاپولر فکشن کے رنگوں سے لکھنا ہے یا کلاسک فکشن کے

رنگوں سے سجاتا ہے تو میری تخلیق ایک فارمولے کے تحت ہو گی اور تخلیق میں کوئی فارمولا نہیں ہوتا۔ اور جرات و ہمت کو میں پسند کرتی ہوں کیونکہ اگر ایک تخلیق کار جرات مند نہیں ہو گا تو پھر وہ پرانے راستوں پر نئے انداز سے چلے گا لیکن نئے راستوں کی داغ بیل نہیں ڈال سکے گا۔ جیسا کہ رسول حمزہ توف کہتے ہیں کہ "اگر کوئی فنکار اپنی روح میں پرورش پانے والے پرندے کو آزاد کرے اور وہ اپنی طرح کے پرندوں کے جھنڈ کا ایک حصہ بن جائے تو اسے فن کار نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو پرندہ خلق کیا ہے وہ اس کا پرندہ نہیں' نہ انوکھا' اور نہ ہی ہوش ربا پرندہ۔ ایک عام چڑیا ہے جسے چڑیوں کے کسی جھنڈ میں پہچانا نہیں جا سکتا' ہو سکتا ہے' یہ چڑیاں بھی من موہنی ہوں لیکن ہیں تو معمولی چڑیاں جن میں کوئی خاص بات نہیں۔ تو بس ہم سب کو انفرادی طور پر اپنے اپنے پرندے خلق کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

ویرا حقیقتاً "روس" سے ہی ملی۔ میرے بھائی روس گئے تھے اور ان کی آنکھ سے روس کو دیکھتے' روس کو جانتے' روس کا مشاہدہ کرتے ویرا مجھے مل گئی۔ لیڈی مہر کی کہانی دراصل میرا الگ سے ناول تھا جو لیڈی مہر اور ان کے دس بچوں کے گرد تھا۔ خاص کر شارلٹ اور

مور گن کی کہانی لیکن پھر چند وجوہات کی بنا پر میں نے اسے پارم میں مدغم کر دیا۔ لیڈی مہر کی کہانی اس سوچ کا نتیجہ تھی جس پر میں نے کبھی سوچا تھا کہ صرف بے اولاد یا ضرورت مند ہی کیوں بے سہارا بچوں کو لے کر پالتے ہیں۔ سب خاص و عام کیوں نہیں جو ان کے اخراجات اٹھا سکتے ہیں۔ یعنی معاشرے میں اس اچھے عمل کا رجحان کیوں نہیں ہے۔

بانو قدسیہ' اشفاق احمد' ابو نواس' بو علی ابن مسکلا اور ایسے ہی بہت سے دوسرے نام' یا چیزیں ناول میں شامل کرنے کے پیچھے بہت ساری وجوہات ہیں جن میں سے چند ایک میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔

پہلی وجہ ان کے لیے میری عقیدت' ان کے کام کو

خراج تحسین۔

دوسری وجہ یہ کہ ماضی سے اٹھا کر اگر ہم اپنے پیاروں اور خاص کر اعلا پائے کے فنکاروں اور شخصیات کو حال تک لا کر مستقبل میں اپنے ساتھ نہ لے گئے تو یہ سب ماضی کے قبرستانوں میں دفن ہوتے جائیں گے۔ انہیں بار بار گاہے بگاہے زندہ کرتے رہنا ہوگا۔ دوسری وجہ ان سب کو دوسری اقوام تک لے جانا ہے' اگر بحکم خدا میں اپنی تحریریں دوسری اقوام تک لے جانے میں کامیاب ہوگئی تو وہ ایک کہانی کے ساتھ بہت ساری چیزوں کے بارے میں جانیں گے۔ اشفاق احمد کو' بانو قدسیہ کو' لاہور کو' ابونواس کی شاعری کو' بوعلی ابن مسکلا کی خطاطی کو' غالب کے کمال فن کو' اقبال کے سحر آگیں کلام کو اور فیض کے عشق کو اور ناول میں شامل دوسری بہت سی چیزوں اور باتوں کو۔ یہ صرف چند وجوہات ہیں' باقی وقت ظاہر کردے گا۔ اور اے آر رحمان کا ذکر صرف اس لیے کہ رحمان جو کہانیاں اپنی دھنوں سے لکھتا ہے' میں وہ کہانیاں پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں اور ان کی کچھ دھنوں نے مجھے کچھ جملے اور تصورات دیے' جنہیں میں نے یارم میں شامل کیا تو شکریہ کا ایک انداز ان کے لیے۔"

رابعہ الماس حیدر آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ "عالیان کا کردار بہت زبردست تھا۔ کیا یہ آپ کا سوچا ہوا تھا یا حقیقت میں آپ نے دیکھا ہے' کیا ایسے کردار حقیقت میں ہوتے ہیں؟"

"ویسے حقیقی نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔ لیکن چند ایک لوگ جو میرے مشاہدے میں رہے' وہ قریب قریب عالیان جیسے ہیں' بس وہ عالیان کی طرح عمارتیں نہیں پھلانگتے۔ میرے ایک غیر ملکی دوست کی خوبیاں عالیان کے کردار کے لیے مستعار لی گئیں۔ غصہ نہ کرنا' کپڑوں' جوتوں کو صرف استعمال کی چیزیں سمجھنا' زیادہ چیریٹی کرنا' والدین سے الگ اپنے بل بوتے پر سب کرنا' بہت طیش پر بھی کبھی نہ بھڑکنا اور ہمیشہ بہت تحمل کا مظاہرہ کرنا وغیرہ سب۔ تو آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں عالیان جیسے لوگوں کو جانتی ہوں اور یہ حقیقت میں ہوتے ہیں۔"

عاصمہ اور روبینہ علی اسلام آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ "آپ مانچسٹر یونی کے بارے میں اتنا کیسے جانتی ہیں' تحقیق کے ذرائع کیا رہے؟"

"تحقیق کے ذرائع بے شمار رہے' چاہوں بھی تو گنوا نہیں سکتی۔ ایسے ہی جیسے ایک تصویر پوری کہانی کہہ دیتی ہے اور اسی کہانی کو بیان کرنے کے لیے ایک ہزار لفظ بھی کم ہوتے ہیں تو دور بیٹھے انسان کو ان ہی ایک ہزار الفاظ یعنی ایک ہزار ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ معمولی باتوں کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کہ بس۔ میرے مشینی ذرائع تو اخبارات' رسائل' بلاگز' گوگل ارتھ' اسٹریٹ ویو' اسٹوڈنٹ ڈائریاں' کچھ کا پرسنل ڈیٹا' کالم' ذاتی رابطے' ہزاروں کی تعداد میں اسٹوڈنٹس جنہیں فالو کرنا پڑا' گروپس اور ایسی ہی دوسری بے شمار چیزیں رہیں۔ یہ اوپر اوپر کے ذرائع ہیں۔ باقی ای میلز' بات چیت اور بہت اندر کی باتوں کے لیے مجھے کئی مختلف انداز اور طریقے اپنانے پڑے۔ جیسے کہ یونین کی بلڈنگ میں موجود سیف روم تک جا پہنچنا' کسی معجزے سے کم نہیں تھا' کیونکہ مانچسٹر کے کم ہی اسٹوڈنٹس اس سیف روم کے بارے میں جانتے تھے۔ اور عالیان اور کارل کا ہال' اس کے اندرونی حصوں کی تصویریں مجھے خاصی مشکل سے ملیں' خاص کر میوزک روم کی جہاں ویرانے جا کر کارل پراسپرے کرتا تھا۔ روم کو جاننا ہے تو گوگل کرو لیکن رومیوں کو جاننا ہے تو رومیوں سے ملو تو مانچسٹر والوں کو جاننے اور خاص کر مانچسٹر آنے والے اسٹوڈنٹس کو جاننے کے لیے میں نے مانچسٹر والوں کو تنگ کیا۔ حتیٰ کہ میں نے ہوٹلز اور بارز وغیرہ کے اسٹاف کو بھی کھنگالا۔ اور حقیقتاً" اسٹوڈنٹس کی اصلی صورت مانچسٹر والوں نے مجھے دکھائی اور اسی لیے تو میں وہ فقرہ لکھنے میں کامیاب ہوپائی تھی کہ یہ یونی جک جو نہ کریں وہ کم ہے۔ بہرحال میں انسان ہوں نقص سے پاک نہیں ہوسکتی' اپنی

طرف سے میں نے پوری کوشش کی کہ کوئی غلطی نہ رہ جائے اور مانچسٹر والوں کو یہ شکایت نہ رہ جائے کہ میں نے ان کے شہر اور یونی کو بیان کرنے میں اچھی قابلیت نہیں دکھائی۔"

"لارڈ میسرٖ عالیان آپ کو کہاں ملے؟" سدرہ الطاف جہلم سے پوچھ رہی ہیں۔"

"لارڈ میسرٖ عالیان نام مجھے پسند تھا' جو میں نے عالیان کو دے دیا اور یارم کو لارڈ میسرٖ عالیان مل گیا۔ ویسے لارڈ میسرٖ مجھے مشاہدے کے بل بوتے پر ملے۔"

ہاشم وسیم لاہور کا سوال ہے کہ "این اون سال میں ایک بار بولنے والوں جیسی کیوں تھی؟"

"اگر وہ بھی بولتی تو باقی کے کردار کب بولتے۔ ویسے جاپانی کم گو ہی ہوتے ہیں اگر نہیں بھی ہوتے تو میں نے این اون کے ذریعے انہیں بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی میں یہاں وضاحت کرنا چاہوں گی کہ کہانی میں لکھا جانے والا کوئی ایک بھی کردار غیر اہم نہیں ہوتا' قاری کی ہمدردی یا محبتیں ایک یا چند ایک کے ساتھ منسلک ہوتی ہیں' لیکن لکھاری سب کے ساتھ منسلک ہوتا ہے' خاص کر وہ کہانی میں ہر کردار کی اہمیت کو جانتا ہے۔ اس لیے تو وہ کردار کو کہانی میں جگہ دیتا ہے اور کوئی کردار ثانوی یا مرکزی' اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا' جو کردار کہانی کا حصہ ہے بس وہ کہانی میں اپنے حصے کا سلطان ہے۔"

"اصل زندگی میں امرحہ جیسی آگ لگانے والی لڑکی سے نفرت کی جاتی ہے یا اس سے دور رہا جاتا ہے پھر آپ نے ناول میں ایسی لڑکی کو ہیروئن کیوں بنا دیا؟" وقار بوزدار کراچی کا سوال ہے۔

"جو توہمات پالتے ہیں یا ایسے لوگوں سے ڈرتے ہیں' وہ بے وقوف اور جاہل ہوتے ہیں۔ امرحہ ایک اچھی شاگرد ہے اور اس نے آہستہ آہستہ وہ سب سیکھا جو زندگی نے استاد بن کر اسے سکھانا چاہا۔ ایک ایسی ہی شاگرد کو اس ناول کی ہیروئن ہونا تھا۔"

وجیہہ انور ہاشمی کراچی اور عندلیب رحیم یار خان نے پوچھا ہے "کارل کا کردار کس سے متاثر ہو کر یا کسے سامنے رکھ کر لکھا؟ کارل سے ملی ہیں تو مجھے بھی ملوا دیں؟"

"میرا خیال ہے عندلیب کارل سے میں نے آپ کو ملوا دیا ہے "یارم" میں' اور وجیہہ! مجھے ایک ایسے لڑکے کا کردار بنانا تھا جو اتنے الٹے دماغ کا ہو کہ ڈسک کو ہارٹ راک میں چلوا دے' امرحہ کو اسٹور میں لاک کر دے' جو عالیان کا دوست بھی ہو اور دشمن بھی اور جو امرحہ پر مختلف افتاد لاتا رہے۔ اور یہ الٹے دماغ کا انسان باقی کے کام بھی قدرتی بات ہے' الٹے ہی کرے گا تو اس کردار کے نقطے (حرکتیں) ملاتے ملاتے یہ کارل بن گیا۔ کسی سے متاثر نہیں تھی۔ کسی کو سامنے نہیں رکھا تھا۔"

"روس کے لوگ اتنے بھی اچھے نہیں ہوتے جتنا آپ نے ویرا کو دکھایا۔" مشال نور سیالکوٹ کا سوال۔

"مشال! لوگ روس کے ہوں یا کسی اور ملک کے یہ ناممکن ہے کہ بیک وقت سب ہی لوگ صرف "برے" ہوں یا صرف "اچھے"۔ گراف کم زیادہ ہو سکتا ہے لیکن صفر نہیں۔ اور دور سے دیکھ کر یا صرف سن کر کسی بھی قوم کو اچھا یا برا کہنا مناسب نہیں۔"

(ہماری قارئین نے بہت سارے سوالات کیے ہیں' باقی سوالات کے جوابات ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

# دستک دستک دستک

شاہین رشید

سائرہ یوسف

سائرہ یوسف شادی کے بعد اور پھر بیٹی کی پیدائش کے بعد کافی مصروف ہوگئی ہیں، فیلڈ میں بھی کم نظر آتی ہیں اور پریس میڈیا میں بھی... دل چاہا کہ بندھن میں ان کا انٹرویو کریں، مگر ٹائم ہی نہیں ہے، خیر۔

"سائرہ کیا حال ہیں، کیا ہو رہا ہے؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے اور بیٹی کو سلانے کی کوشش کررہی تھی۔"

"اچھا... تنگ کرتی ہے؟"

"نہیں، نہیں... بالکل نہیں... سب کی لاڈلی ہے، اس لیے بالکل بھی تنگ نہیں کرتی۔"

"آوٹ آف فیلڈ ہو؟"

"نہیں، تھوڑا بہت تو کر ہی لیتی ہوں، کوئی اچھا کمرشل مل جائے یا کوئی اچھا سیریل...؟"

"اپنے کام میں بہت سلیکٹو ہو؟"

"جی جی بالکل... بہت سکون کے ساتھ، بہت سوچ وبچار کے ساتھ اور پوری توجہ کے ساتھ کام کرتی ہوں، اس لیے وہ ہی کردار لیتی ہوں جن کے ساتھ میں انصاف کرسکتی ہوں۔"

"مگر تم ایک کامیاب فنکارہ ہو، ہر ڈرامے میں کام کرسکتی ہو کیونکہ لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"اگر ہر وقت اسکرین پہ آؤں گی تو لوگ نہیں دیکھیں گے، لیکن اگر کبھی کبھار آؤں گی تو لوگ ضرور دیکھیں گے، اداکاری بہت توجہ مانگتی ہے۔ اس میں ڈوب کر کام کرنا پڑتا ہے، تب ہی اچھا رزلٹ آتا ہے، ورنہ آپ یقین کریں کہ آفرز تو بہت ہوتی ہیں، مگر سب کو "ہاں" نہیں کیا جاسکتا۔"

"تو پھر کیا مخصوص نہیں ہوگئیں آپ؟"

"نہیں، نہیں... ان ہی کو ترجیح دیتی ہوں جن کا اسکرپٹ بہت جان دار ہوتا ہے اور اچھے پروڈکشن ہاؤسز کو ہی اہمیت دیتی ہوں۔"

"کہیں پڑھا تھا کہ آپ کو "تنہائیاں" کا سیکوئل کرکے بہت مزہ آیا تھا، کیوں؟"

"اس لیے کہ ایک تو یہ مشہور سیریل کا سیکوئل تھا، پھر ماحول بہت اچھا تھا، فنکار بہت اچھے تھے اور اس سیریل میں شہروز سے پکی دوستی ہوئی اور وہ میرے جیون ساتھی بنے... تو اس لحاظ سے یہ میرے لیے ایک یادگار سیریل ہے۔"

"اب تو آپ فیملی والی ہوگئی ہیں، پھر بھی کبھی فلم میں کام کرنے کی آفر ہو تو کریں گی؟"

"بہت ہی اچھی آفر ہوئی تو کروں گی، ورنہ آپ کو پتا ہے کہ ڈراموں کے لیے جلدی "ہاں" نہیں کرتی جب تک مطمئن نہ ہوجاؤں تو بھلا فلم کے لیے کیسے

کر سکتی ہوں۔ مجھے "بول" اور "خدا کے لیے" پسند ہیں اور یہ ہی میری خواہش ہے۔"

"اور کیا خواہش ہے؟"

"اور یہ کہ ماڈلنگ میں بھی بین الاقوامی شہرت حاصل کروں اور بہت اچھے کمرشلز اور بہت ہی معیاری میگزین کے لیے ماڈلنگ کروں۔"

"عموماً" لڑکیاں شادی کے بعد اور پھر ماں بننے کے عمل سے گزرنے کے بعد موٹی ہو جاتی ہیں' جبکہ آپ پہلے کی طرح اسمارٹ ہیں ؟"

"سب لڑکیاں اسمارٹ رہ سکتی ہیں' اگر وہ اپنے آپ پر توجہ دیں' میں اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ اس سے میرا اپنا دل بھی خوش ہوتا ہے اور پھر مجھے اس فیلڈ میں بھی رہنا ہے۔"

"شادی اور شوبز... زندگی چینج ہوئی؟"

"بالکل... ہر انسان کی زندگی میں چینج آتا ہے اور مجھ میں بھی آیا ہے... شادی تو انسان کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لاتی ہے' آپ کو جیون ساتھی مل جاتا ہے۔ اولاد جیسی نعمت مل جاتی ہے' اور جب میں شوبز میں آئی تب بھی میں نے اس فیلڈ میں بہت کچھ سیکھا اور اگر انسان چاہے تو اپنے اندر مثبت تبدیلی لا سکتا ہے۔ آپ یونیٹو رہیں تو سب یونیٹو رہتے ہیں۔"

"یعنی بگڑنا اور سدھرنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے؟"

"جی بالکل... اپنے اختیار میں ہوتا ہے' پونیٹو سوچ اور پونیٹو رویہ اور بی ہیویر ہو تو سب آپ کے اپنے ہوتے ہیں۔ پھر کوئی آپ کو مس گائیڈ نہیں کر سکتا' نہ ہی آپ کے ساتھ نگیٹو ہو سکتا ہے۔"

"سیر و تفریح کرنا کیسا لگتا ہے؟"

"ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا سیر و تفریح کرنا کسے برا لگتا ہو گا۔ اپنا ملک ہو یا دوسرا گھومنے پھرنے کا بہت مزہ آتا ہے اور ملک سے باہر تو میں کئی ممالک گھوم چکی ہوں اور بہت انجوائے کرتی ہوں۔"

"کوئی ایسا ملک جہاں آپ بار بار جانا چاہتی ہیں؟"

"ایسے تو کئی ممالک ہیں' لیکن "ترکی" مجھے بہت پسند آیا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی میں وہاں سے آئی ہوں اور میرا دل بار بار جانے کو چاہتا ہے اور ان شاء اللہ ایک بار تو ضرور جاؤں گی۔"

"اور کوکنگ چل رہی ہے؟"

"جی بالکل چل رہی ہے اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اگر میں آرٹسٹ نہ ہوتی تو ایک اچھی شیف ضرور ہوتی... خیر... میں اپنی فیلڈ میں بہت خوش ہوں اور اپنی فیملی میں' اور کوکنگ میں نئے نئے ذائقوں کی تلاش میں رہتی ہوں۔"

"آج کل "سسرال" کے موضوع پر بہت ڈرامے بن رہے ہیں' آپ کو سسرال کیسا ملا؟"

"بہت اچھا... بہت ہی اچھا... اگر میں کہوں کہ مجھے آئیڈیل "سسرال" ملا ہے تو غلط نہ ہو گا' سب لوگ بے حد محبت کرنے والے ہیں' میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسا اچھا سسرال ملا۔"

## اریج فاطمہ

"کیسی ہو اریج؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"مصروف ہو؟"

"جی شوٹ پہ ہوں' لیکن ابھی لنچ ٹائم ہے' آپ بات کرسکتی ہیں۔"

"او کے.... شکریہ.... اب تم خاصی اچھی اردو بولنے لگی ہو' سیکھی یا خود بخود آ گئی؟"

"کوئی بھی زبان ہو' وہ سیکھنے سے نہیں بولنے سے آتی ہے اور مجھے بھی بولنے سے آئی۔ مجھے اردو ایک تو مسلسل ڈراموں میں کام کرنے سے آئی اور دوسرے میں اپنی دادی کی مشکور ہوں جنہوں نے میری بہت مدد کی۔"

"آج کل جو آن ایر ہیں' وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں' انڈر پروڈکشن کیا ہیں؟"

"ہاں جی.... آن ایر تو زیادہ نہیں' بس ایک دو ہی ہیں۔ جیسے "اک پل" "زندگی تم ہو" اور دونوں میں ہی میرے کردار بہت اچھے اور مختلف ہیں۔ جہاں تک انڈر پروڈکشن کی بات ہے تو کچھ ہیں ریکارڈنگ چل رہی ہے۔ اب پتا نہیں کب آن ایر ہوں گے' تو قبل از وقت بتانا فضول ہے۔"

"اک پل" اور "زندگی تم ہو" کس کا کردار اچھا لگ رہا ہے۔

"دونوں میں اچھے ہیں۔ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ "اک پل" میں ذرا تیز لڑکی کا کردار ہے اور اس کے کئی شیڈز ہیں۔ دکھ اور خوشی والا کردار ہے اور "زندگی تم ہو" میں ڈاکٹر کا رول بھی ہے اور محبت کرنے والی لڑکی کا بھی.... پوزیٹو رول ہے اور خاصا اچھا ہے۔"

"اب تک کے ڈراموں میں بہتر کس کو کہوگی؟"

"میرے شروع کے سارے ہی ڈرامے بہت اچھے ہیں۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میرے شروع کے ڈراموں میں میرے کردار رونے دھونے اور کم بولنے والے ہوتے تھے۔ سچ بتاؤں۔ اس وقت میری اردو اتنی اچھی نہیں تھی اور اب توماشاءاللہ مجھے خود اپنے پر فخر سا ہوتا ہے کہ میں نے اچھی اردو سیکھ لی ہے اور ہاں آپ نے پوچھا کہ کون سا کردار بہتر لگا تو "اک پاگل سی لڑکی" میں میرا کردار خاصا اچھا اور مختلف تھا.... اور اسے کرکے مجھے مزہ بھی آیا تھا' اور اس میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہوں۔"

"اداکاری کے علاوہ کیا مشاغل ہیں؟"

"مجھے فوٹو گرافی کا بھی بہت شوق ہے اور جب کہیں جاتی ہوں تو حسین مقامات کو ضرور کیمرے میں محفوظ کرتی ہوں.... اور گھر پہ ہوتی ہوں تو کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتی ہوں کہ مجھے مطالعے کی عادت بھی ہے اور جب کچھ کرنے کو نہیں ہوتا تو پھر نیند کو ترجیح دیتی ہوں۔"

"اللہ نے کم عمری میں دولت اور عزت سے نوازا ہے۔ اپنی کمائی کس پہ خرچ کرتی ہیں؟"

"اپنی کمائی زیادہ تر اپنے ہی اوپر خرچ کرتی ہوں' مگر مجھے سب کا خیال رہتا ہے اور جہاں سمجھتی ہوں کہ مجھے خرچ کرنا چاہیے وہاں ضرور خرچ کرتی ہوں۔"

"کس معاملے میں زیادہ فضول خرچ ہیں اور لباس میں کیا پسند ہے؟"

بقیہ صفحہ نمبر 285

# شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

## طلعت ثناء..... سیال شریف

1 ۔ آج جب میں شعاع سے وابستگی کو سوچنے بیٹھی ہوں تو یادوں کے دریچے کھل گئے اور بچپن کے وہ دن کتنے اچھے تھے ان کو سوچتے ہوئے میں کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ یہ ایسا دور ہوتا ہے کہ آپ عمر کے کسی حصے میں بھی پہنچ جائیں' آپ کو اس دور کی یاد ستاتی ہے تو پھر آپ خود کو اسی دور میں محسوس کرتے ہیں' آہ..... لیکن وہ دور واپس نہیں آتا۔ وہ ماں باپ کی شفقت' وہ بہن بھائیوں کا ساتھ' وہ بے فکری کے دن کچھ بھی نہیں۔

اک بار جو مل جائیں وہ گزرے ہوئے لمحے
سو بار مجھے تلخی ایام گوارا

شعاع سے وابستگی کو تو ایک عرصہ بیت گیا۔ بچپن میں جب لفظوں کی پہچان ہوئی تو شعاع کو اپنے ساتھ پایا۔ چھوٹے ہوتے اپنی چھوٹی سسٹرز کو دوڑاتی۔ کبھی کسی کے گھر کبھی کسی کے گھر۔ پھر کچھ عقل آئی اور باقاعدہ اپنا رسالہ خریدنا شروع کیا۔ یہ میٹرک کی بات ہے اور اب ماشاء اللہ سے میرا بیٹا میٹرک میں ہے تو اب خود اندازہ لگائیں اس ساتھ کا۔

شعاع کے حوالے سے ایک خوش گوار واقعہ ہے۔

میرا رسالہ میرے میاں جی 28 کو ہی لے آتے ہیں' لیکن اگست میں میرے بے حد اصرار پر بھی ٹال مٹول کر گئے' میں بہت حیران کہ ان کو کیا ہوا۔ بہر حال' گھر کی مصروفیات میں بھی شعاع کی یاد ستاتی رہی اور جب بھی یہ گھر آتے تو میں پہلے ان کے ہاتھوں کو دیکھتی' لیکن نہیں' کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس دوران خواتین اور کرن کی ڈیٹ بھی آگئی' لیکن میرے گھر نہ آئے۔ یہ راز تو اس وقت کھلا جب اگست کی شام کو بچوں اور میاں جی نے میرے لیے سرپرائزنگ برتھ ڈے کا اہتمام کر رکھا تھا اور ہیپی برتھ ڈے کہتے ہوئے جب بچوں اور میاں صاحب نے مجھے شعاع' کرن اور خواتین اکٹھے دیے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی اتنی اپنائیت پر..... میرے میاں صاحب کا یہ کہنا ہے کہ میں اتنی خوش تو گولڈ کی چیز گفٹ لینے پر بھی نہیں ہوتی' جتنی ڈائجسٹ کے تحفوں پر ہوئی۔

2 ۔ میری آنکھ صبح میاں جی کے جگانے پر کھلتی ہے' جی ہاں میں جاگنے کے معاملے میں بہت سست ہوں۔ کیونکہ رات کے علاوہ دن میں کبھی نہیں سوتی۔ بہر حال صبح کی نماز پڑھ کر دن کا آغاز کرتی ہوں۔ ناشتا بناتی ہوں' پھر بچوں اور ان کے ابا کے کپڑے پریس کر کے ان کو اسکول بھیجتی ہوں۔ اس کے بعد اپنا ناشتا ٹرے میں سجا کر لاتی ہوں' اور مارننگ شو دیکھتے ہوئے ناشتا انجوائے کرتی ہوں۔ معذرت کے ساتھ' مجھے وہ عورتیں زہر لگتی ہیں جو گھر کی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو بھول جاتی ہیں اور کبھی بچوں کے بچے ہوئے سلائس' روٹی اور کبھی خاوند کے بچے نوالے ٹھنڈے سالن سے ناشتا کرتی ہیں۔ کیوں؟ جب سب کے لیے ناشتا بنا سکتی ہیں تو اپنے لیے کیوں نہیں۔ خدارا میری بہنوں! اپنے آپ کو یوں ملیامیٹ مت کرو' گھر کے کاموں میں اپنی ذات کو بھی اہمیت دو۔ تم لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتی ہو۔

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائیں
قتیل وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

یہ شعر ہم عورتوں کے لیے ہے۔ سوری میں پھر پٹڑی سے اتر گئی۔ بہر حال ناشتے سے فارغ ہو کر صفائی برتن اور پھر کوکنگ کرتی ہوں اور اپنی طرف بھی بھرپور توجہ دیتی ہوں۔ کپڑے وغیرہ بدل کے، کنگھا کر کے ایسے بیٹھ جاتی ہوں کہ آنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ کام کسی اور نے کیے ہیں۔ بچوں کی واپسی کے بعد انہیں

کھانا کھلانے کے بعد اگر کہیں جانا یا کسی نے آنا نہ ہو تو پھر میں فارغ ہوتی ہوں اور۔۔۔

یہ وقت میرا شعاع کے لیے ہوتا ہے۔ عصر سے مغرب تک بیٹی مجھے چائے کا کپ بھی پکڑا جاتی ہے۔ مغرب پڑھنے کے بعد بچوں کو ہوم ورک کروا کے شام کے چھوٹے موٹے کام نپٹاتی ہوں اور پھر عشاء کے بعد بھی کچھ ٹائم شعاع کے لیے ہوتا ہے' کیونکہ مجھے مطالعہ کے بغیر نیند نہیں آتی' لیکن جن دنوں شعاع نیا آتا ہے۔ اس دن روٹین چینج ہوتی ہے کہاں کے مارننگ شو۔ سالن پکاتے کام کرتے شعاع میرے ساتھ ہوتا ہے۔

3 ۔ کسی ایک کہانی میں اور کردار میں جھلک نظر آنا تو مشکل ہے' مجھے بہت سی کہانیوں میں اپنی جھلک نظر آتی ہے' جب انسان مکمل نہیں ہے اس میں بہت سی خوبیاں اور خامیاں ہیں تو پھر ایک کردار کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے مختلف جگہ پر اپنا آپ نظر آتا ہے۔

جہاں تک بات تحریروں کی ہے تو بہت سی پسندیدہ ترین تحریریں ہیں' بہت سی ایسی یادگار تحریریں ہیں' جن کے نقش آج بھی دلوں میں تازہ ہیں۔ رائٹرز میں مجھے نگہت سیماجی' نمرہ احمد' عمیرہ احمد' سائرہ رضا' سمیرا حمید یہ تو آج کل ٹاپ لسٹ پر ہیں' جبیں سسٹرز تو شادی کے بعد غائب ہی ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت پہلے میں نے ماہا ملک کی کہانی میرے خواب ریزہ ریزہ پڑھی تھیں وہ پڑھ کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہوں اور زینب کو کوستی ہوں کہ کیسے تم اپنی جنت سے نکل گئیں اور زینب کی حالت پر کڑھتی ہوں۔ ماہا جی آپ کہاں غائب ہیں۔

4 ۔ خوبیاں اور خامیاں تو ہر ایک کے اندر ہوتی ہیں' کوئی بھی پرفیکٹ نہیں۔ لیکن اب اپنے منہ میاں مٹھو کیسے بنیں۔۔۔ تو میاں صاب سے پوچھا' کیونکہ وہی صحیح بتا سکتے ہیں' کیونکہ ہر مرد کے اندر ایک ساس چھپی ہوتی ہے' تو انہوں نے کہا "تم بالکل فضول خرچ نہیں ہو' مخلص ہو" اور جناب ایک دفعہ ایف اے میں کالج میں مجھے بیسٹ گرل کا انعام ملا تھا اور مس راحیلہ کا یہ کہتے ہوئے انعام دینا کہ تم نہ صرف کالج کی بلکہ میری بھی پسندیدہ لڑکی ہو' تو کوئی تو خوبی ہوگی تب ہی نا۔" اب کہاں تک سنیں گے' کہاں تک سناؤں۔"

خامیاں بتاتے ہوئے بھی نہیں جھجکنا چاہیے میرے اندر بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ پہلے تو صبح جاگنے میں سست ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لے کر اپنا بی پی ہائی کر بیٹھتی ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہوں' اس لیے غصہ بھی جلدی آجاتا ہے۔

5 ۔ برسات مجھے بہت پسند ہے۔ بچپن میں تو برسات کا بہت مزا آتا تھا۔ بارش میں نہانا' بھاگنا اور بھاگتے ہوئے کیچڑ میں گر جانا' پر اب وہ مزا کہاں۔

یہ سچ ہے کہ مجھ کو عقل نے کچھ پختگی تو دی
پر وہ مزا کہاں جو نادانیوں میں تھا

برسات کے حوالے سے واقعہ ہے۔ عید کی چھٹیوں میں' میں ۔ اپنی فیملی کے ساتھ لاہور گئی سیر کرنے' وہاں ہم مینار پاکستان کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک دم آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ ہم اس بارش میں کہاں جاتے۔ ویسے بھی گرمیوں کی بارش تھی' وہاں عید کی وجہ سے کافی رش تھا۔ گرمیوں کی بارش میں سب بھیگ گئے۔ ہم بھی وہیں بیٹھے رہے۔ بچوں نے خوب انجوائے کیا لاہوریوں کے ساتھ۔ اس بارش کے بعد جو ہم نے تصویریں کھینچی تھیں انہیں دیکھ کر آج بھی ہنسی آتی ہے۔

6 ۔ شعر تو بہت پسند ہیں' ان میں موسٹ فیورٹ۔

چار راتیں ہیں ہزار باتیں ہیں
اس نے کیا' کیا کہو گے خاور

وہ چہرہ پڑھ پڑھ یاد کر لو
وہ جا چکے تو کتاب لکھنا

مجھے قصص الانبیاء کتاب بہت پسند ہے جس نے

نہیں پڑھی' ضرور پڑھیں۔
خط میں ضرور بتائیں کہ میرا انتخاب کیسا لگا۔

## مشعل فیاض.... گوجرانوالہ

1 ۔ شعاع سے وابستگی ساڑھے تین سال پہلے ہوئی اور یہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے۔ شعاع سے ناتا ایک دکان میں ہوا۔ میں لینے تو "بچوں کا باغ" گئی تھی' پر دکان دار نے شعاع پیک کر دیا۔ میں نے کچھ اور بھی چیزیں لی تھیں۔ تو ایک ساتھ ہی قیمت دی۔ گھر آئی تو اتنے بڑے بچوں کے باغ میں ماڈل دیکھ کر حیران رہ گئی' اچھا نہیں لگا۔ پر ماما نے پڑھ لیا۔ جب رسالے کے

صفحے دیکھنے لگی تو اداکاروں کے انٹرویو تھے۔ بہت شوق ہے مجھے انٹرویوز پڑھنے کا۔ پھر آہستہ آہستہ رسالہ بھی پڑھ لیا۔ پھر دو' تین ماہ بعد میں سیالکوٹ گئی تو خالہ توصیفہ کے گھر شعاع ملا پھر تو گہری دوستی ہو گئی شعاع سے' ہماری ساری فیملی مثلاً" خالہ توصیفہ' خالہ انعم اور اب میں شعاع کو بہت پسند کرتی ہیں اور خواتین کو بھی۔

2 ۔ صبح کا آغاز اذانوں سے ہوتا ہے۔ میری نیند بہت کچی ہے تو اٹھ کر نماز پڑھ لیتی ہوں۔ پھر نیند نہیں آتی۔ تھوڑی دیر لیٹ کر سارے گھر کے کام کرتی ہوں۔ ساڑھے سات بجے تک تیار ہو کر کالج جاتی ہوں۔ واپسی ڈیڑھ بجے تک ہو جاتی ہے۔ میں سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوں۔ گھر آ کر کچھ نہیں کرتی' کیونکہ میں سارے کام صبح ہی کر جاتی ہوں' اکلوتی ہوں' گھر کے کام ہی اتنے نہیں ہوتے' پھر پڑھائی تین گھنٹے کے لیے' پھر ٹی وی' پھر پڑھائی' پھر رات کا ڈراما۔ اس میں شعاع کے لیے ٹائم نکالنا مشکل نہیں۔ رات کو گیارہ بجے سو جانا اور ہاں میں سوچتی بھی بڑا ہوں۔

3 شعاع کی ہر تحریر بہت اچھی ہوتی ہے' خاص کر "جنت کے پتے" نبیلہ عزیز بہت اچھا لکھتی ہیں' ان کی تحریر "درد دل" نے واقعی درد دل کر دیا تھا۔ عمیرہ احمد کا امر بیل اتنا پسند ہے مجھے جس کی کوئی حد نہیں۔

باقی رائٹرز بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

4 ۔ میری خوبیوں کے بارے میں تو۔ مجھے خود نہیں پتا' خیر کوشش کر لیتی ہوں' حساس دل ہوں' کوئی روتا بعد میں ہے' پہلے میں رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ اپنی خالہ توصیفہ کا بہت خیال رکھتی ہوں اور یہ ہی میری بڑی خوبی ہے۔ خامیاں بے شمار ہیں۔ کام چور' سست' غصہ در بہت زیادہ ہوں' غصے میں تو دل کرتا دوسروں کا گلا دبا دوں۔ خیر اتنی بھی خوف ناک نہیں ہوں' بس ٹھیک ہے۔

5 ۔ بارش مجھے کبھی اچھی نہیں لگتی۔ الجھن ہوتی ہے بارش کو دیکھ کر اور جو مسلسل بارش ہو تو چڑ جاتی ہوں اور بند ہونے کی دعا کرتی ہوں۔

6 ۔ پسندیدہ شعر' کوئی خاص نہیں' لطیفے مجھے یاد نہیں رہتے۔

راستوں کے درمیان چھپی ہوئی ہیں دوریاں
سہمی سی یہ رات ہے روشنی کے درمیان

رخسانہ نگار عدنان

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آ جائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے

جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ پاتی ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر ہوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے۔ بشریٰ کے آنے کے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل، عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور ایک بار پھر بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال، بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا

ہے۔ مثال ٗ واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔
عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار ٗ وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔
سیفی ٗ مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے بہکا رہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کرلیتا ہے۔ مثال اور بشریٰ مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہوجاتا ہے۔ بشریٰ مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واثق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واثق کے درمیان ان کہا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واثق البتہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرچکا ہے۔ واثق ٗ عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔ عاصمہ خوش ہوجاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واثق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آجاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کرکے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا بیتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجائنا کا اٹیک ہوجاتا ہے۔ واثق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کردیتا ہے۔ عفت ٗ مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہوجائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہورہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واثق کی ملاقات پریشے سے ہوجاتی ہے جو کافی ناز وادا سے واثق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وردہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے ٗ واثق کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کردیتی ہے۔ عفت خوش ہوجاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشریٰ کو فون کرکے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں واثق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے واثق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتادیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہوجاتا ہے۔ پریشے ٗ وردہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واثق سے ملاقات ہوجاتی ہے۔

## پچیسویں قسط

وہ کچھ لمحے وہیں کھڑی خالی دماغ سی دیکھتی رہی۔
سامنے گاڑی میں بیٹھا عدیل احمد کسی اور ہی طرف یک ٹک دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔
مثال کو ہمیشہ کی طرح اپنے باپ پہ الگ طرح ہی کا پیار آیا تھا۔
"بابا دانی کے واقعے کے بعد کس قدر پریشان ہیں ٗ پھر عفت ماما کا رویہ ٗ کتنے اکیلے سے ہوگئے ہیں بیچارے اور پھر جس طرح میں انہیں پریشان کررہی ہوں انہیں مجھ سے تو یہ امید نہیں ہوگی۔"
وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سارے کردہ ناکردہ جرم اپنے ہی کھاتے میں ڈال کر عدیل کو سرخرو کررہی تھی ٗ جب ہارن کی آواز نے اسے چونکایا۔ عدیل ہارن بجا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی فائل کو سینے سے لگائے مضبوط قدم اٹھاتی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"پتا نہیں وہ آج اسے خود کیوں لینے کے لیے آئے تھے' ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا' کم سے کم بہت سالوں سے تو بالکل بھی نہیں۔" اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔
"پاپا! پری کو بھی بلا لوں ویسے اس کی ابھی دو کلاسیں رہتی ہیں۔ میں اسے کہہ دوں جا کر۔" وہ گاڑی کے پاس جا کر شیشے میں جھک کر پوچھنے لگی۔ عدیل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔
اور نفی میں سر ہلا دیا۔
اس نے گہرا سانس یوں لیا جیسے کہیں بہت دور کا سفر کر کے آیا ہو۔
"تم آجاؤ... پری اپنی وین میں آجائے گی۔" وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ مثال خاموشی سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔
"پاپا!" اس کی مسلسل خاموشی پر وہ کچھ دیر بعد قدرے محتاط لہجے میں آہستگی سے بولی۔
"گھر میں سب ٹھیک ہے نا!" اسے کچھ ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہو۔
"پتا نہیں۔" وہ عجیب لاتعلقی سے بولا تو وہ حیران سی رہ گئی۔
"آپ آفس سے آرہے ہیں؟" وہ پھر رہ نہ سکی تو کچھ توقف سے بولی۔
"ہوں!" معلوم نہیں وہ بات ہی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔
"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!" وہ اس کے انداز پر رہ نہ سکی تو تھوڑی دیر بعد پھر پوچھنے لگی۔
"اگر گھر میں کچھ ہوگا یا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی تو ہی میں آپ کو پک کرنے آسکتا ہوں' تمہارے پوچھنے کا یہ مطلب ہے کیا؟" وہ لہجے میں بہت کچھ جتاتے ہوئے بولا تو وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔
"نہیں پاپا سوری!" وہ واقعی میں شرمندہ ہوگئی تھی۔
"سوری... فار واٹ؟" وہ پھر سے الٹا پوچھنے لگا۔
وہ کچھ بول ہی نہ سکی گود میں رکھی فائل پر اپنی نم انگلیاں یوں ہی پھیرتی رہی۔
اگر باپ اور بیٹی کے بیچ میں ماں نہ رہے تو بیٹی کو باپ کو سمجھنا' اس سے بات کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ماں ان دونوں کے درمیان پل ہوتی ہے اور بہت سال ہوئے مثال اور عدیل کے تعلق کے بیچ کا یہ پل کہیں کھو گیا تھا۔ گر گیا تھا۔ دونوں کے درمیان اب خلا سا تھا اس پل کے کھو جانے کے بعد۔
اور وہ خلا اتنے سالوں کی مدت بھی' اس کو نہیں بھر سکی تھی' بلکہ عفت اور اس کے دونوں بچوں کے آجانے کے بعد یہ خلا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔
کاش میں اسی آسانی کے ساتھ پاپا سے بات کر سکتی جتنی آسانی اور بے تکلفی سے میں ماما کی موجودگی میں کر لیا کرتی تھی۔

"پتا نہیں پاپا مجھے کیوں خود سے اتنی دور دور محسوس ہوتے ہیں' ایک عجیب سا خوف' عجیب سا رعب... میں ڈر گئی ہوں ان سے۔ کبھی بھی کھل کر بات نہیں کر پاتی اور اب تو یہ خوف اور بڑھ گیا ہے کہ کہیں پاپا مجھے ماما کے پاس نہ بھجوا دیں۔"
وہ کن انکھیوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے افسردہ سی بیٹھی کچھ سوچے جا رہی تھی۔
عدیل کیا سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا' کیونکہ اس کا چہرہ بظاہر سپاٹ تھا' لیکن سامنے سیدھی سڑک پر جمی اس کی نظروں میں بہت کچھ تھا۔
گہری سوچ' فکر اور دکھ... یہ تینوں چیزیں مثال کو اپنے باپ کے ساتھ جڑی بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔

"دادو کی زندگی میں تو پاپا پھر بھی کبھی کبھار ہنس پڑتے تھے، بے ساختہ مسکرا لیتے تھے، مگر اب تو جیسے وہ مسکرانا بھول گئے ہیں۔ اس کا دل پھر باپ کے لیے پگھلا جا رہا تھا۔

وہ گہرا سانس لے کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے چونک سی گئی۔

"پاپا ہم گھر نہیں جا رہے کیا؟" کچھ دیر تک وہ رہ نہ سکی تو پھر پوچھنے لگی۔

"جا رہے ہیں گھر میں۔" بڑا مبہم سا جواب تھا جبکہ وہ جانتی تھی یہ رستہ کم از کم گھر نہیں جا رہا۔

عدیل کا دھیان بھی اس کی طرف نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کس بات کو اتنی توجہ سے سوچے جا رہا تھا۔ اب مثال کو کچھ پریشانی ہونے لگی۔

☆ ☆ ☆

"پاکٹ منی۔" وہ تنفر سے ہنکارا۔

"دانی!" عفت اس کے انداز سے گنگ سی تھی۔

"آپ کے نزدیک سو دو سو روپیہ پاکٹ منی ہے۔ مائی فٹ اتنے میں آپ ایک ڈھنگ کا پیزا برگر کچھ بھی تو نہیں کھا سکتے۔ ایک اچھا ڈرنک بھی نہیں لے سکتے اور آپ کہتی ہیں۔ مجھے پاکٹ منی ملتی تو ہے۔" وہ غصے میں بھرا ہوا تھا آج عفت نے اسے اسکول نہیں بھیجا تھا۔

وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی، اسے سمجھانا چاہتی تھی، لیکن وہ کسی بھی بات کو سننے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

اس کی اپنی ہی دنیا تھی، جس میں ہر بات کی الگ ہی لاجک تھی۔

"میرے فرینڈز کے پاس ان کی پاکٹ میں، ان کے والٹ میں ففٹی تھاؤزنڈز سے کم پیسے نہیں ہوتے۔ میں تو اپنے فرینڈز میں ڈھنگ سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ میرا والٹ ہمیشہ خالی ہوتا ہے اور مٹھی میں آپ کے شوہر سو دو سو روپے دے کر سمجھتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داری بڑے شان دار طریقے سے نبھا رہے ہیں۔" غصہ، نفرت، طیش، بیزاری کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں؟

عفت جب بھی دانی سے اس طرح کھل کر بات کرنا چاہتی، کسی نئی دنیا کی حیرت میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ ہر بار ایک بدلا ہوا دانی ہوتا تھا۔ معلوم نہیں وہ ایسا کیوں تھا۔

لاکھ سر پٹخنے پر بھی عفت کو معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

"تمہارا باپ اتنا امیر آدمی نہیں ہے دانی!" وہ بے بسی و بے چارگی کی تصویر بن کر بولی۔

"تو پھر وہ مجھ سے کس طرح (توقع) Expect کرتے ہیں کہ میں محنت کروں گا، میں بہت کچھ بنوں گا۔ وہ خود کیوں نہیں محنت کرتے۔ کیوں دوسروں کے فادرز کی طرح آگے بڑھتے ان کی طرح پیسہ نہیں کماتے.... وہ جس جاب پر پہلے دن لگے تھے، آج تک وہیں خود کو کھپا رہے ہیں۔ ہر سال دو تین ہزار روپے کی انکریمنٹ سے وہ خوش ہو جاتے ہیں، پراؤڈ فیل کرتے ہیں کہ وہ کتنا ارن کر رہے ہیں۔"

وہ سولہ ساڑھے سولہ سال کا دانی تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا۔

"میرے پاس نہ برانڈڈ کپڑے ہوتے ہیں، نہ اس اسٹینڈرڈ کی ڈریسنگ ہوتی ہے میری، جس طرح کی میرے فرینڈز کرتے ہیں۔ میں کس طرح ان کے درمیان موو کروں، مجھے خود سے Irritation (جھنجلاہٹ) ہوتی ہے۔ میں خود کو بونا فیل کرتا ہوں۔ ایک سیلف میڈ، غریب باپ کا بیٹا۔ ایک بیٹا ہی ہوں میں پاپا کا، انہوں نے کبھی

میرے ساتھ کچھ اسپیشل نہیں کیا۔ ان کا رویّہ ' ان کی سوچ میرے لیے ہمیشہ فار گرانٹیڈ ہوتی ہے۔" وہ حیرت انگیز انکشاف کر رہا تھا۔

"ایسے نہیں سوچتے دانی! وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔" عفت نے بات کو سلجھانے کی طرف پیش قدمی کی۔

"مجھے ان کی محبت کی ضرورت نہیں ' مجھے وہ جو کچھ پرووائیڈ کرتے ہیں اس میں ان کی محبت نظر آنی چاہیے ' ان کی پروا میرے لیے ان کا خیال۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔ الٹا میں اپنے دوستوں میں بیٹھ کر شرمندہ ہوتا ہوں کہ میں اپنے پیرنٹس کا ایک ہی بیٹا ہوں۔۔۔ کوئی بھی۔۔۔ کوئی بھی میری تکلیف کو نہیں سمجھ سکتا آپ بھی نہیں۔۔۔ پاپا بھی نہیں۔" اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور عفت کی حیرت!

"اسی لیے۔۔۔ اسی لیے میں یہاں اس گھر میں کسی سے بات نہیں کرتا کیونکہ کوئی بھی مجھے نہیں سمجھتا۔ سمجھنا چاہتا بھی نہیں ' جب کسی کو بھی میری پروا نہیں تو مجھے بھی کسی کی فکر نہیں۔ آپ لوگ اپنی مرضی سے زندگی جئیں مجھے میری مرضی سے جینے دیں ' مت انٹرفیر کریں جو کچھ میں کر رہا ہوں۔" وہ کھڑے ہو کر زور زور سے بول رہا تھا۔ اور عفت کو جیسے خود پر قابو پانا محال ہو گیا۔ اس نے ایک دم سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

وہ ششدر سا گال پر ہاتھ رکھے ماں کو دیکھتا رہا۔

اس ماں کو جس نے کبھی آج تک اس سے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی ' تھپڑ تو بہت دور کی بات تھی۔

"تمہیں اگر اتنی سمجھ ہے اپنی ضرورتوں کی ' اپنی تکلیفوں کی ' اپنی سب باتوں کی ' تو پھر تمہارے اندر اتنی عقل بھی ہونی چاہیے کہ تم اپنے ماں باپ کو بھی سمجھنے کی ' ان کو سننے کی کوشش کرو ' جنہوں نے تمہیں پیدا کیا پالا پوسا تمہاری ہر ضرورت کو ہنس کر پورا کیا۔"

"کوئی احسان نہیں کیا آپ نے مجھ پر۔ ساری دنیا کے والدین ایسے ہی کرتے ہیں۔" وہ ہر لحاظ اٹھا کر چل دیا تھا۔

"میں اپنی مرضی سے۔ اس گھر میں کبھی پیدا نہیں ہوتا اگر مجھ سے پوچھا جاتا ' جہاں کسی کو میری ضرورت تھی ہی نہیں اور سن لیں آپ بھی ' بے شک بتا دیں بابا کو بھی ' مجھے یہاں رہنا بھی نہیں جہاں رہتے ہوئے مجھے اپنے ہونے پر شرمندگی ہو۔ میں چلا جاؤں گا یہاں سے ' بہت جلد۔۔۔ پھر روتی رہنا مجھے یاد کر کے۔" وہ چیختا ہوا چلا گیا عفت پتھر کی طرح بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
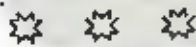
شفاف پانیوں کی نیلی جھیل میں تیرتی چھوٹی چھوٹی مختلف رنگوں کی مچھلیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی رزق کے چھوٹے چھوٹے ذروں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں ' وہ کن اکھیوں سے ان خوب صورت سنہری رنگ والی مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی ویٹر ٹیبل پر پلیٹیں اور چمچ چھریاں کانٹے رکھ رہا تھا۔

وہ چلا گیا تو کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموشی سی ہو گئی سارے میں! اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے عدیل کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا وہ اس کی طرف منتظر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں۔۔۔ نہیں پاپا۔" بہت آہستہ مگر دوٹوک لہجے میں اس نے کہا تھا۔ کہہ کر اس نے فوراً" عدیل کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کے باپ کی تھکی ہوئی پژمردہ آنکھوں میں کیسی زندگی سے بھرپور چمک کی لہر دوڑی تھی وہ لمحے بھر کو بس انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"کیا پاپا کو لگتا تھا انہیں یقین تھا کہ میرا جواب یہ نہیں ہوگا۔" اس نے دل میں کچھ اور سوچا۔
"تمہیں یقین ہے نا مثال۔" وہ اس سے پکی گارنٹی چاہ رہا تھا۔
اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر گردن جھکائی تو اسے لگا واثق ان مچھلیوں کے پاس جھیل کنارے بیٹھا اسے بہت شکایتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ کیا کرتی؟
اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے پاپا کو کوئی دکھ نہیں دے گی، مگر اس کا دل۔
وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو نہ چاہتے ہوئے بھی واثق کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔
"شکر ہے میرے اللہ کا۔" اس نے عدیل کی تشکر بھری بڑبڑاہٹ سنی تو چونک کر باپ کو دیکھنے لگی۔
"مجھے جانے کیوں خوف سا تھا مثال..... مجھے لگ رہا تھا شاید تم کسی میں..... حالانکہ میں جانتا ہوں میری بیٹی اس ٹائپ کی نہیں ہے، میری بیٹی بہت معصوم سادہ اور ان چیزوں سے دور رہنے والی ہے، وہ اس طرح کی بات نہیں کر سکتی مگر۔" وہ جیسے رک کر مناسب الفاظ سوچنے لگا۔
"مثال! پھر آپ کے یوں بار بار انکار کی وجہ.....؟ مجھے پریشان کر رہی تھی بیٹا۔" وہ کچھ بے بسی سے بولا۔
"پاپا میں اتنی جلدی نہیں چاہتی یہ سب، میں ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔" اس نے دھیمے مگر فریادی سے لہجے میں کہا۔
"میں جانتا ہوں، سمجھتا ہوں آپ کی فیلنگز کو..... لیکن مثال۔" وہ پھر رک گیا کوئی سوچ تھی جو اسے روکتی تھی۔
"پاپا..... کیا بات ہے۔" وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ اسے عدیل کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
"پتا نہیں..... بہت عجیب سا فیل ہو رہا ہے، دانی والے واقعے نے جیسے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔" وہ ہلکے سے سینہ مسل کر بولا۔
اور پہلی بار..... پہلی بار مثال کو لگا اس کا باپ ایک دم سے بوڑھا ہو گیا ہے۔
اس کا جی چاہا وہ فوراً اٹھ کر پاپا کو اپنے ساتھ لگا کر انہیں دلاسا دے، تسلی دے کہ پاپا میں ہوں نا آپ کے ساتھ، میں آپ کو کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گی۔
مگر صرف اس کی آنکھوں میں نمی اتری، وہ یہ سب کہہ نہیں سکی اپنے باپ سے۔
"آپ ٹھیک ہیں پاپا؟" وہ اٹھ کر پاس آ کر بولی۔
"میں ٹھیک ہوں مثال۔ معلوم نہیں مجھے کیوں لگ رہا ہے، میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ پہلی بار بہت بے چینی سے جیسے اسے کچھ الہام ہوا ہو بے بس لہجے میں بولا۔
"نہیں پاپا! آپ پلیز ایسی باتیں نہیں کریں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا اور دانی ابھی ناسمجھ ہے آپ اسے ٹائم دیں، توجہ دیں وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ہولے ہولے باپ کا کندھا دبا کر بولی۔
"مجھے نہیں لگتا..... شاید اب اس کا وقت گزر گیا ہے۔" وہ کراہ کر آہستہ آواز میں بولا۔
"پاپا ایسا نہیں ہے، میں بھی آپ کے ساتھ دانی کو ٹائم دوں گی ہم مل کر اسے سدھار لیں گے۔" وہ بڑے عزم سے کہہ رہی تھی۔
"اس کی اب ضرورت نہیں۔" وہ خود کو سنبھال کر سیدھا ہو کر بولا۔ مثال اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"مجھے صرف تم سے یہ تسلی چاہیے تھی مثال! کہ تم میرے ساتھ کچھ بھی ایسا ویسا نہیں کرنے والی، جو دانی نے کیا ہے، کیوں کہ مثال میں وقار اور فائزہ کو زبان دے چکا ہوں، وہ جلد شادی کا کہہ رہے ہیں اور میں اپنی زبان سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ تم اپنی ایجوکیشن جو بھی تمہارا ارادہ ہے شادی کے بعد اسے پورا کرنے کا سوچنا۔" وہ رک کر

جیسے سانس لینے لگا۔
"میں سب محاذوں پر نہیں لڑ سکتا' تمہاری طرف سے مجھے اطمینان ہونا چاہیے' وہ اس مہینے میں شادی کی ڈیٹ مانگ رہے ہیں' میں انہیں تاریخ دے رہا ہوں۔ تم اب مجھے دوبارہ پریشان نہیں کرو گی۔" وہ اس کے لیے راستے بند کرتے جا رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔
دیٹر اب ان کے آگے کھانا سرو کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عفت چہرے پر برسوں کی بیمار صورت سجائے کسی گہری سوچ میں بیٹھی تھی۔ پری دوبار چکر لگا کر جا چکی تھی۔
"مما! یہ مثال آپی کدھر رہ گئیں آج' میں کب سے کالج سے آ چکی ہوں اور وہ۔" تیسری بار وہ رہ نہ سکی تو پوچھ بیٹھی۔
"جہنم میں۔" وہ سخت نفرت بھرے لہجے میں بولی۔
"میں بتا رہی ہوں نا اس کا کہیں نہ کہیں چکر چل رہا ہے۔" وہ ماں کے پاس بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں بولی۔
"تو بھاگ جائے منحوس جس کے ساتھ چکر چلا رہی ہے' ہماری جان چھوڑے' یہاں کم عذاب ہیں ہمارے لیے ایک وہ مزید آ بیٹھی۔" عفت کو ساری مصیبتوں کی وجہ صرف مثال لگ رہی تھی۔ پری ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔
"تمہارے باپ کو جو تھوڑی بہت اس گھر کی فکر ہوتی تھی تم دونوں کی پروا ہوتی تھی' وہ بھی نہ رہی جب سے یہ چھلیڈی اس گھر میں آئی ہے۔" وہ دانیال کے رویے سے سخت کبیدہ خاطر تھی اور غصہ مثال کی موجودگی پر نکالتی جا رہی تھی۔
"ہو تو رہی ہے دفع' وہ بھی اتنی شاندار جگہ پر۔" پری حسد بھرے لہجے میں جیسے کلس کر بولی۔
عفت کو جیسے بھولا ہوا ایک اور غم یاد آ گیا۔
"یہ بھی صرف تمہارے باپ کی وجہ سے۔" وہ اس جلے بھنے انداز میں پھر سے کہہ گئی۔
"ہمارے ساتھ یہ ناانصافی کب تک ہوتی رہے۔ مما! پاپا ہمیشہ مثال آپی کو ترجیح دیتے ہیں' جیسے وہ سوتیلی نہیں' میں اور دانی سوتیلے ہیں۔ دیکھ رہی ہیں آپ اس کے بعد پاپا نے دانی کو بلایا تک نہیں۔ اسے بالکل سب سے کاٹ کر جیسے الگ کر دیا گیا ہو۔" وہ جانتی تھی دانی ماں کی کمزوری ہے اس کو ہٹ کرتے ہوئے بولی عفت کی آنکھوں میں مارے دکھ کے آنسو آ گئے۔
"کیا کروں میں۔۔۔ میرا بچہ کیسا اکیلا سا پڑ گیا' باپ ہوتے ہیں اولاد کے ۔ ہمدرد' پھر بیٹا وہ بھی اکیلا۔۔۔ کیا کیا نہیں کرتے باپ اکلوتے بیٹے کے لیے۔۔۔ ایک یہ ہیں کیا کر رہا ہے کہاں ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ کوئی پروا ہی نہیں۔" وہ ہاتھ مل کر کہہ رہی تھی۔ پری کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔
"مما! کیا مثال آپی امریکہ چلی جائیں گی شادی کے بعد اس فہد بھائی کے ساتھ۔" وہ کچھ دیر بعد گہری سوچ سے نکل کر پوچھ رہی تھی۔
"کالے پانی جائے ہماری بلا سے۔۔۔ وہاں بسے گی تو پھر نا' اس کی ماں کا گھر کن مشکلوں سے بسا' ساری دنیا جانتی ہے' جیسی ماں تھی ویسی ہی بیٹی ہوتی ہے نا۔" اور اندر آتی مثال اور اس کے پیچھے کھڑے عدیل کے قدم وہیں رک گئے۔ عفت کی دونوں کی طرف پشت تھی۔
پری ان دونوں کو دیکھ چکی تھی مگر ماں کو روک نہیں سکتی تھی جواب بھی منہ بھر کر بول رہی تھی۔

"دیکھ لینا میری بات لکھ کر رکھ لو' چوتھے دن یہ لڑ بھڑ کر ماں کی طرح نہ طلاق کے کاغذ لے کر واپس آئی تو میرا بھی نام عفت نہیں۔" وہ جوش بھرے لہجے میں کہتے ہوئے یونہی ذرا سا پلٹی تو بیٹھے بیٹھے کھوئی اور سامنے کھڑی مثال اور پیچھے کھڑے کینہ توز نظروں سے گھورتے عدیل کو دیکھ کر جیسے گنگ سی ہوگئی۔ عدیل اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

"آپ آگئے' سخت فکر مند ہو رہی تھی میں بھی اور پری بھی' آپ کو کال کر رہی تھی مگر یہ...." عفت بولتے بولتے خود ہی رک گئی عدیل اسی طرح اسے دیکھے جا رہا تھا۔

مثال سر جھکا کر کسی مجرم کے سے انداز میں کھڑی تھی۔

"اچھا ہی ہوا عفت بیگم! تم نے اپنے دل کی نفرت ظاہر کردی اگرچہ مجھے پہلے بھی کوئی شک نہیں تھا کہ تم مثال کے بارے میں کیسی سوچ رکھتی ہو... اب یقین ہو گیا۔" وہ سرد لہجے میں اسے کہتا وہیں جیسے جم کر کھڑا تھا۔

عفت کھڑے کھڑے جیسے زمین کے اندر دھنس رہی تھی۔ وہ دو قدم بڑھا کر اس کی طرف آیا۔

"کسی انسان کو بدلنا تو کسی دوسرے انسان کے بس کی بات نہیں' لیکن یہ یاد رکھنا کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا کبھی بھی.... تمہاری بری سوچ کے باوجود... عفت! پری میری بیٹی ہے میں اس کے لیے ہمیشہ ایک بہت اچھی زندگی کی دعا کرتا رہوں گا کہ اسے تمہاری سوچ کی سزا خدا کبھی نہیں دے۔"

اور عفت کو عدیل سے کم از کم یہ امید تو کبھی بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اس طرح دونوں بیٹیوں کے سامنے ایک سگی... اور ایک سوتیلی دونوں کے سامنے اس طرح اسے پورے قد سمیت چھوٹا کر دے گا کہ وہ کبھی خود کو آئینہ دیکھنے کے قابل نہیں سمجھے گی۔

"کسی دوسرے کے لیے برا سوچنے والے اپنے لیے اچھے ہونے کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں یہ مقام حیرت ہے۔" وہ اسے جتانے والے انداز میں کہہ کر انہیں قدموں پر واپس مڑ کر گھر سے باہر جا چکا تھا۔

اور عفت گھبراہٹ میں یہ بولتے ہوئے بھول گئی کہ ابھی عدیل کے آفس سے واپسی کا وقت کب ہوا تھا جو وہ اسے جتا رہی تھی کہ وہ کہاں رہ گیا تھا' وہ پریشان ہو رہی تھی۔

عفت وہیں نڈھال سی گر گئی' پری ترس بھری نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی مثال بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دل تو یوں بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔

آج اس کے دل نے پہلی جنم لیتی محبت کو جو ابھی پھوٹ کر کونپل بھی نہیں بنی تھی' بڑی خاموشی سے الوداع کہہ دیا تھا۔ اس کا بھاری پتھر سا وزن کچھ کم نہیں تھا جو عفت کی یہ باتیں! "کیسے.... کیسے اس نے مثال کو ہمیشہ بشریٰ کے ساتھ جوڑ کر یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر بشریٰ طلاق لے کر گئی تھی تو مثال کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونا تھا۔

وہ زخم جو اتنے سال گزر جانے کے بعد ابھی تک مثال کے دل میں ہرا تھا کہ جیسے یہ اندوہناک واقعہ ابھی کل ہی تو ہوا ہے پھر عفت جیسے لوگ جو اسے مندمل ہونے ہی نہیں دیتے تھے اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

لیکن اسے رونا نہیں... لیکن یہ بھی پتا تھا کہ اگر نہیں روئے گی تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔

"کاش یہ دل پھٹ جائے تو سارے عذاب آج ختم ہو جائیں گے' کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے دل سے دعا کی' لیکن وہ لمحہ قبولیت کا نہیں تھا۔ وہ بے آواز آنسوؤں سے پگھلتی شمع کی طرح یونہی قطرہ قطرہ سلگنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عفت نے بڑی محنت سے وانی کی پسند کی ساری ڈشز بنائی تھیں وہ صبح سے کمرے میں بند تھا۔

اس کی بدتمیزی اور اتنے برے رویے کے باوجود بھی عفت نے بہت سوچ سوچ کر خود اپنے بیٹے کے لیے محنت

کرنے کا فیصلہ کیا۔
وہ اب خود وانی کو بدلے گی اسے ایک اچھا قابل لڑکا بنائے گی اور عدیل پر ایک دن ثابت کر دے گی کہ وہ ایسی بھی غیر ذمہ دار پھوہڑ ماں نہیں ہے، جس نے صرف بچوں کو پیدا کیا ہے، انہیں بنانے سنوارنے کی طرف دھیان نہیں دیا اس کے دل میں عزم تھا وہ گھنٹوں کچن میں گھسی اس کے لیے اس کی پسند کے کھانے بناتی رہی۔
"مما! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی بس کر دیں۔" پری بے چین ہو کر کئی بار آئی۔
"اور مجھے نہیں لگتا کہ وانی یہ سب کھائے گا اور جس طرح اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی آپ کو اس سے ناراض ہونا چاہیے تھا، الٹا آپ اس کی خاطر داریاں کر رہی ہیں۔" وہ کوفت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"پری! تمہیں بھی اس کے ساتھ کچھ دوستی، محبت کا برتاؤ کرنا ہو گا۔" تمہارا چھوٹا بھائی ہے، اسے تمہارا پیار چاہیے تمہاری توجہ۔" وہ پری کو بھی سمجھانے لگی۔
"مما! وہ ان سب چیزوں سے دور جا چکا ہے۔" پری نے دم پر رکھے پلاؤ میں سے ایک بوٹی اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔
"ایسا نہیں ہے پری! تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔" وہ پوری طرح سے فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے وانی کو سدھارنا ہے۔ باہر اسپورٹس بائیک کی تیز آواز آئی۔ اور ماں بیٹی چونک گئیں۔
تاسف بھری نظروں سے پری ماں کی طرف دیکھتے ہوئے فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر پینے لگی۔
"ساری آپ کی محنت بے کار گئی، اس کا جگری دوست بوبی باہر آ گیا ہے مما! وہ اب کسی بھی صورت گھر نہیں رکے گا اور رات سے پہلے آئے گا نہیں، اور کھانا تو وہ اب گھر میں نہیں کھائے گا۔"
اور عفت کو لگ رہا تھا کھڑے کھڑے اس کی تختہ کمر سے جو درد کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ اس کے پورے جسم کو بے جان کر رہی ہیں وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئی۔
"وانی! رکو مت جاؤ باہر بیٹا! تمہارے پاپا آنے والے ہیں اچھا بوبی کو اندر بلا لو میں نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے بہت محنت سے۔ وانی رکو۔" وہ اسے تیار ہو کر باہر جاتے دیکھ کر پکارتی اس کے پیچھے لپکی تھی مگر وہ ان سنی کر کے جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں۔" مثال خود کو سنبھال چکی تھی سو متوازن لہجے میں بولی دوسری طرف واثق کچھ ٹھٹکا۔
"مثال۔" وہ بے چینی سے بولا۔
"واثق میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اب آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی مجھے اب صرف وہ کرنا ہے جو میرے پاپا چاہیں گے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔
"تو پھر تمہیں میری کال بھی نہیں لینی چاہیے تھی، جبکہ تم مجھے رات میں منع کر چکی تھیں۔" وہ طنز بھرے لہجے میں بولا۔
مثال ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں پھر سے نمی اترنے لگی۔
"تم پلیز اب رونا شروع نہیں کر دینا میں کچھ جتا نہیں رہا تمہیں صرف مذاق کر رہا ہوں۔" وہ فوراً سے بولا۔
پتا نہیں اسے کیسے مثال کے آنسوؤں کے بارے میں پتا چل جاتا تھا۔

"میں نہیں رو رہی۔" وہ آہستگی سے آنکھیں صاف کر کے فوراً بولی۔

"اچھی بات ہے تم نے اپنی آنکھیں صاف کر لیں مثال! میں صرف یہ چاہتا ہوں تم ہنسو مسکراؤ اور دل سے خوش زندگی بسر کرو تم کبھی نہیں روؤ۔" وہ بہت جذبے سے کہہ رہا تھا۔

ایسی محبت بھری دعا بھی کسی نے اس کے لیے نہیں چاہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

وہ کچھ بول ہی نہیں سکی.... وہ یوں بھی واثق کے سامنے کچھ بول نہیں پاتی تھی۔ آج تو اس نے اتنا کہہ کے جیسے بالکل ہی اسے گنگ کر دیا۔

"مثال! ہم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے' کبھی میری دوستی تمہارے لیے کسی پریشانی کی وجہ بنی تو یقین کرو میں تمہارے منع کرنے سے پہلے خود ہی پیچھے ہٹ جاؤں گا اور تم جانتی ہو میں کم از کم تمہارے دل کا حال تو تھوڑا بہت جان ہی لیتا ہوں۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا تھا۔

اور اس کا دل چاہا وہ رو دے۔

"اگر کھل کر رونا چاہتی ہو تو پلیز رو لو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" وہ پھر کچھ دیر بعد اسے مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

"یہ بوجھ اب کبھی ہلکا نہیں ہو گا۔" وہ بھاری آواز میں بولی۔ دونوں طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"مثال۔" وہ بوجھل آواز میں اس کا نام لے کر بولا تو اس کا دل بہت بری طرح سے دھڑکا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس کے پہلو میں ہی بہت قریب اس سے جڑ کر بیٹھا ہو' وہ کچھ اور بھی سمٹ کر منتظر سی نظروں سے اپنے دائیں طرف دیکھنے لگی۔

"تم مجھے اتنی اجازت تو دو گی میں کبھی کبھار جب دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہو جاؤں تو تم سے بات کر لوں' تمہیں فون کر لوں؟" وہ بہت مجبور سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"پتا نہیں ایسا ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ میرے ساتھ آگے کیا ہونے والا ہے میں خود بھی نہیں جانتی..... میں کسی بھی بات کے بارے میں کبھی بھی شیور نہیں رہی۔ مجھے ہونے ہی نہیں دیا گیا' ہمیشہ ہر معاملے میں بٹی رہی۔ تقسیم شدہ۔" وہ کسی گہرے دکھ کی سوچ میں ڈوب کر دھیرے سے بولی۔

واثق کچھ بول ہی نہیں سکا۔

"ہمیشہ اپنے فیصلوں کے لیے بہت اہم فیصلوں کے لیے مجھے کسی اور کی طرف دیکھنا پڑا۔ جن بچوں کے ماں باپ تقسیم ہو جاتے ہیں نا واثق! وہ زندگی میں بہت بے اعتبار بے بھروسہ رہتے ہیں ہر معاملے' ہر کام میں ڈانواڈول..... میں بھی ایسی ہوں.... آج میں آپ کو اجازت دے دوں اور کل میرے ساتھ کیا ہو میں کچھ بھی نہیں جانتی۔" وہ رک رک کر بڑے طریقے سے اقرار اور انکار کے بیچ لٹکی۔ جیسے خود بھی اسے اپنی زندگی سے خارج نہ کرنا چاہتی ہو۔ شاید وہ اسے ہمیشہ اجازت' اور انکار کے درمیان رکھنا چاہتی تھی اس نے آہستگی سے واثق کا جواب سنے بغیر فون کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"کل فائزہ بھابھی اور وقار آ رہے ہیں شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے۔" ناشتے کی میز پر وہ تینوں چونک کر عدیل کو دیکھنے لگیں۔ عفت کچھ لمحے کچھ بول نہیں سکی۔

کل دونوں کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی تھی' اس کے بعد عدیل نے رات اسٹڈی روم میں ہی گزاری اور

عفت کا حوصلہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ جا کر اسے کمرے میں آنے کے لیے کہے' ساری رات بے چین خالی بیڈ پر کروٹیں لیتی رہی۔

ایک دانی کی پریشانی جو رات بہت دیر میں گھر آیا اور عدیل کو اس کے باہر ہونے کا پتا نہیں چلے وہ خنکی میں گیٹ کے آس پاس اندھیرا کیے ٹہلتی اس کا انتظار کرتی رہی۔

اس کے گھنٹی بجانے سے پہلے ہی اس نے بہت آہستگی سے بغیر کسی کھٹکے کے گیٹ کھول دیا۔

وہ ماں کو دیکھے بغیر کسی معذرتی رویے کے بغیر اپنے میں مگن اندر چلا گیا۔ اور وہ خود بھی اس وقت دانی سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر عدیل کو پتا چل گیا تو بہت بڑا ہنگامہ ہو جائے گا۔

اور اب عدیل کی بے اعتنائی.... اسے رات بھر توڑتی رہی شاید غلطی میری ہے' مجھے مثال کے لیے اتنا بھی برا نہیں سوچنا چاہیے۔ بہرحال میں بھی ایک بیٹی کی ماں تو ہوں۔ وہ آخر میں اس نتیجے پر پہنچی تھی۔

وہ عدیل سے معذرت تو نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اس نے خود ہی صبح بیڈ ٹی بنا کر عدیل کو جا کر اسٹڈی میں دے دی جہاں اس نے اپنا سنگل بیڈ بھی بچھا رکھا تھا۔

معلوم نہیں وہ بھی رات بھر سویا یا نہیں' لیکن بستر بے شکن تھا۔

"اور فہد... وہ بھی آ رہا ہے؟" بہت دیر بعد عفت کو خیال آیا کہ اسے کچھ بولنا تو چاہیے۔ عدیل کے کرسی چھوڑنے سے پہلے بولی۔

"فہد اس ہفتے آ رہا ہے۔" وہ نپے تلے انداز میں بولا۔

"دانی اسکول چلا گیا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد خود ہی بولا۔

"جی... چلا گیا ہے۔" وہ کچھ شرمسار سے لہجے میں بولی۔

"میں ابھی اس کے اسکول جا رہا ہوں' اس کے پرنسپل نے بلوایا ہے۔ معلوم نہیں وہ اب اسے اسکول میں رکھتے ہیں یا نہیں' پولیس اسٹیشن سے پھر آنا چھوٹی بات نہیں' ان کے اسکول کی ریپو کا مسئلہ ہے اور میرے خیال میں بھی اس کا اسکول تبدیل کر دینا چاہیے' یہاں کی بری کمپنی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا شاید اسکول بدلنے سے اس کی سوچ کچھ بہتر ہو سکے۔" وہ خود ہی رک رک کر بول رہا تھا۔

اور عفت کو تو صرف یہ خوشی تھی کہ اس نے خود سے ہی دانی کی بات تو کی۔

"میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس کا اسکول بدل دیا جائے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"وہ رات کو دیر سے آیا تھا گھر؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ عفت کچھ بول ہی نہ سکی' نہ ہاں کر سکی نہ ناں۔

"پاپا! میری وین آ گئی ہے' میں جا رہی ہوں کالج خدا حافظ۔" مثال وین کا ہارن سن کر اپنا بیگ اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔

"سنو مثال۔" عدیل نے اسے پکارا۔

پری اور عفت متوجہ ہو گئیں۔

"کچھ نہیں' تم جاؤ واپس آؤ گی تو پھر بات ہو گی۔" کچھ سوچ کر عدیل نے کچھ ٹالنے والے لہجے میں کہا۔

مثال سر ہلا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

"اب تو میرے خیال میں مثال کو کالج نہیں جانا چاہیے۔ اگر کل وہ لوگ ڈیٹ فکس کرنے کے لیے آ رہے ہیں تو... یوں بھی کونسا لمبے دنوں کی تاریخ رکھیں گے وہ؟" عفت کچھ جتا کر بولی۔

"میں بھی مثال سے یہی کہنے والا تھا' اب وہ جا رہی ہے تو سوچا واپس آئے گی تو بات کرلوں گا۔" وہ کپ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"اور عفت! تم مجھے لسٹ بنا دو سامان کی جو مثال کے لیے چاہیے ہو گا' میرے خیال میں اب ہمیں تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔"
"جی بالکل آپ آج کوشش کریں آفس سے اگر جلدی آسکیں تو پھر ہم بیٹھ کر بات کرلیں گے' کچھ لسٹ میں بنالوں گی پھر دیکھ لیں گے یہ سب کیسے ہوتا ہے۔" وہ بھی ذرا جوش بھرے لہجے میں خوشدلی سے بولی۔
"ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں اگرچہ وقار نے تو منع کیا ہے جہیز وغیرہ کے لیے' لیکن ظاہر ہے دنیاداری کے لیے سہی ہمیں خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کرنا مثال کو۔"
"بالکل انشاء اللہ سب کچھ ہو گا جو ہم کر سکے۔" عفت بھی اسی کے لہجے میں بولی۔ عدیل شاید خفیف سا مسکرایا تھا عفت کو ایسا ہی لگا۔
"پاپا ہم بھی اس گھر میں رہتے ہیں' آپ کبھی میرے متعلق بھی کوئی بات کرلیا کیجیے۔ تو مجھے بھی احساس ہو میں آپ کی بیٹی ہوں۔" ایک دم سے پری تلخی سے کہتے ہوئے بیگ اٹھا کر تیز تیز چلتی باہر نکل گئی۔
عدیل اور عفت لحہ بھر کو گم صم سے رہ گئے' پھر عدیل کچھ کہے بغیر خاموشی سے نکل گیا۔
"بالکل احمق ہے یہ پری کیا کروں میں اس کا۔" عفت بڑبڑاتے ہوئے برتن اٹھانے لگی۔
"ابھی دانی کی مصیبتیں کم ہوں تو یہ بچارے کسی اور طرف دھیان کریں۔ عدیل غلط نہیں شاید میں ہی ان دونوں کی تربیت ڈھنگ سے نہیں کر سکی۔" وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کہہ رہی ہو پری!" دردہ کو کچھ اور بھی حیرت نے آگھیرا۔ پری نے بات ہی ایسی کی تھی۔
"یار اگر تم میں حوصلہ نہیں ہے کہ تم میری بات اپنے بھائی تک پہنچاؤ تو یار مجھے اجازت دو میں تمہارے گھر آکر ان سے خود بات کرلوں۔ کر سکتی ہوں نا؟" وہ بے باک سے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور دردہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔
"کیا میں نے تمہارے سر پر کوئی بم پھوڑ دیا ہے؟ اس دن بھی تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا آج بھی گونگی ہو گئی ہو۔" وہ سنبھل کر بولی۔
"کسی کو پسند کرنا جرم تو نہیں اور یہ کسی کے اختیار میں بھی نہیں۔ حالانکہ میں یہ فرسٹ سائٹ لو پر یقین نہیں رکھتی لیکن تمہارے بھائی کو دیکھ کر۔" وہ ہونٹ کاٹ کر کچھ اور بولتے بولتے رک سی گئی۔
"ایک بات کہوں پری۔" دردہ کچھ فیصلہ کن انداز میں بولی۔
"ہاں یہی تو چاہ رہی ہوں یار ہم کچھ بولو کچھ اپنی اوپینئن دو میں کیا کروں۔" وہ سخت بے قراری سے بولی۔
"میں نے خود جب تمہیں پہلی بار آئی مین جب میں پہلی بار تم سے ملی' تمہیں دیکھا تو میرے دل نے بھی بے اختیار یہی خواہش کی تھی۔ کہ کسی طرح تم میری پیاری سی بھابی بن جاؤ۔" وہ آنکھوں میں چمک لیے رک رک کر بولی۔
تو پری بے یقین سی اسے دیکھنے لگی۔
"تمہیں یقین نہیں آیا میری بات کا۔" وہ اسے ہلا کر بولی۔ پری نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔
"کیوں میں ایسا کیوں نہیں سوچ سکتی؟" وہ خفگی سے بولی۔

"اس دن جب میں نے تم سے بات کی تھی یار تمہیں تو سانپ سونگھ گیا تھا میں سمجھی شاید تمہیں میری بات بری لگی۔" پری سرہلا کر بولی۔

"پھر بتاؤ ناں تم کرو گی اپنے بھائی سے بات۔" وہ خیال آنے پر پھر بے چین ہو کر بولی۔

"آں ابھی نہیں کچھ دن ٹھہر جاؤ۔" وردہ کچھ سوچ کر بولی' اب پری کو کیا بتاتی وہ پہلے بات کر کے گھر میں کتنا ذلیل ہوئی ہے واثق اور عاصمہ سے۔

"کتنے دن یار۔" پری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی وردہ کے گھر جا کر خود واثق سے بات کر لے۔

"پری! تمہاری وین کتنے بجے آئے گی آج۔" اسی وقت مثال اس کے پاس آکر بولی۔

"پتا نہیں۔" وہ فوراً" لاتعلق ہو کر بولی۔

"اوہ انکل کا فون آگیا تھا میری وین کے.... انہیں کسی ایمرجنسی میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے تو وہ ہمیں پک نہیں کر سکیں گے۔" وہ رک کر بولی۔

"ہمارا تو آج پریکٹیکل بھی ہے تین بج جائیں گے ہمیں تو۔" وہ اسی لاتعلقی سے بولی۔

"اوہ پھر تو مجھے دیر ہو جائے گی میری اب کوئی کلاس بھی نہیں۔ ٹھیک ہے میں خود ہی کسی اور کے ساتھ چلی جاتی ہوں' شاید فروا جا رہی ہے اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔" وہ کہہ کر چلی گئی۔ پری نے یونہی سر جھٹکا۔

"رئیلی یار یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر ہے۔" وردہ اسے دور جاتے دیکھ کر کچھ سرگوشی میں بولی۔

"ہوں۔" پری نے فقط ہنکارا بھرا۔

"ویسے یار تم سے بالکل الگ ہے یہ بڑی گریس ہے اس میں۔

تمہاری بہن نہیں لگتی یار بالکل بھی۔" وردہ کچھ سراہنے والے ڈھکے چھپے انداز میں بولی۔

"تو پھر دشمن لگتی ہو گی اگر بہن نہیں لگتی تو....." پری خود ہی ٹھٹھا مار کر ہنسی تو وردہ کچھ بول نہ سکی۔

"سنو تمہارا بھائی کہیں اور تو انوالو نہیں؟" کچھ خیال آنے پر پری رازداری سے پوچھنے لگی۔

"یہی تو مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں اس لیے چاہ رہی تھی کہ تم ابھی کچھ دن ویٹ کر لو' میں خود مناسب موقع دیکھ کر گھر میں بات چلاؤں گی کیا خیال ہے تمہارا۔"

"ہوں۔" پری کسی سوچ میں گم بولی۔

"تمہارے گھر میں آئی مین تمہاری مدر اور بھائی... انہیں یہ بات کیسی لگے گی۔" وہ کسی خدشے کے تحت بولی۔

"آئی ڈونٹ نو یار ابھی مجھے کچھ اندازہ نہیں بٹ میں بہت خوش ہوں! بہت زیادہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا جس لڑکی کو میں نے پہلی نظر دیکھتے ہی اپنی بھابھی کے روپ میں دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ وہ میری بھابھی ضرور بنے گی۔ بنو گی ناں۔" جھک کر اس کی ٹھوڑی کو چھوتی وردہ نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیوں لائبریری کیا کرنے جانا ہے' تم جانتی ہو ناں اب تمہارا کالج جانا بھی ختم ہے۔" عفت کڑے لہجے میں اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ماما کچھ ضروری بکس ایشو کروا رکھی تھیں میں نے ایک تو وہ واپس کرنے ہیں ہفتے سے اوپر ہو چکا ہے تو وہ دے آتی ہوں۔" وہ کچھ بے چارا سا منہ بنا کر بولی۔

"پری کو دے دو وہ لوٹا آئے گی۔" عفت کچھ سوچ کر بولی۔

"ماما مجھے ایک دو بکس لینی بھی ہیں پلیز۔" وہ منت سے بولی۔ عفت تیز ہاتھوں سے سبزی بناتی رک کر اس کا

جائزہ لینے لگی۔

"یہ پالک گوشت تمہارے باپ کی کمزوری ہے اور گھر میں ان کے علاوہ صرف تم کھاتی ہو' باقیوں کے لیے کچھ اور بنے گا وانی کو قورمہ چاہیے تو پری کو کچھ اور' تمہیں کیا لگتا ہے میں کوئی مشین ہوں جو یہ سب کچھ ایک ہی وقت میں بناڈالوں گی اور تم مزے سے سیر سپاٹے کرتی پھرو۔" وہ چھری پٹخ کر بولی۔

"ماما میں صرف آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی پرامس پھر میں آکر سب کرلوں گی۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"تمہارے ساس سسر نے کل آنا ہے شادی کی تاریخ لینے' کیا یہ بہتر نہیں کہ تم یہ کتابیں وتابیں چھوڑ کر کچھ گھر داری سیکھو' تمہاری ماں کا طعنہ دوں گی پھر تمہیں بھی خوب برا لگے گا اور تمہارے باپ کو بھی۔" وہ طعنہ مارنے سے رہ نہ سکی۔ مثال نے سر جھکالیا۔

"اور آخر میں برا کون بنے گا میں کیونکہ تم اپنی ماں کے پاس نہیں میرے پاس رہ رہی ہو' وہ تو عیاشی کی زندگی گزارتی ہر ذمہ داری سے آزاد مزے میں' طعنے ترلے ملیں گے کہ سوتیلی ماں نے لڑکی کو کچھ سکھایا نہیں۔"

عجیب ہی رنج اور غصہ تھا جو عفت کچھ اور ہی طرح سے نکال رہی تھی۔

اسے لگتا تھا بشریٰ نے دونوں بار ایک بہت شاندار زندگی گزاری ہے اسے کبھی کوئی رنج یا دکھ نہیں ملا' دونوں شوہروں نے اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا ہے اور ایک بدقسمت عفت کہ جس کی تقدیر میں صرف مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔ وہ اب زور زور سے پالک کے پتے کترتی جارہی تھی۔

"جاؤ اب میرے سر پر کیا کھڑی ہو' جو دل کرتا ہے کرو بھلے آدھے گھنٹے میں واپس آنا یا رات گئے' میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی۔" وہ کٹھور انداز میں بولی۔

مثال کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔

"ماما! پھپھو کی کال ہے' وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔" اندر سے پری کی آواز آئی تو عفت چھری وہیں پٹخ کر اٹھ کر اندر چلی گئی مثال کچھ دیر متذبذب سی کھڑی رہی۔

اگر میں نہیں بھی جاتی یہ سب کام کر دیتی ہوں تو یوں کون سا کوئی گولڈ میڈل مل جائے گا مجھے اور اس گھر کی گھٹی فضا سے نکل کر مجھے تھوڑا سانس باہر نکل کرلیتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا اور آہستگی سے باہر نکل گئی۔

✲ ✲ ✲

"ٹھیک ہے امی۔ میں لیتا آؤں گا۔" واثق نے دواؤں کا نسخہ ہاتھ میں لیتے ہوئے سرہلایا۔

"اور کچھ تو نہیں لے کر آنا۔" وہ جاتے ہوئے رک کر بولا۔

"نہیں ہے سب کچھ اور سنو بہت دیر نہیں لگانا مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے واثق۔" عاصمہ کچھ سوچ کر بولی تو واثق کے قدم وہیں رک گئے۔

"آپ ابھی بات کریں کیونکہ میری واپسی تھوڑا لیٹ ہوگی مجھے خوامخواہ پریشانی رہے گی کہ آپ کی بات سنے بغیر کیوں آگیا۔" وہ فوراً ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا عاصمہ کو اس پر بہت پیار آیا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے ہم دیر سے آؤ گے تو اس وقت بات کریں گے۔ ابھی تم جاؤ۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔

"نہیں امی! ایسے نہیں' پلیز آپ کریں بات۔" وہ مصر لہجے میں بولا۔ عاصمہ کو پتا تھا اب یہ بات سنے بغیر نہیں جائے گا۔

"تمہیں سعدیہ یاد ہیں نا جو ہمارے پچھلے گھر میں ہمارے ساتھ رہتی تھی' جس کے آئیڈیے پر میں نے اکیڈمی اسٹارٹ کی تھی۔" وہ رک کر بولی۔

''جی امی یاد ہے اور یہ کوئی اتنی پرانی بات نہیں۔'' وہ سرہلا کر بولا۔
''سعدیہ بیاہ کر امریکہ چلی گئی تھی' وہیں اس کی نند اور جیٹھ بھی رہتے تھے۔ آج کل وہ پاکستان آئی ہوئی ہے۔''
''او یہ تو اچھی بات ہے ملنے آئی تھیں' آپ سے۔'' واثق خوش ہو کر بولا۔
''ہاں آئی تھی۔ بلکہ سمجھو ہماری اتفاقیہ ملاقات صبح مارکیٹ میں ہوئی' جہاں وہ اپنے جیٹھ کی بیٹی سارہ کے ساتھ تھی جو امریکہ سے اس کے ساتھ آئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سعدیہ خود آئی مجھ سے ملنے۔'' عاصمہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولی۔
''کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔ کچھ خاص بات سے کہا۔'' واثق ماں کے لہجے سے کچھ نہ کچھ اخذ کر چکا تھا' رک کر پوچھنے لگا۔
''میرے لیے تو سمجھو بہت خاص ہے۔۔۔'' وہ مسکرائی۔
''کیا مطلب۔۔۔'' اب واثق چونکا' کچھ خاص بات تو تھی ضرور۔ عاصمہ لمحہ بھر خاموش رہی۔
''اپنے رب کا میں کس طرح شکر ادا کروں پہلے بیٹیوں کے معاملے میں اور اب بیٹے کے معاملے میں مجھے خود کہیں بھی جا کر لڑکے لڑکیاں نہیں دیکھنی پڑیں' میرے اللہ نے خود ہی مہربانی کر دی' میرے معاملے آسان ہوتے چلے گئے۔''
''امی اب آپ مجھے کچھ اور بے چین کر رہی ہیں' پلیز مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بے چینی سے بولا تو عاصمہ ہنس پڑی۔
''اور میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا بے چین ہو جائے۔'' وہ اسے جیسے چھیڑ کر بولی۔
''کیا کہنا چاہتی ہیں۔'' وہ بے چینی چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔
''سعدیہ نے اپنے جیٹھ کی بیٹی سارہ کا رشتہ تمہارے لیے پیش کیا۔ وہ ایک دو دن میں تم سے بھی آکر ملے گی۔ وہ سارہ کا یہاں رشتہ ہی کرنے آئی ہے اور کہہ رہی تھی۔ وہ کہیں اور نہیں واثق ہی کا کہہ کر اپنے سسرال والوں کو آئی ہے اور اسے پورا یقین ہے کہ اسے جواب ہاں میں ملے گا۔ اب بتاؤ کیا جواب دوں اسے۔'' عاصمہ مزے سے بولی۔
''امی فار گاڈ سیک۔'' وہ سر پکڑ کر بولا۔ عاصمہ ہنس پڑی۔
''آپ کو کیا مزہ آرہا ہے۔'' وہ چڑ کر بولا۔
''ہاں تو اور کیا کہوں اور واثق میں سوچتی ہوں' بہت ہی پیاری' بہت خوب صورت لڑکی ہے اور امریکہ میں پلنے بڑھنے کے باوجود حلیے سے بھی اتنی سادہ اور اسلامی انداز ہیں اس کے یقین کرو مجھے تو بچی بہت اپنے دل کے قریب لگی۔''
''امی۔۔۔'' وہ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔
''اگر تمہارے پوچھنے کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں سعدیہ کو ہاں کہہ چکی ہوتی۔'' وہ اسے دیکھ کر بولی۔
''آپ ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔'' وہ زور سے بولا۔
''واثق! اب تک میرے بیٹے' اب تمہاری عمر ہے شادی کی اور یہ میرے دل کی بھی خواہش ہے کہ اب تمہاری زندگی میں بہت سی خوشیاں آئیں اور اس گھر کی اصل مالکن آجائے۔''
''امی پلیز۔۔۔'' وہ کوفت سے بولا۔
''واثق! تم ہر کسی کے لیے منع کر چکے ہو۔ اس کا اور تمہارا ایج ڈیفرنس ہے۔ میں مانتی ہوں' لیکن سارہ ہر لحاظ سے تمہارے لیے سوٹ ایبل ہے تم ایک دو دن میں مل لو اس سے اور کوئی فیصلہ کر لو۔ کیونکہ اب میں سیریس

ہوں، تمہاری شادی کے سلسلے میں۔" عاصمہ سنجیدگی سے بولی تو واثق ایک دم سے چپ کر گیا۔

"امی ابھی نہیں آپ جانتی ہیں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"بیٹا ابھی تو وقت ہے، اگر تم انتظار کرو گے کچھ وقت گزرنے کا، جدائی کے زخم بھرنے کا، تو میرے بیٹے یہ زخم کچھ اور گہرا ہو جائے گا اور میں.... جس نے بس ایک عمر سے خوشیاں نہیں دیکھی ہیں۔ اب اور انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری شادی کا فیصلہ اب کرنا ہے اور تمہیں میری یہ خوشی پوری کرنی ہو گی۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

واثق بے بس سا ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

"امی.... میرے لیے ابھی یہ ممکن نہیں آپ تو مجھے سمجھتی ہیں نا، پلیز سمجھنے کو شش کریں، میں اتنی جلدی خود کو تیار نہیں کر سکتا کسی اور کے لیے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تم مثال کو بھولے نہیں۔" وہ دکھ سے بولی۔

"امی.... اتنی جلدی۔ ابھی تو.... پلیز ابھی آپ اس معاملے میں جلدی نہیں کریں۔ مجھے دو، تین سال تک نہیں سوچنا کچھ بھی، میں پہلے بھی آپ سے یہ کہہ چکا ہوں، بار بار مت کریں یہ ذکر۔" کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ عاصمہ پریشان سی کھڑی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا دانی نے تمہیں کال کی تھی؟" عفت کے لیے فوزیہ کے منہ سے سننے والی یہ شاکنگ خبر بہت پریشان کن تھی۔

"میں پہلے تو اس بات پر خوش ہوئی، سچ میں عفت بھابھی.... لیکن پھر اس کی بات سن کر میں کچھ پریشان ہو گئی۔" فوزیہ سنجیدگی سے بولی۔

عفت کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، یقیناً کوئی نامعقول بات کی ہو گی۔ اس دانی کے بچے نے۔

"بھابھی.... وہ کہہ رہا تھا کہ پھپھو میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، آپ پلیز مجھے کینیڈا بلا لیں۔" اور عفت کو لگا دو، تین دن پہلے دانی نے جو دھمکی دی تھی، وہ صرف دھمکی نہیں تھی وہ اس پر عمل کرنے کی پلاننگ بھی شروع کر چکا ہے۔

"کیا.... اچھا۔" وہ سنبھل کر بولی۔

"مجھے حیرت سی ہوئی بھابھی.... یوں تو اس میں کچھ حرج نہیں، میرا بھتیجا ہے، میرا خون ہے اور مجھے سب سے پیارا ہے دنیا میں، لیکن ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے نا۔" وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولی۔

"تمہارے بھائی نے ہی ایک دن مذاق میں کہہ دیا تھا کہ تم اسٹڈیز میں سیریس نہیں ہو رہے تو میں تمہیں فوزیہ کے پاس بھجوا دوں گا۔ بس اس بات کو ذہن میں رکھ کر اس نے تم سے کہہ دیا ہو گا۔" عفت کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولی تو فوزیہ بھی یوں ہی ہنس پڑی۔

☼ ☼ ☼

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے واثق۔" دونوں اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے تھے۔ لائبریری کی سیڑھیوں میں۔

"بلکہ یہ بار بار کا ملنا مجھے کچھ اور ڈسٹرب کر رہا ہے۔" وہ آہستگی سے اپنے ناخن کھرچ کر بولی۔ وہ اس کو دیکھ کر رہ گیا۔

اس سلونی سی گہری شام میں اس کا حسن کیسا پر سوز لگ رہا تھا۔ وہ اس کے بہت پاس بیٹھی تھی اور جیسے میلوں کے فاصلے پر بھی۔ دونوں کا ملن ندی کے دو کناروں جیسا تھا' وہ شدت سے چاہنے کے باوجود ایک دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

"مثال۔۔۔ میں بے بس سا ہو جاتا ہوں تمہارے بارے میں جب سوچتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس طرف آؤں' میرا ادھر آج کچھ کام بھی نہیں تھا' لیکن پھر پتا ہی نہیں چلا کب میرے قدم اٹھے اور میں یہاں آگیا' تمہارے سامنے۔" وہ رک رک کر گہری آواز میں بولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"تم نے ابھی بھی وہ رنگ نہیں پہنی۔" وہ اس کی خالی انگلیوں کو دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

"پہن لوں گی۔۔۔ اب تو پہننی ہی ہے۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولی۔ واثق اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اس طرح مجھے دل کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرو گی۔" وہ اسے جتا کر بولا۔

"کل وہ لوگ شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آ رہے ہیں۔ آج شاید میں اس طرف آخری بار آئی ہوں۔ کل شاید کالج جاتی ہوں یا نہیں۔ بابا نے منع کر دیا ہے۔" وہ اسے دیکھے بغیر بولی۔

اور وہ جیسے کسی گہرے غم کی تہ میں اتر گیا۔ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ ان کے سر پر کھڑے اونچے اونچے درختوں پر بیٹھے پرندے زور زور سے شور مچا رہے تھے۔ شام گہری ہو رہی تھی اور سب پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ آئے تھے۔

وہ دونوں اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ یہ وقت ٹھہر جائے۔ کبھی آگے نہیں بڑھے۔

وہ دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ بالکل خاموش کچھ بھی کہے بغیر۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" پرندوں کا شور بڑھا تو وہ ایک دم سے کچھ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"کچھ دیر اور تو رکو۔" وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

"نہیں رک سکتی۔" وہ نظریں چرا کر نم لہجے میں بولی۔

"پھر کب ملیں گے۔" وہ اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دراز قد کا سایہ مثال کے وجود کو ڈھانپنے لگا۔

"شاید کبھی نہیں۔" وہ لبوں میں بڑبڑائی۔

"مثال۔۔۔" وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"چلتے ہیں۔" وہ ایک دم سے کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے بوجھل قدموں کے ساتھ چل پڑا۔ دونوں ذرا فاصلے پر چلتے ہوئے اس لائبریری کی عمارت کے باہر نکل آئے۔ جہاں شاید آج ان دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا اور سر جھکا کر چل پڑے اور سامنے سے آتا عدیل دونوں کو یوں ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر شاکڈ سا رہ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کنیز نور علی

# ناکی جنت

"میں اپنا سوٹ تو دیکھوں ذرا' دوبارہ گھر آکر شاپنگ دیکھنے کا مزا ہی اور ہے۔" ردا نے شاپنگ بیگز الماری سے نکالتے ہوئے اعلان کیا۔ اب وہ اپنا سوٹ پھیلا کر دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ ثوبیہ اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے الماری کھولنے لگی۔

"پاگل اس دنیا سے ختم نہیں ہوئے۔ ہمارے گھر میں ہے ایک ابھی۔ سوٹ خرید کر خوش ہونے والی قوم۔" الماری سے اپنی مطلوبہ شے نکال کر پلٹتے ہوئے اس نے ردا کو دیکھ کر افسوس میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں ہمارے گھر ایک پاگل ہے' جو سارا پیسہ کتابوں پر خرچ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کتابیں خرید کر رعب جھاڑنے والی قوم۔" ردا برابر کا جواب دیے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔

زاہدہ خانم نے بیٹیوں کی نوک جھونک سنتے ہوئے تسبیح بیڈ پر اپنے پاس رکھتے ہوئے ثوبیہ کو مخاطب کیا تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہے ردا میں آئندہ تمہیں بازار نہیں لے کر جاؤں گی۔ جو پیسہ ہے تم کتابوں پر اڑا دیتی ہو کتنی بار کہا ہے کوئی کام کی چیز لو۔ لیکن سنتی تو ہو ہی نہیں تم۔"

وہ سنجیدگی سے ثوبیہ کو کہہ رہی تھیں۔ ردا نے ان کی تائید میں پر زور انداز میں سر ہلایا تھا۔ ثوبیہ پیار بھرا لمبا سا امی کہہ کر چپ ہو گئی تھی۔ وہ آج نئی لائی جانے والی کتاب دیکھ رہی تھی۔ جبکہ زاہدہ خانم کو اس کی یہ عیاشی اچھی نہیں لگتی تھی۔

"کیا امی۔ اب باپ کے کندھے سے جا لگے گی۔ انہوں نے ہی خراب کیا ہوا ہے۔"

زاہدہ خانم کو مزید ابال آیا تھا۔ ثوبیہ ان کی بات پر مسکرا دی۔ اگر اس حوالے سے امی رکاوٹ تھیں تو ابو آسانی تھے۔ وہ بہت خوش ہو کر اسے کتابیں دلا دیا کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے؟"

مغرب کی نماز ادا کر کے ثوبیہ کچن میں آئی تھی۔ ردا چائے بنا رہی تھی۔ ثوبیہ نے سامنے کاؤنٹر پر موجود مٹھائی کا ڈبا دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ابو حسب معمول اپنے اسٹور پر تھے' رات دس بجے ہی ان کی آمد ہوتی تھی۔ سلیمان یقیناً اپنی ٹیوشن گیا ہوا تھا۔ نماز ادا کر کے اس نے امی کے کمرے میں جھانکا تھا۔ وہ اندھیرا کیے بستر پر پڑی تھیں۔

"ہائے اللہ طبیعت نہ خراب ہو کہیں امی کی۔ لیکن شاید سو رہی ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے کھٹکا کیے بنا باہر آ گئی۔

"بتاؤ نا۔" اس نے دوبارہ پوچھا۔ ردا اس کی بات پر پلٹی اور مٹھائی کے ڈبے کو تاڑ کر رنجیدہ ہو گئی۔ ثوبیہ کو لگا اس کی آنکھیں نم ہوئی ہیں۔

"خالہ نے بھجوائی ہے۔ صغیر کی منگنی کر دی ہے انہوں نے۔"

اداس غمگین لہجے میں بتا کر وہ پھر سے چائے کے ساتھ الجھنے لگی تھی۔

اس نے ایک نظر مٹھائی کے ڈبے پر ڈالی۔ اسے

بھی ہلکا سا افسوس ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ مٹھائی کے اس ننھے سے ڈبے نے امی کو کمرے میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ اس وقت وہ گھر میں آگے پیچھے سو کام نپٹا رہی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھلا صرف ایک ڈبا تھوڑی ہے۔ یہ ایک توقع تھی جو ٹوٹ گئی۔ (امی کی توقع) اور ایک خوش فہمی تھی جو ختم ہو گئی۔ (ردا کی خوش فہمی)

ردا پر نظر ڈالتے ہوئے وہ ایسی ہی باتیں سوچے جا رہی تھی۔ دکھ تو اسے بھی ہوا تھا کہ ایک اچھا رشتہ تھا۔ اگر ہو جاتا تو...... لیکن اس سے زیادہ وہ نہیں سوچتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جس کی قسمت میں جو ہوتا ہے مل جاتا ہے۔ سو وہ معاملہ اس کے نزدیک اس قدر اہم نہ تھا لیکن زاہدہ خانم اور ردا کے لیے شاید یہ سب سے اہم معاملہ تھا۔

☼ ☼ ☼

ردا کے دکھ کا یہ عالم تھا کہ اس کا سوگ پچھلے تین دن سے جاری تھا۔ اپنی روٹین خراب کر لی تھی۔ مارے باندھے کام کرتی۔ اداس سی شکل بنائے بستر پر پڑی رہتی۔ زاہدہ خانم بھی متفکر سی تسبیح کے دانے گراتی لیٹی رہتیں۔ خاور صاحب نے حسب عادت اس خبر کو اتنا اہم نہیں سمجھا تھا۔ توبیہ اور سلیمان نے بھرپور کوشش کر کے رونق جگانے کی کوشش کی تھی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا لیکن بہرحال گھر کے دو لوگ رنجیدہ تھے۔ ایسے میں توبیہ سوچتی 'مانا کہ صغیر ردا کا ہم عمر تھا اور امی کا ارمان تھا کہ ان کے ہاں رشتہ ہو جائے۔ لیکن اگر نہیں ہوا تو ایسا سوگ کون مناتا ہے۔

حد ہو گئی یعنی کہ دنیا چاند سے آگے نکل چکی ہے۔ یہاں خالہ کے گھر رشتہ نہ ہونے پر دکھ ہی نہیں ختم ہو رہا۔ وہ چڑ جاتی۔

لاکھ ہنسی مذاق میں ردا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بی بی ایسی پکی مشرقی لڑکی تھی کہ غمگین رہے بغیر اس کا گزارہ ہی نہ تھا جیسے...... اب بھی توبیہ کمرے میں آئی تو ردا غم کی تصویر بنے آرام کر رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"دیکھو ردا! ہمیں جذباتی ہو کر ہر چیز کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ اپنی خوش فہمی میں ہم اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ تم کیوں اس طرح غم زدہ ہو کر بیٹھی ہو۔ آج تیسرا دن ہے۔ تم نے خود پر سوگ طاری کیا ہوا ہے۔"

"ہاں تو...... تباہ ہو گئی ہوں۔ میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔"

اتنے سارے آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بھل بھل کر کے بہنے لگا تھا۔ اپنے دل کے ٹوٹنے کا غم اندر تک توڑ گیا تھا اسے۔

"ایک منٹ ایک منٹ...... کیسے تباہ ہو گئی ہو تم۔ ذرا پلیز اس کی وضاحت کرو گی۔" توبیہ نے سختی سے پوچھا۔ ردا نے شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا تنہا دل مزید بکھر گیا تھا۔ ایک تو محبت کا غم اوپر سے یہ سوال۔ کیسی بہن ہے یہ غم گسار بھی نہیں بن سکتی۔ وہ اور سسکنے لگی۔ توبیہ سٹپٹا گئی۔

"دیکھو ردا! یہ رونا دھونا چھوڑو صاف بتاؤ تم کیسے تباہ ہو گئی ہو۔ کس طرح دل ٹوٹا ہے تمہارا۔ بتاؤ کیا ہوا

ہے۔ "ثوبیہ اپنی جرح شروع کر چکی تھی۔
"سب کچھ پتا تو ہے تمہیں۔" آنکھوں کو رگڑتے ہوئے ردا نے پھر سسکی بھری تھی۔
"مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ تم۔ بتاؤ۔" ثوبیہ نے سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔
"صغیر کی منگنی ہو گئی ہے۔ خالہ نے اس کا رشتہ اپنی سسرال میں طے کر دیا ہے۔ میں نے صغیر کے حوالے سے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور اب..."
اس کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔ مزید شدت کے ساتھ... ثوبیہ کے تاثرات جامد تھے۔
"اچھا تو تمہاری یہ محبت یک طرفہ تھی کہ دو طرفہ
ایسا کڑا سوال سن کر ردا کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ اسے وہ سب لمحات یاد آئے 'جب جب اسے صغیر کی آنکھوں میں اپنا عکس نظر آیا تھا۔ وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔
"اس کا التفات میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔ نظریں 'انداز' لہجہ سب مل کر مجھے یہی احساس دلاتے تھے کہ محبت کے اس سفر میں میں اکیلی نہیں ہوں۔"
اس نے اداسی سے بات مکمل کی تھی۔
ثوبیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "یہ سب تمہاری اپنی سوچ ہے۔ تم اس کا کوئی ثبوت دے سکتی ہو کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتا تھا۔ یا محبت کرتا تھا یا شادی کرنا چاہتا تھا جیسے کہ تم دعوا کر رہی ہو۔"
ثوبیہ کے اس سوال پر ردا اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔
"ثبوت کیسا۔ کسی کی نظروں کا' لہجے کا' لہجے میں چھپی محبت کا کیا ثبوت لاؤں میں۔ یہ تو محبت کرنے والا دل ہی سمجھ سکتا ہے۔" وہ بے ساختہ بولی تھی۔
"مجھے محبت کرنے والے دل 'اس کی سمجھ یا سوچ سے کوئی مطلب نہیں۔ ثبوت مطلب کوئی تحریری' زبانی ثبوت ہے تمہارے پاس۔ اس کی محبت کے اظہار کا یا... بس اس کو دیکھ دیکھ کر خود ہی اندازے لگا لیے تھے کہ یہ محبت ہے۔" ثوبیہ نے سخت لہجے میں کہا تھا۔
"وہ محبت ہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نرمی... وہ مسکان۔" ردا نے کہیں کھو کر کہا تھا۔ ثوبیہ نے سختی سے اسے ٹوکا تھا۔
"ثبوت! کوئی تحریری زبانی ثبوت... کوئی مکالمہ کوئی خط کوئی ٹیکسٹ میسج۔ اظہار کی کوئی بھی صورت... واضح صورت... حقیقی زندگی میں نظر آنے والا کوئی عمل جس سے عیاں ہو کہ اس نے ایسا کہا تھا' یہ کیا تھا؛
ثوبیہ کے اتنی بلند آواز میں کی گئی جرح پر ردا پتھرا گئی تھی۔
"نہیں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔"
"تو پھر یہ تمہیں لگتا تھا۔ ایسا تھا نہیں' تم نے اپنے جذبات کو حقیقت سمجھ لیا۔ اپنا وقت ضائع کیا' جذبات ضائع کیے اور اب پریشان ہو اگر اس نے اظہار کیا ہوتا۔ یہ سب حقیقت ہوتی۔ تو میں کہتی تم نے اس شخص سے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن تم نے اپنے نفس سے دھوکا کھایا ہے۔ تم فریب میں مبتلا رہیں۔ اپنی زندگی کو سوچو سمجھو اور عمل کرو۔ ہمارا ہر خیال اور خواہش درست نہیں ہوتی۔ زندگی کو حقیقت کی بنیاد پر گزارنا چاہیے۔ تمہیں اس حوالے سے میچور ہو جانا چاہیے۔"
بات کے اختتام پر ثوبیہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس لمس میں ڈھارس تھی۔ "ہمت کرو" کی پکار تھی۔ ردا ابھی حیرانی کی منازل طے کر رہی تھی۔ سو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ لیکن ثوبیہ جانتی تھی کہ اگر بات اس تک پہنچ گئی ہے تو وہ سمجھ بھی جائے گی۔ بس تھوڑا وقت لگے گا۔ لیکن ابھی زاہدہ خانم تک یہی بات پہنچانا باقی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ زاہدہ خانم بیڈ پر لیٹی تسبیح ہاتھ میں پکڑے جانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔ چہرے پر تفکرات کا جال بچھا تھا۔ وہ ان کے نزدیک بیٹھ گئی تھی۔

"امی! میری پیاری امی!" کہتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اداسی سے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"امی! آپ ایسے افسردہ ہیں جیسے خدانخواستہ یہ ہماری ردا کے لیے آخری رشتہ تھا۔ اس کے بعد کوئی اچھا پرپوزل نہیں آئے گا۔ ایسا نہیں ہوتا امی! اللہ پر پکا یقین رکھیں۔ جو ردا کا نصیب ہوگا' اسے مل کر رہے گا۔"

ان کے بازو دباتے ہوئے وہ خود بخود ہی بات شروع کر چکی تھی۔ زاہدہ خانم نے اداسی سے اسے دیکھا تھا۔ تسلی دینے والا اور کوئی نہیں تھا۔ اپنی بیٹی ہی پاس آئی تھی۔ اکیلی بڑی بہن ماں جیسی بہن نے آج راہ جدا کر لی۔ ان کی سوچ پھر ادھر ہی مڑ گئی تھی۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ ثوبیہ پریشان ہو گئی۔

"اوہو امی پلیز حوصلہ کریں۔ ایسے روئیں تو نہیں۔" اس نے ان کے آنسو پونچھے اور پھر بات شروع کر دی۔

"آپ کو ہر پہلو سے غور کرنا چاہیے۔ خالہ کی بھی کوئی مجبوری ہو سکتی ہے۔ اپنے سسرال والوں کی مرضی کے بغیر تو وہ اکیلے رشتہ نہیں کر سکتیں تو جیسے انہیں صحیح لگا۔ جہاں مناسب لگا۔ انہوں نے رشتہ طے کر لیا۔ ہم دوسروں سے تعلقات باندھ لیتے ہیں اور پھر افسردہ ہوتے ہیں۔ بدگمان ہو جاتے ہیں۔ ناراض ہو جاتے ہیں' یہ بری بات ہوتی ہے' آپ نے خالہ کو مبارک باد کا فون بھی نہیں کیا۔ کیا سوچیں گی وہ کہ ان کی خوشی میں آپ غم زدہ ہیں۔"

زاہدہ خانم ثوبیہ کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ ایسی بڑی بڑی باتیں اور گہری گہری باتیں کہاں سے آ گئی تھیں اسے۔ ثوبیہ کی باتیں ان کے دل پہ لگی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ لیکن طبیعت کی اداسی انہیں چھوڑ نہیں رہی تھی۔

"آپا نے کیوں سوچنا ہے میرے بارے میں۔ وہ اپنی خوشیوں میں خوش ہوں گی۔" کہتے کہتے ان کی آنکھیں پھر نم ہو گئی تھیں۔

"آپ پھر ایسے سوچ رہی ہیں۔ اچھا آپ بتائیں خالہ نے آپ سے کوئی کمٹمنٹ کی تھی اس رشتے کے حوالے سے۔ کوئی قول زبان وعدہ امید کچھ بھی؟؟" ثوبیہ نے نرمی سے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ایسا ہوگا۔ ہمارا آپس کا پیار ہی اتنا تھا تو اچھا تھا نا کہ ہماری اولادیں آپس میں مل جائیں۔"

ماضی کے لمحات کو چھوتے ہوئے زاہدہ خانم نے بیٹی کو اپنے اندر کی بات بتائی تھی۔

"تو یہ آپ کی خواہش تھی' لیکن اگر یہ پوری نہیں ہو سکی تو آپ اپنی توقع کی خاطر خالہ کی خوشی کو زائل تو نہ کریں۔ ردا کا نصیب اسے مل جائے گا۔ نیا رشتہ نہیں بن سکا تو کوئی بات نہیں بہن کا رشتہ تو اچھی طرح نبھائیں۔"

ان کے کندھے دباتے ہوئے ثوبیہ نرمی سے ان کی منفی سوچوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زاہدہ بیگم سوچ میں گم ہو گئیں۔

"کہہ تو تم بھی ٹھیک رہی ہو لیکن یہ دل ہے نا' توقعات باندھ لیتا ہے۔ تھوڑا اسے سمجھا کے رکھنا چاہیے۔" وہ اداسی سے مسکرا کر بولیں۔

"یہ کی نا میری سمجھ دار امی والی بات۔"

وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے ان کی گردن میں بانہیں ڈال رہی تھی۔

"سمجھ دار امی کی بیٹی بھی بہت سمجھ دار ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی بڑی دلیلیں کہاں سے آ گئیں میری بیٹی کو جو مجھے سمجھانے لگ گئی ہے اب۔ وہ بھی اتنا اچھا۔" وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی تھیں۔

"ان ہی کتابوں سے دلیلیں ملی ہیں۔ کتابیں ہی کام آتی ہیں۔ وہ سوٹ نہیں' جو آپ کی لاڈلی خرید کر الماریاں بھر دیتی ہے۔ وہ سوٹ وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ آج آپ کو ماننا پڑے گا کہ کتابیں ہی دراصل کام کی چیز ہوتی ہیں۔" وہ آنکھوں میں چمک لیے مسکراتے ہوئے انہیں یاد دلا رہی تھی۔

زاہدہ خانم دل سے مسکرا دیں اور اسے گلے لگا لیا۔

بات یقیناً سو فیصد سچ تھی۔

☆

ایمل رضا

# سائبان دھوپ کا

ویسے تو اس کی زندگی کے اوپر تلے کے تقریباً" سارے ہی سال غموں سے بھرے اور شکایتوں سے اٹے پڑے تھے۔ ایسے کہ خوش گوار دن تپتے صحرا میں جھاڑیوں کی مانند خال خال ہی نظر آتے۔ اور ذہن میں تو آتے ہی نہ... لیکن آج کا دن "اعلا منحوس" تھا۔ اس بات کا زینب کو یقین ہو گیا۔

پہلے تو صبح جب وہ کبھی ہلکی کبھی تیز ہوتی پھوار میں تربتر ہوتی بس اسٹاپ تک پہنچی تو اسٹاف کی بس اس کا انتظار کیے بنا ہی جا چکی تھی۔ بارش کی وجہ سے دوسری گاڑیاں بھی قدرے کم تھیں۔ بڑی خواری سے وہ اپنے آفس تک پہنچ پائی۔

دوپہر میں مسٹر اکرام سے اس کی فون پر لمبی بحث ہوئی... کچھ اس کی بھی پریشانی شام تک لگی رہی۔ پھر گھر واپسی کا سفر شروع ہوا ہی تھا کہ بارش نے طوفانی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک بھی معاملہ برداشت اور ہمت کے اندر تھا... لیکن دن کا سب سے بڑا جھٹکا اسے گھر کے برآمدے میں ملا... جہاں نیم پاگل پھوپھی اس کے مکمل ہو چکے اسکرپٹ کی چھوٹی' بڑی' تکونی نجانے کتنی ہی کشتیاں بنا کر کھیل رہی تھیں۔ (حسب عادت سوراخ زدہ کشتیاں) صد شکر کے پھوپھی نے وہ کشتیاں پانی میں نہیں تیرا دی تھیں۔ ورنہ زینب تو وہیں اپنی زندگی کی آخری سانس لے ڈالتی۔ رات کو آنسوؤں کے ساتھ وہ زندگی کی ایک ایک تلخی کو بھلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ساری کشتیوں کو بیدائشی صبر اور جبر سے کھولتی رہی اور ہاتھوں سے پریس کرتی رہی۔ صفحے دوبارہ ترتیب دے کر الماری میں رکھنے لگی تو اس کے ہاتھ علی کی طرف سے بھیجی جانے والی طلاق کے کاغذات سے ٹکرا گئے اور اس پُرتھیس از بر ٹکراؤ نے زینب کو باور کروا دیا کہ آج کا دن واقعی منحوس ہے۔

☼ ☼ ☼

دوپہر میں پروڈکشن ہاؤس کے کانٹینٹ ہیڈ مسٹر اکرام سے ہوئی لمبی بحث بھی اس کی زندگی کی طرح بے نتیجہ ہی ختم ہو گئی تھی۔ زینب کو آج کل پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے پیسوں کی ضرورت اسے کب نہیں رہی تھی۔ پیسہ اس کی زندگی میں سانس کی طرح بڑا ضروری اور ہنسی کی طرح نجانے کہاں گم رہا تھا۔ ایک ہی تو وہ کمانے والی تھی اور تین جانیں کھانے والے اس لیے اسے اپنی لکھی ٹیلی فلم کے بھیجے گئے ون لائنر (خلاصے) سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ ٹیلی فلم اس نے بہت محنت سے لکھی تھی۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے ناکہ گرم ریت میں مکئی زیادہ بھن جائے تو پھر کھانے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کی ٹیلی فلم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مسٹر اکرام نے بے شک اس کی ساری امیدوں پر پانی نہیں پھیرا تھا' لیکن بھروسے کے چونے کی لیپا پوتی بھی نہ کی تھی۔

"کہانی بہت اچھی ہے آپ کی... لیکن اختتام پر تھوڑی تبدیلی کرنی ہوگی... اتنی ڈارک (دکھی) کہانی...

اکیلے گھر میں لڑکی کی خودکشی... اور ہفتہ مردہ حالت میں پڑے رہنا... نہیں، نہیں مس زینب! آپ کو اختتام بدلنا ہوگا... پلیز کچھ اور سوچیے... مانا کہ آج کل عورت جیسں ڈرامے 'فلمز بن رہی ہیں... مگر اتنا بھی تو جذباتی نہ ہوں نا آپ' سمجھنے کی کوشش کریں۔ ریٹنگ کا مسئلہ پڑ جاتا ہے۔ پھر چینل والے بھی اعتراض کرتے ہیں۔ پروڈکشن ہاؤس کی ساکھ بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھئی... انسان دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر جب ٹی وی لگاتا ہے تو ہلکا پھلکا دیکھنا پسند کرتا ہے... کہ نہیں؟"

زینب نے بڑی مایوسی اور بے دلی سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا کہ وہ جلد ہی اختتام تبدیل کر کے انہیں دوبارہ ون لائنر (خلاصہ) بھیجے گی۔ کچھ اس بات کا بھی دکھ اور غصہ تھا شاید... اور کچھ ویسے بھی وہ اپنی سالوں کی جواب دے چکی ہمت کو بڑے جتنوں سے دلا سے

اور حوصلے کے چھینٹے مار مار کر جگائے ہوئے تھی کہ اسی لیے گھر داخل ہوتے... برآمدے میں بیٹھی پھوپھی کے کھیل تماشے کو سمجھتے ساتھ ہی وہ امی پر چیخ پڑی۔

"سارا دن مرتی ہوں میں... ادھر سے ادھر... ادھر سے ادھر... صرف احساس کی آکسیجن نے ہی زندہ رکھا ہوا ہے مجھ کو... اور آپ ان کاغذات کی حفاظت نہ کر سکیں اور کام ہی کیا ہوتا ہے آپ کو سارا دن گھر میں۔ کھانا بھی ایک دن کا پکا۔ دو تین دن چلانا پڑتا ہے اور گھر میں گند ڈالنے کو جگہ ہی کہاں ہے۔"

امی چپ کر کے سنتی رہیں۔ وہ بھلا آگے سے کیا جواب دیتیں۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جن کی ازل سے جنت دوزخ کچن کی چار دیواری کے اندر ہی کہیں بستی ہے اور عورت اس چار دیواری کے اندر کہیں نہیں بستی۔ بڑی چھینا جھپٹی کے بعد انہوں نے پھوپھی سے ساری کشتیاں حاصل کی تھیں۔ اس

احتیاط سے کہ کہیں کاغذ پھٹ ہی نہ جائے۔ پھر ان مڑی تڑی کشتیوں کو وہ زینب کے کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بھیڑ کر خود اپنی جنت برابر دوزخ میں ڈوئی گھمانے چلی گئی تھیں۔

زینب اپنے رویے کی بے احتیاطی اور جابرپن کے باعث بر آمدے میں کھڑی کھڑی ہی احساس جرم میں مبتلا ہو گئی۔ یہ احساس جرم اب اس کے اندر اس قدر مضبوط ہو چکا تھا کہ وہ زلزلہ' سیلاب کی تباہ کاریوں کا ذمہ دار بھی خود کو ٹھہرانے لگی تھی۔

''ٹک ٹک۔۔۔ پھر پھر۔۔۔'' پھوپھی نے حسب عادت اپنے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر اسے چونکا دیا۔ پھوپھی کی آوازیں بھی نجانے کیسی تھیں۔ کسی انسانی مخلوق' چرند پرند سے ان آوازوں کی مماثلت نہ ہو سکتی تھی اور دنیا کی کوئی ڈکشنری ان کے مطلب نہ بتا سکتی تھی۔ اب زینب ایسی پھوپھی سے بھی کیا کہتی جو اپنی ذات میں پیدائشی روگی تھیں۔ درختوں' پودوں' دیواروں' پلنگوں' کرسیوں اور آئینے تک سے من من آواز میں پہروں باتیں کرتی رہتی تھیں' لیکن انسانوں سے ہم کلام ہونے میں عشروں کی بے زاری تھی۔ چڑیا سے ذرا زیادہ ان کی خوراک تھی اور مرغی سے تھوڑی آگے کی ان کی جسامت۔۔۔ نہیں مکمل پاگل نہیں تھیں۔۔۔ بس انسانوں کے بنائے زاویوں میں موجود ایک ہوش مند اور صحت مند آدمی کے خاکے سے وہ کوسوں دور تھیں۔۔۔ لیکن کیا پتا ان کی اپنی ذہنی حالت کے مطابق باقی سب پاگل ہوں اور وہ خود کوئی دانا۔۔۔ کسے خبر۔۔۔ خدا جانے بس۔

ان کی زندگی کے اہم دور کی کہانی' اگرچہ زینب کے بچپن میں ہی مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی دھندلے نقوش کی طرح زینب کو اس کہانی کے بہت سے سپنے یاد تھے۔ کوئل کی کوک بنا وجہ کے تو مین میں نہیں بدلتی ناں۔۔۔ پھوپھی جب بھی اپنے میاں کے گھر سے واپس آتیں ہمیشہ روتی ہوئی آتیں۔ ابو تو آگے سے ایک ہی بات کہہ دیتے تھے۔۔۔ سو باتوں کی ایک بات۔۔۔ ہزاروں مسئلوں کا واحد ازلی اور نکما حل۔۔۔

''تمہارے میاں کا گھر ہی اب تمہارا اصل گھر ہے' گزارہ کرو بس۔۔۔''

پھوپھی نے روتے پیٹتے بڑا لمبا عرصہ گزارا کر لیا تھا۔ پھر جب جب وہ آنے لگیں بڑی چپ چپ رہنے لگیں۔

وجہ۔۔۔

جس درخت کی جڑوں میں مٹھ باسیوں کی روحیں قابض ہو جائیں' اس کا کھوکھلا ہونا پھر سورج چاند کے ہیر پھیر کی طرح یقینی ہو جاتا ہے۔ امی بھی ان کے ہاتھ' بازو' گھٹنے کی پٹی کرتی نظر آتیں' کبھی پھوپھی کو ڈاکٹر کے پاس لے جا کر باقاعدہ ٹانکے لگوائے جاتے۔ کبھی زینب اپنی امی کو پھوپھی کے جسم کے کسی حصے' سر یا کمر کی تیل سے مالش کرتے دیکھتی تو ساتھ پھوپھی کی بے انتہا درد سے کراہتی' دیواریں' کھڑکیاں ہلا دینے والی چیخیں بھی سنتی۔

ایک دفعہ زینب نے دروازے کی جھری سے پھوپھی کی کمر پر تین انگارے کی طرح گہری سرخ لائنیں دیکھ لی تھیں اور اگلے دو دنوں تک وہ خوف کے مارے سو نہیں سکی تھی۔ نیند تو شاید امی' ابو کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ سفید پوشی کے بھرم تلے۔۔۔ اسی لیے شاید بڑے بڑے اجتماع والے اجلاس بھی بارہا بلائے گئے۔۔۔ ہنگامی اور فیصلہ کن۔۔۔ مردوں' عورتوں کی الگ الگ مجلسیں بھی لگیں اس گھر میں۔۔۔ لیکن ہر دفعہ کا فیصلہ بندر بانٹ کا شکار ہو جاتا اور پھوپھی دو پاٹوں میں پسنے پھر اپنے میاں کے گھر۔۔۔ اپنے اصلی گھر چلی جاتیں۔

پھر ایک دن جب پھوپھی گھر آئیں تو امی' ابو دونوں کو یقین ہو گیا کہ اب یہ مر کر بھی واپس نہ جائیں گی' جاگتی آنکھوں کی لو بجھ چکی تھی اور جسم پر جیسے سینگی لگا کر کسی نے سارا خون ہی چوس ڈالا تھا۔ پر پھوپھی کی حالت ایسی بھی تو نہ تھی کہ ابو ان کو گھر پر ہی رکھ سکتے۔ اس لیے پورے ایک سال وہ پاگل خانے رہی تھیں اور اب اس بات کو بیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ ہر روز اپنی کسی حرکت سے اس بات کا پتا ضرور

دیتی تھیں کہ وہ بھی پاگل خانے میں لمبا قیام کر کے آچکی ہیں۔

نہیں ویسے پھوپھی بے ضرر تھیں۔ نہ کسی کے نفع میں نہ نقصان میں... نہ تین میں' نہ تیرہ میں... لیکن جانے انجانے میں وہ کسی چھوٹی موٹی مشکل یا پریشانی کا باعث ضرور بن جاتی تھیں۔

دراصل پاگل خانے میں ہی ان پر پروانہ آزادی (طلاق) نے کچھ عجیب اور نئے ہی طور پر اثر ڈالا تھا۔ عموماً یہ لگام کچھ کس کے پڑی تھی یا وہ اپنی خوشی میں دیوانی ہو گئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آسکی۔ گھر واپس آکر انہوں نے ابو کی بجری (آسٹریلین چڑیوں) کو دروازہ کھول کر آنا" فانا" آزاد کر دیا تھا۔ ہر پر کی پھڑپھڑاہٹ پر وہ خود ہی چیخنے لگتیں۔

"پھر... پھر... آزاد ہو جاؤ... ٹک... ٹک..." چیختی رہیں اور گھومتی بھی رہیں۔ کسی چھوٹے گندے جوہڑ کی طرح جو اپنے اندر بس غیر مرئی سی لہریں ہی پیدا کر سکتا ہے۔ بات کچھ یہیں تک رہتی تو بھی برا نہ تھا... لیکن ذہن پر وہ اثر جو پروانہ آزادی نے انوکھے ڈھب سے ڈالا تھا' بڑھتے بڑھتے کرب کی شکل اختیار کر گیا۔ کوئی نئی پرانی تسبیح' سستی' مہنگی موتیوں کی مالا ان کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کا دھاگہ بھی توڑ ڈالتیں تو سارے دانے موتی صحن میں باجرے کی طرح بکھیر دیتیں۔ ماچس کی تیلیوں کے ساتھ بھی یہ ہی عمل ہوتا۔ پتا نہیں یہ بندھن یا بندھ جانے سے نفرت کا اظہار تھا یا آزاد کر دیے جانے کی لگن...

امی' ابو دونوں مجرموں کی طرح گھروں میں رہتے... ادھر پھوپھی کے ہاتھ کوئی کپڑا' صافی' دوپٹا' شال' پردہ یا جانماز لگ جاتی تو اسے ادھیڑنے بیٹھ جاتیں۔ ایک ایک دھاگہ الگ الگ کر کے آزاد کرتی جاتیں۔ مکمل ایمان داری سے... بڑی جان لگا کر... اور کچھ نہ ملتا تو اپنی ہی قمیص کا دامن ادھیڑنا شروع کر دیتیں۔ اسی لیے پھوپھی کی زیادہ تر قمیص پیٹ سے نیچے تار تار نظر آتی تھی۔ دامن کے دھاگے تو دن بھر میں آزاد ہو جاتے' لیکن اپنے داخلی کرب سے وہ سالوں رہائی نہ پا سکی تھیں۔ یہ وہ سزا تھی جس پر قدرت کی عدالت نے ہزاروں سال کی قید بامشقت لوح ازل پہ لکھ کر قلم توڑ ڈالا تھا۔

کاغذ کے مختلف کھلونے' پھول' کشتی' چاقو' گڈی اور گھر بنانے کی بھی ماہر تھیں۔

زینب نے اپنی پہلی کہانی پھوپھی پر ہی لکھی تھی۔ بڑی محنت سے اور بڑے دن لگا کر... اسے یقین تھا کہ کہانی بہت پسند کی جائے گی۔ چھ مہینے تک وہ کہانی کے شائع ہو جانے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ ساتویں مہینے تک اس نے خود ہی فون کر لیا تھا۔ رسالے کی ایڈیٹر کو...

"آپ نے کانٹیکٹ نمبر ہی نہیں لکھا تھا ورنہ میں خود آپ کو فون کر لیتی۔" نفیس بارعب آواز نے کہا تھا۔

"آپ کی کہانی بہت اچھی ہے۔ لفظ لفظ بہت محنت سے لکھا گیا ہے' لیکن..."

زینب خوف سے کانپنے لگی۔

"دراصل آپ کی کہانی بہت زیادہ ڈارک ہے... بہت زیادہ سیڈ... ایک عورت کا پاگل ہو جانا... اور پھر کپڑے ادھیڑنا' موتی بکھیرنا' کاغذ کے کھلونے بنانا... بہت دکھی اسٹوری ہے۔ ہمارے ڈائجسٹ کی پالیسی کے بالکل الٹ۔"

"لیکن میڈم! یہ تو ایک سچی کہانی ہے۔" زینب نے ٹھوس موقف غیر اعتماد لہجے میں ادا کیا تھا۔

"ہوگی... ہم کوئی تین عورتیں' تین کہانیاں نہیں چھاپ رہے۔ لڑکیاں اپنا موڈ ریلیکس کرنے کے لیے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں... ایسی کہانیاں برا بر اثر ڈالتی ہیں جن میں خود کشی یا پاگل ہو جانے کے قصے ہوں۔ ذرا لائٹ ہلکا پھلکا لکھیے... رومانٹک سا... شائع ہوگا... ضرور شائع ہوگا۔"

فون بند ہو گیا اور زینب مہینوں افسردہ رہی۔

پھر جب اس نے دوبارہ قلم اٹھایا تو اپنی کہانیوں کو کھلے چٹکلوں سے سجا دیا۔ خلاف توقع کہانی اگلے ہی ماہ شائع ہو گئی... لیکن ابھی اس کی بمشکل ڈیڑھ درجن کہانیاں ہی شائع ہو پائی تھیں اور اس کا نام جانا جانے

ہی لگا تھا کہ علی کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی اور یوں ادبی سفر آدھے راستے میں ہی تعطل کا شکار ہو گیا۔
آج پھوپھی کی نوازش سے جو اس کی ٹیلی فلم کے اسکرپٹ کے کاغذات سوراخ زدہ ہو گئے تھے تو ان کاغذات کو پرانی کتابوں اور پرانے ڈائجسٹوں کے ریک میں رکھتے وقت۔۔۔ طلاق کے کاغذات اس کی انگلیوں سے ٹکرا کر نیچے فرش پر گر گئے تھے اور دکھ کا ایک پورا موسم اس پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ طلاق کے کاغذات اس نے رٹے ہونے کے باوجود دوبارہ پڑھنے شروع کر دیے۔ زندگی بھر کی نامحرمیوں کو ایک رات میں تھوڑی نہ بھلایا جا سکتا ہے۔
"علی حماد ولد حماد ذوالفقار۔۔۔" زینب استہزائیہ انداز میں ہنسی اور غم کی ندی میں غوطہ لگا کر سانس لینا بھول گئی۔
"کیا کمینہ شخص تھا علی بھی۔۔۔ ناسپال کی طرح دو رنگی۔۔۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ اور۔۔۔ اونٹ کی کھال سے بنے لیمپ کی طرح پہلے تو بڑی مدھم اور آنکھوں کو بھلی لگنے والی روشنی دیتا رہا۔ لیکن جوں ہی کھال پھٹی تو بڑی بھیانک لشک باہر کو لپکی تھی۔
"میں علی حماد ولد حماد ذوالفقار سات براعظموں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زینب حیات تم سے ساری زندگی محبت کروں گا۔"
کہتے ہوئے علی کا دمکتا چہرہ سیدھا زینب کے دل میں اتر گیا تھا۔ اس نے علی کی قسم کا یقین کر لیا اور اس سے شادی کر لی۔ تب وہ اور علی دونوں ایک ہی کوچنگ سینٹر میں جاب کرتے تھے۔ زینب نے بڑی کم عمری میں ہی ایسی چھوٹی موٹی جابز کرنا شروع کر دی تھیں۔ جب ایک رات اس نے ابا کو امی سے شکوہ کرتے سن لیا تھا۔
"بیٹا ہوتا تو اس گھر کو چلانے کے لیے بڑھاپے میں اپنی ہڈیاں نہ گلانی پڑتیں مجھے۔"
اس نے ابا کو سبزی منڈی جانے سے منع کر دیا تھا اور گھر کو چلانے کے لیے اپنی ہڈیاں آگے کر دی تھیں۔ علی کو شادی کے بعد پہلا اعتراض اسی جاب پر تو ہوا تھا۔ نہیں جاب پر نہیں' بلکہ جاب سے آنے والی کمائی پر۔۔۔
"تمہاری نظر میں سرفہرست میں اور میرا گھر ہونا چاہیے نہ کہ اب شادی کے بعد بھی اپنے باپ کا گھر۔"
علی نے ایک دن بڑے ہلکے انداز میں بات کی تھی' لیکن جب زینب اپنی اگلے ماہ کی تنخواہ بھی امی کے ہاتھ پر دھر آئی تو ہلکے اعتراض نے باقاعدہ لڑائی کی صورت حال اختیار کر لی تھی۔
"تم اپنی تنخواہ مجھے دیا کرو اب۔" علی نے دوٹوک کہہ دیا اور زینب نے امی سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ ابا دوبارہ سبزی منڈی جانے لگے۔ دونوں بوڑھے ہوتے ماں' باپ کسی صورت اپنی بیٹی کا گھر داؤ پر نہ لگانا چاہتے تھے۔ لیکن گھر جو گھر نہ بن سکا۔ پہلے دن سے ہی داؤ پر لگا ہوا تھا۔ زینب ہی بے خبر تھی۔
"علی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ میں ریزائن دے رہی ہوں۔ مجھ سے اس حالت میں ویگنوں بسوں کے سفر نہیں ہوتے۔"
"یار! میں چھوڑ آیا کروں گا تمہیں۔۔۔ بائیک پر۔۔۔ اپنے آفس جانے سے پہلے۔۔۔ صبح جلدی اٹھ جایا کروں گا۔" علی عاجز آیا ہوا تھا۔
"بات صرف اتنی نہیں ہے علی۔۔۔ دراصل۔۔۔ دراصل ڈلیوری میں دو ہی ماہ رہ گئے ہیں' آفس میں مرد بھی کام کرتے ہیں' مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔"
بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا علی یک دم ساکت ہو گیا۔
"دراصل بات یہ ہے مسز زینب علی کہ آپ کامیاب مستقبل کو بنانے میں اپنے شوہر کی جدوجہد میں اس کا ساتھ دینا ہی نہیں چاہتی ہیں۔ آپ بھی ان روایتی عورتوں کی طرح گھر میں ٹھاٹھ سے رہ کر مردوں کی باہری دنیا کی سرتوڑ کوششوں پر یہ کہتے ہوئے لعنت بھیجتی ہیں کہ مرد تو بنے ہی کمانے کے لیے ہیں۔"
بھنویں سکیڑ کر زینب نے علی کو اجنبی نظروں سے دیکھا تھا۔ دنوں وہ علی کی بات کے اصل مفہوم کو نہ سمجھ سکی اور مہینوں اسے اپنا موقف نہ سمجھا سکی۔
پھر اس کی زندگی کی کہانی میں حنا آگئی۔ نجانے کہاں

سے دیمک کی طرح ایک دفعہ آکر دوبارہ نہ جانے والی... چلو آجاتی... زینب ایسی بھی تنگ نظر نہ تھی کہ محض شوہر کی دیدہ بازی پر دل تنگ کر کے ناراض ہو' ہو کر گھر آجایا کرتی۔ لیکن مسئلہ تو الجبرا کی طرح تب پیچیدہ ہوا' جب ان کی زندگیوں میں داخل ہو کر حنا نے واپس نہ جانے کا عزم ہی کر لیا' اور علی آئے دن نت نئی شرٹس پر مہنگے مہنگے پرفیوم چھڑکنے لگا۔ اس کے جوتے بھی ایسے ہی بے بہا قیمتی ہونے لگے کہ زینب کے ہاتھ ان پر پالش کرتے ہوئے کانپ کانپ جاتے۔ ایک دن اس نے کانپتے دل کے ساتھ علی سے کہا۔

"تمہیں حنا اس لیے اچھی لگتی ہے کہ وہ خوب صورت ہے یا اس لیے کہ وہ دولت مند ہے؟" حالانکہ زینب کے لیے تو دونوں ہی باتیں ناقابل قبول تھیں۔

یہ لفظی تھپڑ تھا جو علی کے گال پر لگا' اور جسے وہ اپنے دل تک لے گیا۔ لیکن چونکہ مرد تھا' اس لیے جواب اس نے دماغ سے دیا۔ بڑے تحمل سے۔

"دولت پر ہر خوبی حاوی ہوتی ہے مسز زینب علی! درحقیقت یہ ہی سب سے بڑی خوبی ہے۔"

"تم یہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم خود ایک مایا داس ہو۔ دولت کے پجاری۔"

"اپنی ادبی گفتگو اپنے پاس رکھو... میں رینگ رینگ کر سسک سسک کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتا دینا' تمہارا سارا حساب کتاب میں اسی وقت بے باق کر دوں گا۔"

زینب جانتی تھی کہ سارا حساب کتاب بے باق کرنے میں تین سیکنڈ اور تین لفظ درکار ہیں۔ اس لیے وہ بڑی دیر خاموشی سے اپنے کھاتے کا کھاتا دیکھتی رہی اور برداشت کرتی رہی۔

لیکن حنا نے محرومیوں میں زندگی نہیں گزاری تھی اور نہ ہی اسے کسی سفید پوشی کا بھرم درکار تھا۔ اپنی خود کی ترتیب شدہ زندگی میں وہ علی کی پہلی بیوی جیسے بھونچال کو اپنے گھر کے کونے کے ساتھ لگا ہوا بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

اس لیے علی زینب سے لڑنے کا ہر چھوٹے سے چھوٹا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ زینب کے دل کی بارہ دری میں ابھی بھی کہیں پرانا کوچنگ سینٹر والا انٹ کھٹ سا علی ہی براجمان کیے بیٹھا تھا۔ جس نے سات بار اعظموں کی قسم کھا کر ساری زندگی کی محبت نبھانے کا عہد دیا تھا۔ اس نئے پر آسائش زندگی کی ہوس کے مارے علی کو وہ ہلکان ہوتا ہوا نہ دیکھ سکی اور چپ چاپ اپنے گھر چلی آئی۔

چند دنوں بعد ہی اسے طلاق کے کاغذات مل گئے تھے۔ جسے اس نے پرانی کتابوں اور ڈائجسٹوں کے ریک میں دفن کر دیا تھا اور ان کاغذات کے ساتھ وہ کہیں خود بھی دفن ہو کر رہ گئی تھی۔

"پھاڑ کے پھینک دے اسے... یا جلا دے۔ کس لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے اس پرانے زخم کو... بار بار کریدنے کے لیے یا تڑپنے کے لیے۔"

امی نے وہاں کی صفائی کرتے ہوئے کتنی ہی بار اسے کہا تھا اور پھوپھی کتنی ہی دفعہ ان کاغذات کا گھر بنا چکی تھیں... وہ ہر دفعہ انہیں پھینکنے یا جلانے کے پختہ خیال کو ٹال جاتی تھی۔ شاید طلاق ہونے کے باوجود بھی وہ ابھی تک علی کی محبت کو اپنے دل سے نکال نہ پائی تھی یا شاید اس نے کوشش ہی نہ کی تھی۔

"میں علی حماد ولد ذوالفقار..." وہ استہزائیہ ہنسی اور غم کی ندی میں ڈوب کر سانس لینا بھول گئی۔ ڈھائی سال کے اندر اندر یہ فقرہ دوبار اس کے دل میں اترا تھا۔ ایک دفعہ اس کی زندگی کو محبت سے بخش دیا گیا تھا اور دوسری مرتبہ برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں بڑے مدھم انداز سے سرگم کی آواز گونجی تو اس نے چونک کر اپنے بیگ میں سے موبائل فون نکالا۔

پروڈکشن ہاؤس سے مسٹر اکرام کا فون تھا۔

"مجھے لگا میری دوپہر کی گفتگو سے آپ کچھ زیادہ ہی ان ٹینس نہ ہو گئی ہوں... دیکھیے پوائنٹ بہت چھوٹے چھوٹے لیکن بہت اہم ہیں... پہلے تو ہمیں ٹیلی فلم کا

نام تبدیل کرنا ہوگا۔۔۔ کیا ٹائٹل ہے آپ کی فلم کا۔۔۔ ساڑھ ستی؟"

"جی سر۔۔۔ ساڑھ ستی۔"

"عنوان بہت مشکل ہے۔۔۔ اور کیا مطلب بتایا تھا آپ نے اس کا۔"

"زحل کا منحوس دور۔۔۔ جو ساڑھے سات برس کا ہوتا ہے۔۔۔ نحوست کا لمبا وقت۔"

"اوہ نو۔۔۔ نو۔۔۔ یہ کائناتی راز فاش کرنے والے نام ٹیلی فلمز کے ٹائٹل نہیں ہوسکتے۔۔۔ کوئی پیارا سا نام رکھیے۔۔۔ محبتوں کے گیت۔۔۔ ساحلوں کے دیپ جیسا۔۔۔ لڑکیاں تو ایسے عنوان پر ہی مرمٹتی ہیں۔۔۔ اور آخری سین تو بالکل ہی بدل ڈالیے۔۔۔ ہیروئن کو اپنے بچے کے ساتھ مسکراتا ہوا دکھایئے۔۔۔ شوہر کے چھوڑ جانے سے کوئی زندگی ختم تھوڑی ہوجاتی ہے یا ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے دکھایئے۔ ایک نئے عزم کے ساتھ۔۔۔ ایک سبق ہوجائے گا سب کے لیے اختتام پر۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ سمجھ گئیں نا آپ؟"

"جی بالکل۔۔۔" فون بند کرکے وہ خلاؤں میں گھورنے لگی تھی۔

"ساحلوں کے دیپ۔۔۔ محبتوں کے گیت؟"

عورت پر ساڑھ ستی کا ستارہ تو پچھلے سات قرنوں سے چمک رہا ہے۔ پھر وہ ساحلوں کے دیپ کیسے دیکھ سکتی ہے اور محبتوں کے گیت کیسے سن سکتی ہے؟

"ہیروئن کو اپنے بچے کے ساتھ مسکراتا ہوا دکھائیں۔"

طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مسٹر اکرام کی بات کو یاد کیا تھا۔ خود اسے اپنے بچے کی کسٹڈی کا کیس لڑتے سال گزر گیا تھا۔ عدالتوں کے چکر لگا لگا کر وہ ادھ موئی ہوگئی تھی اور جس دن فیصلہ زینب کے حق میں ہوا۔ علی نے اسے ایک الگ ہی وار سے ہرا دیا تھا۔ وہ وار جو عرصے سے انسانیت کی معراج بنا ہوا ہے۔

"تم چاہتی ہو کہ وہ بھی تمہاری طرح ترس ترس کر زندگی گزارے؟ میں اس کا باپ ہوں۔۔۔ سگا باپ۔۔۔ حنا اسے ماں جیسا پیار نہ بھی دے سکی تو اس کا حق تو ضرور دے دے گی۔"

علی کچھ حقیقت اور کچھ حربے سے زینب کو رام کرکے بچے کو اپنے ساتھ دبئی لے گیا تھا۔ نہیں صرف بچے کو نہیں، بلکہ زینب کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر بھی۔۔۔ جب کبھی ممتا کا سیلاب اس کی آنکھوں میں امڈ کر دھمکی سی دینے لگتا تو وہ یہ سوچ کر دل پر پتھر رکھ لیتی کہ چلو اس کا بیٹا تو دبئی میں پرورش پا رہا ہے۔۔۔ دبئی جو پارس پتھر ہے۔۔۔ شاید اس کا بیٹا اسے چھو کر کندن ہی بن جائے۔

علی نے ٹھیک ہی تو کہا تھا اس سے کہ وہ ترس ترس کر زندگی گزار رہی ہے۔ واقعی ان دنوں کتنی ضرورت تھی اسے پیسے کی۔۔۔ ابا کی وفات کے بعد سارا گھر ہی تو اس کے کندھوں پر آن گرا تھا اور ایک یہ ٹیلی فلم تھی جس کی نیا پار ہی نہیں لگ پا رہی تھی اور بے پتوار کی کشتی کی طرح بس ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔

"اینڈ ہیپی (خوش گوار) کریں۔۔۔ مسکراتا ہوا دکھایئے۔۔۔ ایک عزم سا اٹھے سینے میں۔" کہانیوں کے بارے میں بھی اسے یہ ہی کہا جاتا تھا۔

"فرضی کہانیوں کے اینڈ تو ہیپی ہوجائیں گے۔ لیکن اصل زندگی ویسی ہی دکھی رہے گی۔" بڑے درد سے اس نے سوچا تھا۔

اور دھاڑ سے کسی نے اس کے کمرے کے دروازے کے ایک پٹ کو تھام لیا تھا۔۔۔ گرنے سے بچنے کے لیے۔۔۔ زینب نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔ یہ حرکت پھوپھی نے کی تھی۔۔۔ جو اب بھونچکے انداز میں اسے، زینب کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایسے جیسے ان کا سارا جسم خاردار جھاڑیوں پر گھسٹتا جارہا ہو، جاگتی روح سمیت۔۔۔ زینب ان کے ایسے دیکھنے کے انداز کو نہ سمجھ سکی۔

لیکن پھر چند لمحوں بعد۔۔۔

اس پر ایک کرب ناک حقیقت آشکار ہوئی۔

اپنی ہی سوچوں میں غلطاں۔۔۔ وہ نجانے کب سے۔۔۔

اپنی ہی قمیص کے دامن کے دھاگے ایک ایک کرکے نکال رہی تھی اور اپنا دامن تار تار کررہی تھی۔

☼

نازیہ کنول نازی

ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے
پھر کسی آنکھ کسی نیند میں آئیں گے کہیں
پھر کسی راہ، کسی موڑ پہ ہم ہوں گے نہیں
ہم تو بس گرد ہیں کچھ دیر میں چھٹ جائیں گے
ہم تو خوشبو ہیں ہمیں رنگ نہ دینا کوئی
صرف احساس کو چھو کر گزر جانا ہے ہمیں
ہم تو آنسو ہیں بہیں گے تو نہ لوٹیں گے کبھی

ناولٹ

ہم تو بس زخم ہیں سینے کا ہمیں بھرنا ہے
ہم وہ احساس کی بیلیں ہیں جو چھاؤں چاہیں
درد کی دھوپ جو چھولیں تو ہمیں مرنا ہے
ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے!

موسم اچانک خراب ہوا تھا۔ تیز آندھی کے بعد موسلا دھار بارش اور اس پر زور و شور سے چمکتی گرجتی بجلی نے اس کا ننھا سا دل سہا کر رکھ دیا۔ احزار ابھی گھر نہیں آیا تھا' جبکہ باقی نوجوان پارٹی اسی کے کمرے میں گھسی فلم دیکھ رہی تھی۔

علیزہ نے جائے نماز سمیٹ کر رکھنے کے بعد ایک نظر باہر صحن میں اوپر آسمان کی طرف دیکھا' پھر درود شریف کا ورد کرتی کچن کی طرف چلی آئی۔

سنک میں شام کی چائے اور رات کے کھانے کے برتن پڑے' ابھی تک اس کی نگاہ التفات کے منتظر تھے' وہ خاموشی سے برتن دھونے میں مصروف ہوگئی' تقریباً پچیس منٹ کے بعد احزار' بارش میں بھیگا گھر واپس آیا تھا۔

''ایکسکیوزمی... کوئی ہے؟''

وہ جانتا تھا کہ علیزہ کچن میں ہوگی' تبھی گھر میں داخل ہوتے ہی کچن کی طرف چلا آیا تھا۔ علیزہ نے ذرا سی گردن ترچھی کرکے اسے دیکھا پھر دوپٹے سے ہاتھ خشک کرلیے۔

''جی ہاں' سب ہی لوگ موجود ہیں' الحمدللہ بھرا پرا گھر ہے۔''

''اچھا... مگر تمہارے سوا کوئی نظر تو نہیں آرہا...''

لیدر کی جیکٹ سے پانی کی بوندیں جھاڑتے ہوئے وہ اس کے قریب آیا تھا۔

علیزہ مسکرا دی۔
"نظر کیسے آئے گا کوئی؟ سب رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جاچکے ہیں ہاں جو کزنز پارٹی ہے وہ آپ کے کمرے میں آپ کے پیارے کمپیوٹر پر دھاوا بولے جانے کون کون سی موویز دیکھنے میں مصروف ہیں۔"
"اچھا... اور آپ جناب یقیناً" میرے سلامتی سے گھر واپس آنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں گی، ہیں ناں؟" روشن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا وہ تھوڑا قریب ہوا تھا۔ علیزہ جلدی سے پیچھے کھسک گئی۔
"جی ہاں، لیکن کل سے اگر اتنی لیٹ گھر آئے تو میں بھی بالکل نہیں جاگوں گی۔"
"روز یہی دھمکی دیتی ہو مگر عمل نہیں کرتیں؟"
"کیا کروں، مجازی خدا جو ہوئے۔"
"اچھا پھر کیا خیال ہے تائی اماں سے کہہ کر رخصتی نہ کروالوں۔" شرارت سے لب دباتے ہوئے وہ پھر اس کی طرف تھوڑا سا جھکا تھا، تبھی علیزہ نے گھبرا کر فوراً" اس کی طرف دیکھا۔
"خبردار، اگر یہ بے ایمانی کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گی۔"
"اچھا اچھا بابا ٹھیک ہے۔ میں کمرے میں جا رہا ہوں۔ ابھی ایک کپ گرما گرم چائے بنا کر لے آؤ، کھانا میں کھا کر آیا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔"
"گڈ گرل!" محبت سے اس کے گال تھپتھپاتا ہوا اگلے ہی پل وہ کچن سے نکل گیا تھا۔ علیزہ نے اس کے جانے کے بعد بے ساختہ کھل کر سانس لی۔
کتنے سال ہو گئے تھے اس شخص کے نکاح میں آئے مگر آج بھی اس کی قربت اسے بوکھلا دیتی تھی۔ اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔
اس نے سن رکھا تھا کہ اللہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتا ہے، مگر علیزہ حسین کو اس سچ کا یقین احزار عبدالہادی کو پانے کے بعد ہوا تھا، وہ احزار عبدالہادی جو اس کا فرسٹ کزن اور اس کی زندگی کا پہلا خواب تھا۔

☆ ☆ ☆

احزار اپنے کمرے میں آیا تو علیزہ کی اطلاع کے عین مطابق، سب کزنز اس کے کمرے میں دھاوا بولے، تقریباً" وہاں موجود ہر چیز کا حشر بگاڑ چکے تھے۔ قالین پر چیونگم، چپس اور مختلف بسکٹس کے ریپر اسے غصہ دلا گئے۔
جانے کون سی مووی تھی۔
آزر جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی فوراً" نیند کا بہانہ کرتے اٹھ کھڑا ہوا، تاہم لڑکیاں ابھی بھی سوئی جاگی سی کیفیت میں کمپیوٹر کے سامنے براجمان، فلم ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں وہ اسے آتے دیکھ کر چلی گئی تھیں۔
وہ غصہ ضبط کرتا، فریش ہونے کے بعد وہیں بیڈ پر ٹک گیا، تقریباً" پندرہ منٹ کے بعد علیزہ چائے لے کر آئی تو وہ بھی فلم دیکھنے میں مگن ہو چکا تھا۔ علیزہ نے ایک نظران سب پر ڈالنے کے بعد، چائے کا کپ احزار کے بیڈ کے پاس تپائی پر دھر دیا۔ کپ رکھ کر وہ جانے کے لیے پلٹ ہی رہی تھی کہ احزار نے اسے پکار لیا۔
"علیزہ۔"
"ہوں۔"
"تم مووی نہیں دیکھتیں؟"
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"مجھے پسند نہیں، ویسے بھی باہر اتنا خراب موسم ہے، بجائے اللہ رب العزت کی پاک ذات سے ڈرنے کے ہم یہ گناہ کا کام کیوں کریں۔"
"اچھا پلیز فوراً" لیکچر نہ شروع کر دیا کرو، ابھی بیٹھو پلیز، مجھے اچھا لگے گا۔"
"نہیں، تمہیں دیکھنی ہے تو تم دیکھو، مجھے نیند آ رہی ہے۔"
"صرف پانچ منٹ بیٹھ جاؤ، پلیز۔"

اس بار علیزہ کا بازو تھامتے ہوئے احزار کا لہجہ ملتجی ہو گیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔ یسریٰ، نمل اور کومل جو اس کے چھوٹے چچا کی بیٹیاں تھیں۔ تینوں فلموں کی شیدائی تھیں اور یقیناً ان ہی کی ضد پر آزر نے احزار کا کمپیوٹر استعمال کرنے کی جرات کی تھی۔ کیونکہ احزار خود کو ان تینوں بہنوں کا اکلوتا بھائی سمجھتا تھا اور اس کے دربار میں ان تینوں کے سارے قصور قطعی معاف تھے۔ اب تک جانے کتنی فلمیں دیکھی جا چکی تھیں۔

احزار ایک نظر اسکرین پر ڈال لیتا پھر موبائل کے ساتھ مصروف ہو جاتا۔ علیزہ نے دیکھا' سامنے اسکرین پر اس وقت نہایت بولڈ سین چل رہا تھا۔ اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا' موبائل کے ساتھ مصروف احزار عبدالہادی سے نگاہ چرائی' وہ ایک منٹ سے پہلے اس کے پہلو سے کھڑی ہوئی تھی۔

"کمپیوٹر آف کر دو احزار! وہ سب جا چکے ہیں مجھے بھی بہت ٹوٹ کر نیند آ رہی ہے۔"

"بات سنو۔" اس کے فرار پر ایک نظر سامنے سکرین پر ڈالتے ہوئے احزار نے فوراً اسے روک لیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی تھی۔

"ہوں۔"

"یہاں بیٹھو پلیز۔"

"احزار! مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی تمہیں؟" علیزہ کے فرار پر وہ خفا ہوا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔

"علیزہ....!"

صرف ایک لمحے کے بعد اس نے قدرے سرگوشی میں اسے پکارا تھا' علیزہ کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ در آئی' احزار اس لمحے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اک سال ہونے کو آیا تھا ان کے نکاح کو' مگر آج تک احزار نے کبھی کسی کمزور لمحے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی کے باوجود ایک فاصلہ رہا تھا۔ مگر اس وقت جانے کیا ہوا تھا کہ اس جیسا مضبوط اعصاب کا شخص بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ پایا تھا۔

اپنے اعصاب پر قابو پاتی علیزہ بھاگ کر احزار کے کمرے سے نکل آئی تھی' وہ اسے پکارتا ہی رہ گیا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ابھی وہ اپنی منتشر سانسوں کو سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ احزار اس کے کمرے میں آ گیا۔

"علیزہ! میری بات سنو پلیز۔" بے بس سا وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

"تم میری بیوی ہو' میں کچھ غلط نہیں چاہ رہا پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو' پلیز۔"

"نہیں... تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ پلیز۔"

"میں نہیں جاؤں گا' تم جانتی ہو میں تم پر پورا پورا حق رکھتا ہوں' پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر میں رخصتی سے قبل..."

"چپ کر جاؤ احزار پلیز۔" علیزہ کی آواز بھرائی تھی۔

"تمہیں اس بات سے فرق پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو' مگر مجھے فرق پڑتا ہے' کیونکہ میں سمجھتی ہوں ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں' وہاں کی روایات کا خیال رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا بس' تم میری منکوحہ ہو اور تمہیں میری زندگی کا حصہ بننا ہے۔" اس نے پھر اسے بے بس کرنے کی کوشش کی تھی وہ بے اختیار رو پڑی۔

"احزار! یہ غلط ہے۔"

مگر احزار نے نہیں سنا' وہ جنونی ہو رہا تھا۔ علیزہ کے احتجاج اور گریز کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کوئی راستہ نہ پا کر علیزہ اپنے کمرے کے باتھ روم میں جا چھپی۔ اس وقت وہی اس کی بہترین پناہ گاہ تھی۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے باتھ روم لاک کیا تھا۔ احزار اس کی اس حرکت پر جیسے پاگل سا ہو

اٹھا۔

"دروازہ کھولو علیزہ! نہیں تو میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گا۔"

"مت کرنا' میں خود آج کے بعد تمہاری شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گی۔"

"علیزہ! میں کہہ رہا ہوں دروازہ کھولو' نہیں تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر' تم جاؤ یہاں سے پلیز۔"

"تو ٹھیک ہے' اب اس کا رزلٹ بھی دیکھ لینا۔"

وہ غصے میں تھا' علیزہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ احزار عبدالہادی اس کے ساتھ کبھی ایسا بھی کر سکتا ہے' اسے گمان تک نہیں تھا۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر احزار کی آنکھیں سرخ تھیں۔

جبکہ اپنے کمرے میں مقید علیزہ حسین کا وجود بخار میں جل رہا تھا۔ کل پوری رات شدت سے رونے کے سبب' اس کی آنکھیں سرخ اور بوجھل ہو رہی تھیں' جبکہ سر میں شدید درد تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ احزار عبدالہادی کو گریبان سے پکڑ کر اس کے چہرے پر دو تھپڑ تو ضرور جڑ دیتی۔ باہر لاؤنج سے گاہے بگاہے سب کی آوازیں آرہی تھیں' اس کی غیر حاضری پر شاید اس کی ماں نے سب کے لیے ناشتہ بنانے کے فرائض سرانجام دیے تھے' وہاں ناشتے کی ٹیبل پر اس کی ماں کے سوا شاید کسی کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ تبھی وہ بے جان سی بستر میں دبکی پڑی رہی۔ وہاں اس کی فکر کرنے اور اس کا حال پوچھنے کی فرصت کسی کے پاس بھی نہیں تھی' تبھی اس نے محسن صاحب کی آواز سنی تھی۔

"تمہاری کینیڈا جانے کی بات کہاں تک مکمل ہوئی احزار؟"

"کوشش کر رہا ہوں بڑے ابو' اللہ نے چاہا تو جلد بات فائنل ہو جائے گی۔" احزار کا لہجہ اسے بے حد بھاری محسوس ہوا تھا۔

"ہوں' یسریٰ کے لیے ایک لڑکا دیکھا ہے میں نے' ویل آف فیملی سے تعلق رکھنے والا اکلوتا لڑکا ہے' تم ذرا چھان بین کر لو۔"

"ٹھیک ہے کر لوں گا۔"

"طبیعت بہتر نہیں لگ رہی تمہاری' سب ٹھیک تو ہے؟"

"جی سب ٹھیک ہے' مجھے کچھ بات کرنی تھی آپ لوگوں سے۔"

قدرے اکھڑے لہجے میں اس نے کہا تھا اور علیزہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ شدید بخار کے باوجود وہ گرم کمبل سے نکل کر کچن میں آئی تھی' تاکہ احزار کی آواز کو صاف سن سکے۔

"ہوں کہو....." احزار کے سنجیدہ انداز پر جہاں سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے' وہیں حسن صاحب نے بھی ہاتھ میں پکڑا اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔ احزار نے صرف ایک نظر کچن کی طرف دیکھا پھر لب بھینچ کر نگاہ پھیرلی۔

"پاپا! میں کینیڈا جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا ہوں' تاکہ میں یہاں ہر معاملے سے قطعی بے فکر ہو کر وہاں مکمل توجہ کے ساتھ اپنی پڑھائی مکمل کر سکوں' میں درمیان میں لٹک کر نہیں جانا چاہتا۔"

وہی ہوا تھا جس کا علیزہ کو ڈر تھا۔

ناشتے کی ٹیبل کے گرد بیٹھے سب افراد کو احزار کی اس اچانک فرمائش پر حیرانی ہوئی تھی۔ مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

حسن صاحب اب اخبار ایک طرف رکھ کر اس سے کہہ رہے تھے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا احزار کہ اباجی کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی' ان کی زندگی میں ہی یہ کار خیر انجام پا جائے تو بھلا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے' مگر..... علیزہ ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے' وہ پڑھ رہی ہے' ابھی امتحان بھی نہیں ہوئے اس کے' وہ ڈسٹرب ہو کر رہ جائے گی۔"

"پاپا! میں کچھ نہیں جانتا' آپ تائی اماں سے بات

کریں اگر وہ شادی کے لیے تیار ہیں تو ٹھیک ہے' نہیں تو میری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔"
قطعی دوٹوک انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ وہاں ایک پل نہیں ٹھہرا تھا۔ جبکہ حسن صاحب اور باقی سب افراد ہکابکا سے اس کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔
علیزہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہو' احزار عبدالہادی کے لیے یہ رشتہ اتنا کمزور ہو گا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تب ہی وہیں کچن میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے آنسوؤں کو کھل کر بہنے دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

احزار عبدالہادی علیزہ حسین کے دل کی پہلی خواہش اور اس کا اولین خواب تھا۔
دونوں ایک ہی گھر میں پل کر جوان ہوئے تھے' بچپن میں وہ اس کے معاملے میں اتنی حساس تھی کہ اگر وہ اسے چھوڑ کر کسی اور بچے کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو جاتا' یا گھر میں اس کے سوا کسی اور کو اپنی کوئی چیز دے دیتا تو وہ فوراً" منہ بسور کر بیٹھ جاتی تھی' جب کوئی احزار کو اپنے ساتھ کھیلنے کی آفر کرتا تو وہ فوراً" اپنے سارے کام چھوڑ کر آتی اور احزار کا ہاتھ پکڑ کر" میلا اے" کہتے ہوئے اپنی طرف کھینچ لیتی۔
بچپن سے سب احزار کے لیے اس کی حرکتوں کو خوب انجوائے کرتے تھے۔ اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے منیر احمد صاحب (دادا جی) نے بچپن میں ہی ان دونوں کو نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھ دیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی جلد ہو گیا تھا کیونکہ علیزہ کے والد حسین احمد صاحب حیات نہیں تھے اور خود منیر احمد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔
علیزہ کی ماں اور احزار کے گھر والے دونوں ہی اس رشتے پر خوش تھے۔ مگر منیر صاحب کے منجھلے بیٹے محسن اور ان کی بیوی کا منہ بن گیا تھا۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں' اور وہ دونوں احزار کو اپنا داماد بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ تاہم منیر احمد صاحب نے ان سے مشورہ

کرنے کے بجائے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا جس پہ وہ دونوں خوش نہیں تھے۔

احزار اپنا ایم بی اے مکمل کر چکا تھا اور اب اس کا ارادہ کینیڈا جانے کا تھا۔ تاکہ مزید تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زور بازو پر اپنے لیے روزگار کے بہترین مواقع حاصل کر سکے۔ علیزہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی' اس کے والد حسین احمد صاحب کی شادی اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے بعد ہوئی تھی' وجہ ان کی ضرورت سے زیادہ بزنس میں توجہ تھی جس کے سبب وہ شادی کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔

جس وقت علیزہ کی پیدائش ہوئی' محسن صاحب دو بیٹیوں اور حسن صاحب دو چاند سے بیٹوں کے باپ بن چکے تھے' بعد ازاں علیزہ کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد محسن صاحب کے ہاں ان کی تیسری بیٹی کومل نے جنم لیا' جبکہ حسن صاحب کی بیگم نے آزر کی صورت ایک اور خوب صورت بیٹے کو جنم دے کر اس گھر کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔

ثمینہ بیگم البتہ اس گھرانے کو ایسی کوئی خوشی نہیں دے سکی تھیں' علیزہ کے بعد انہوں نے ایک مردہ بیٹے کو جنم دیا اور پھر کبھی ماں نہ بن سکیں۔ حسین صاحب دل کے مریض تھے۔ علیزہ جب سات سال کی تھی' وہ دنیا سے منہ موڑ گئے۔ تب سے منیر صاحب ہی اس کو باپ کا پیار دیتے آئے تھے۔ اب بھی انہوں نے ہی اس کے باپ کی حیثیت سے اس کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا۔ جس پر وہ خود بھی بے حد خوش تھی۔

محسن صاحب کو منیر صاحب سے گلہ تھا کہ ان کی بیٹیاں زیادہ تھیں' پھر علیزہ سے بڑی بھی تھیں منیر صاحب کو پہلے ان کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ مگر انہوں نے ان کی بیٹیوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے علیزہ حسین احمد کے بارے میں سوچا تھا اور یہ صریحا" زیادتی تھی۔

مگر منیر صاحب نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ احزار اور علیزہ کو نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھنے کے بعد وہ جیسے بہت پرسکون سے ہو گئے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جہاں علیزہ اور احزار میں محبت بڑھی تھی۔ وہیں منیر احمد صاحب کی صحت تیزی سے گرنا شروع ہو گئی' علیزہ کا زیادہ وقت انہی کے کمرے میں گزرتا تھا' مگر پھر بھی وہ مسلسل بیماری کی زد میں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی علیزہ کی رخصتی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔ مگر علیزہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کے لیے اپنی تعلیم پر توجہ دینا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ اس مسئلے کو ٹالتی آ رہی تھی' تاہم اس کی اس ضد کے سبب نادرہ حسن کی محبت اس کے لیے پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ کچھ محسن صاحب کی بیگم زرینہ ہر وقت ان کے کانوں میں عجیب عجیب سی باتیں ڈالتی رہتی تھیں' ان کی تینوں بیٹیاں بھی ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھیں' تبھی انہیں اپنے لائق فائق سے بیٹے کے لیے علیزہ جیسی اپنے آپ میں مگن رہنے والی کم گو لڑکی قطعی غلط انتخاب لگنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اب اس وقت کو اکثر کوستی نظر آتی تھیں' جب انہوں نے اپنے سسر کے فیصلے پر ان کا ساتھ دیا تھا۔

سونے پر سہاگہ احزار کی علیزہ کے لیے بے تحاشا محبت اور ناز برداریوں نے ان کا دل مزید تنگ کیا تھا وہ اب دل سے اس بندھن کے لیے خوش نہیں تھیں۔

اس روز کے بعد سے احزار کے معمولات بدل گئے تھے۔

وہ صبح دس بجے بیدار ہوتا تھا۔ پھر آفس چلا جاتا' آفس سے واپسی پر کسی دوست کی طرف نکل جاتا پھر معمول کے مطابق رات گئے تک گھر واپسی کی راہ لیتا' اس کے سارے کام جو علیزہ اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیتی تھی' اب کومل نے چپ چاپ اپنے ذمے لے لیے تھے' اس کا کمرا صاف کرنا' اس کے کپڑے پریس کرنا' اسے چائے بنا کر دینا' اس کے لیے کھانا لگانا بڑی خوشی خوشی وہ یہ سارے کام سر انجام دے رہی تھی' علیزہ جلتے سلگتے دل کے ساتھ سب دیکھتی رہتی اور روتی رہتی۔

اس روز وہ کچن میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی
'جب نمل نے اچانک اس سے پوچھ لیا۔
"ایک بات پوچھوں علیزہ' مائنڈ تو نہیں کرو گی؟"
وہ ٹھٹکی تھی اور قدرے حیرانی سے اس نے نمل کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ علیزہ نے چپ چاپ برتن خشک کرنے کے بعد کپڑا سائیڈ پر رکھ دیا۔
"پوچھو!"
"ہوں .... اس رات جب ہم احزار بھائی کے کمرے میں مووی دیکھ رہے تھے' تمہارے اور ان کے بیچ کیا ہوا تھا؟"
علیزہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے ایسا کوئی سوال کرے گی۔ تب ہی اس کے ہاتھ سے کپ چھوٹا تھا اور نیچے زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔
"کہ .... کچھ نہیں' کیوں' تم ایسا کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"بس یونہی' تم تو خوامخواہ پریشان ہو گئی ہو' اصل میں اسی رات کے بعد تمہارے اور احزار بھائی کے درمیان بول چال بند ہے' گھر میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں جنم لے رہی ہیں' امی اور چچی سارا دن سر جوڑے پتا نہیں کیا کیا پلان بناتی رہتی ہیں' ادھر احزار بھائی تو ایک دن ناراض نہیں رہ سکتے تھے تم سے۔ اب دیکھو کتنے دن ہو گئے ہیں مگر انہیں کوئی پرواہ نہیں' وہ شادی پر اڑے ہیں اور تم اپنی ضد پر' پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔"
"ضروری تو نہیں جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو' وہ آئندہ بھی کبھی نہ ہو' زندگی میں ہر سانحہ پہلے کبھی نہیں ہوا ہوتا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے' مگر تم اس بات کو زیادہ لائٹ مت لو' احزار بھائی جیسے مرد ہر لڑکی کا نصیب نہیں ہوتے' تم بہت خوش نصیب ہو' ورنہ میری مما تو انہیں اپنا داماد بنانے کے لیے' جانے کتنے پیروں' فقیروں کے پاس دھکے کھاتی رہی ہیں۔"
ایک اور چوٹ .... علیزہ کو لگا جیسے اس کا دم سینے میں گھٹنے لگا ہو۔
"دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں' قریب آؤ تو کان پھاڑتے ہیں۔"
قدرے خشک لہجے میں کہنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی' نمل لاپروائی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔
علیزہ کمرے میں آنے کے بعد خوب روئی' ایک مان کیا ٹوٹا تھا اسے لگا جیسے وہ خود بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہو۔

وہاں میں نہیں تھی۔
فقط خالی پنجرہ بدن کا پڑا تھا۔
اور نیم وا ان کواڑوں کی ہر چرچراہٹ میں
حیرانیاں بولتی تھیں
زمیں کی فضا سے کسی نے مجھے باہر دھکیلا
فلک تک میری دسترس کیوں نہیں تھی
نہ جانے میں کب تک خلاء میں بھٹکتی رہی تھی!

اس روز بہت دنوں کے بعد وہ کالج آئی تھی احزار نے جب سے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ گھر میں عجیب سی چہ میگوئیوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ خود اس کی اپنی ماں بھی اسے عجیب الجھی الجھی سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں' جیسے احزار کے اس فیصلے کے پیچھے کہیں نہ کہیں اس کا کوئی قصور ہو۔
بند کمرے میں رو رو کر تھکنے کے بعد اس روز بالآخر وہ کالج چلی آئی تھی۔ جہاں اس کی عزیز از جان دوست مدیحہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔ بریک کے بعد موقع ملتے ہی وہ مدیحہ کے گلے لگ کر رو پڑی۔
"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا علیزہ!"
اس کی پوری روداد' آنسوؤں کے ساتھ سننے کے بعد اس نے کہا تھا۔ علیزہ نے آنسو پونچھ لیے۔
"تو کیا کرتی میں' اسے اپنا آپ پیش کر دیتی؟"
"نہیں .... میں یہ نہیں کہہ رہی' بے شک احزار بھائی نے جو کیا وہ صحیح نہیں تھا' مگر تم نے بھی جو کیا ـــ وہ بھی ٹھیک نہیں ہے' تمہیں ان کو بعد میں نرمی سے سمجھانا چاہیے تھا یار' آخر کو نکاح ہوا ہے تمہارا' وہ تمہارے شوہر ہیں اور سب سے بڑی بات کہ تم ان

سے پیار کرتی ہو۔ کیا اس بات سے فرار ممکن ہے؟"

"نہیں، مگر پیار کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنی عزت اور وقار اس شخص کے پاؤں تلے روند کر رکھ دوں کوئی اپنی ہی چیز پر ڈاکہ ڈالتا ہے بھلا؟ مجھے اس کے کردار سے محبت تھی، اس کی شخصیت اور دولت سے نہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ مگر تم اس غلطی کو ایشو مت بناؤ، اگر وہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں تو ہو جانے دو شادی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہرگز نہیں وہ شخص اس طرح سے میری خواہشات کا خون نہیں کر سکتا۔"

"علیزہ پلیز... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟"

"کیا سمجھوں میں؟ میری عزت میری حرمت، خاندانی وقار، کسی کی بھی تو لاج نہیں رکھی اس نے اور تم کہتی ہو میں سمجھوں؟ اس نے ایک پل میں مجھے عرش سے فرش پر لا پٹخا ہے مدیحہ، یوں جیسے میری کوئی عزت ہی نہ ہو۔ اس پر ہٹ دھرمی دیکھو اس کی کہ اسے کوئی شرمندگی ہی نہیں ہے، معافی تلافی نام کی کوئی چیز بھی نہیں۔" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

مدیحہ نے کچھ اور لڑکیوں کے قریب چلے آنے پر اسے تسلی دے کر چپ کروا دیا۔

"او کے... تم پریشان مت ہو۔ اللہ سب ٹھیک کرنے والا ہے، چلو ابھی کچھ بیٹ پوجا کرتے ہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"تم اٹھو تو، دل بھی چاہ جائے گا۔"

وہ بضد تھی، اسے بہلانا چاہتی تھی۔ علیزہ دل نہ چاہتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

منیر صاحب کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی تھی۔ علیزہ نے کالج سے چھٹیاں لے لیں۔ ایک طرف احزار فوری رخصتی پر اڑا تھا، دوسری طرف علیزہ فوری رخصتی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان دونوں کے اسی جھگڑے کے سبب جہاں گھر کا ماحول کشیدہ ہو رہا تھا وہیں منیر صاحب کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔

ایک چھوٹی سی بات نے نہایت بڑا طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی اپنی ماں احزار کے ساتھ تھیں ان کا کہنا تھا کہ احزار کا مطالبہ ناجائز نہیں ہے، اور اسی بات کی اسے سب سے زیادہ تکلیف تھی۔ عجیب سی الجھن کا شکار ہو کر رہ گئی تھی وہ، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ پہلی بار اسے دکھ دے کر اس نے اس سے معذرت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور یہ بات کتنی زیادہ تکلیف دہ تھی کوئی علیزہ حسین سے پوچھتا!

موسم میں خنکی مزید بڑھ گئی تھی۔

وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے خاموش بیٹھی رہی تھی۔ کہاں غلطی ہوئی تھی اس سے کہ گھر میں سب نے اسے مجرم قرار دے دیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ساری بات بتا دی تھی، مگر پھر بھی وہ اس سے ناراض تھیں، کوئی بھی اس سے ڈھنگ سے بات نہیں کر رہا تھا۔

محسن چچا کی بیٹی یسری نے احزار اور اس کی ناراضی سے فائدہ اٹھانے میں قطعی تاخیر نہیں کی تھی، احزار تو قابو نہیں آیا تھا لیکن نادرہ بیگم اپنی سادگی کے باعث بہت جلد زرینہ بیگم اور یسریٰ کے جال میں پھنس گئی تھیں، تبھی انہوں نے احزار پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ اگر علیزہ رخصتی کے لیے نہیں مان رہی تو وہ اسے طلاق دے کر یسریٰ سے شادی کر لے مگر احزار نے سختی سے ان کی بات کو رد کر دیا تھا وہ کسی صورت علیزہ حسین کو آزاد کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس شام اس نے لان میں نمل اور احزار کو دیکھا تھا۔ نمل پودوں کو پانی دے رہی تھی، جب باہر سے آتے احزار نے اس کے ہاتھوں سے پائپ چھین کر اس پر پانی ڈالنا شروع کر دیا، وہ احتجاج کرتے ہوئے اسے روک رہی تھی، پائپ اس سے واپس لینے کی کوشش

کر رہی تھی، مگر وہ قابو نہیں آ رہا تھا، بے تحاشا ہنستے ہوئے وہ شاید اس بات کو بہت انجوائے کر رہا تھا۔

علیزہ کھڑکی سے پلٹ آئی۔

کمرے میں ٹھنڈک تھی مگر اس کے اندر ایک دم سے حبس بڑھ گیا تھا۔ اگلے روز شام میں وہ تیز بخار کی لپیٹ میں تھی۔ صبح سے پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا نہ ہی وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ مگر شام میں اپنے اندر کی گھٹن سے تنگ آ کر وہ باہر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی تب ہی اس نے کومل کو نمل کے پاس کچن میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"نمل! احزار بھائی کہہ رہے ہیں اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر تیار نہ ہوئیں تو وہ آئس کریم کا پروگرام کینسل کر دیں گے۔"

"اف نہیں... میں بس ابھی دو منٹ میں آ رہی ہوں۔"

نمل کی خوشی دیدنی تھی۔ علیزہ نے اپنے گھٹنے سمیٹ لیے۔ اس کا بدن بہت بری طرح سے ٹوٹ رہا تھا۔

"علیزہ... آئس کریم کھانے چلو گی؟"

کومل نے پاس سے گزرتے ہوئے یونہی اس سے پوچھ لیا۔ وہ چپ چاپ نفی میں سر ہلا گئی اگلے پانچ منٹ میں نمل کمرے سے نکل آئی تھی۔ احزار اپنا چارج پر لگا موبائل لینے اندر آیا تو ثمینہ نے اسے پکار لیا۔

"احزار..."

بنا علیزہ پر نظر ڈالے وہ انہی قدموں پر پلٹا تھا۔ "جی بڑی امی۔"

"علیزہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، بہت تیز بخار ہے، آزر جانے کب گھر آئے۔ تم باہر جا رہے ہو تو اسے بھی ڈاکٹر کے پاس لیتے جانا۔"

"نہیں امی، مجھے کہیں نہیں جانا، میں ٹھیک ہوں۔" احزار کے کچھ کہنے سے پہلے ہی علیزہ بول اٹھی تھی۔ احزار نے لب بھینچ لیے۔

"آج نمل کا برتھ ڈے ہے بڑی امی! میں پہلے ہی آفس سے لیٹ آیا ہوں۔ اب اگر ڈاکٹروں کے انتظار میں لگ گیا تو یہ چڑیل ناراض ہو جائے گی، آپ فکر نہ کریں میں آزر کو کال کر کے گھر بلواتا ہوں، وہ لے جائے گا، او کے۔"

وہ اپنی توہین کہاں نظر انداز کر سکتا تھا۔ ثمینہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں، جبکہ وہ انہیں تسلی دیتا، جلدی جلدی قدم اٹھاتا، باہر نکل گیا تھا۔

علیزہ کی آنکھ سے آنسو پھسل کر اس کے ہاتھ کی پشت پر گرا تھا۔ بہت پرانی بات نہیں تھی جب اس روز وہ لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی ٹھنڈ میں پڑھ رہی تھی اور وہ آفس سے آیا تھا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"بس یونہی، کیوں کیا ہوا؟" اس کے لہجے کی خفگی محسوس کر کے وہ مسکرائی تھی۔ جب وہ اس کے مقابل تک گیا۔

"تمہیں پتا ہے اس وقت اوس گرنی شروع ہو جاتی ہے، اور تم... تم ذرا سی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر پاتیں، ابھی بیمار پڑ جاؤ گی اور پھر... خوب جان نکالو گی میری۔"

"ڈائیلاگ تھوڑے جھاڑا کرو۔"

مزے سے اس کی ناک دبا کر وہ پھر مسکرائی تھی۔ جواب میں احزار نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"جان سے چلا جاؤں گا ناں پھر یقین کرنا میری محبت کا۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے خوشبوؤں میں بسا اپنا کوٹ بھی اس پر ڈال دیا تھا۔

"میرے لیے جان سے جانے والے نہیں ہو تم۔"

"جا بھی سکتا ہوں، قسم سے۔"

فوراً ہی گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ بے اختیار ہوا تھا اور پھر زبردستی اسے اپنے ساتھ اٹھا کر اندر لایا تھا۔

اس سے ناراض ہونے کے باوجود اماں نے اسے آزر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج کر دم لیا تھا، مگر ڈاکٹرز کے پاس بھی ہر مرض کی شفا کہاں ہوتی ہے؟

کچھ مرض بہت گہرے ہوتے ہیں جنہیں اللہ رب

العزت کی پاک ذات کے سوا اور کوئی شفا نہیں دے سکتا۔

☆ ☆ ☆

بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو' زباں کی بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے' کہاں پر بھول جانا ہے
اسے کتنا بتانا ہے' اسے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے' کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے
کہاں آواز دینی ہے' کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے' کہاں سے لوٹ آنا ہے
بڑا دشوار ہوتا ہے' ذرا سا فیصلہ کرنا!

اس روز وہ مارکیٹ سے گھر آئی تو اس نے احزار کو نرجس چچی کے پورشن میں دیکھا تھا۔ اسے یسریٰ سے تھوڑا کام تھا وہ اسی سے ملنے کی غرض سے اس طرف آئی تھی جب اس نے نرجس چچی کو کہتے سنا۔

''علیزہ کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟''

''کچھ نہیں' کیوں....؟ کچھ سوچنا تھا کیا؟''

احزار کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ چچی بے مزہ ہو گئیں۔

''تم بھی پاگل ہو احزار' کب سے رخصتی کے لیے ترلے کر رہے ہو' مگر وہ لڑکی ہے کہ مان کر نہیں دے رہی' پھر بھی تم اس کے انکار کو اہمیت نہیں دے رہے' بھئی مانو یا نہ مانو' مجھے تو یہ لڑکی کسی اور میں انٹرسٹڈ لگتی ہے' ورنہ تعلیم کوئی ایسا بہانہ نہیں ہے کہ جس کی آڑ لے کر انکار کیا جائے' تم میں کس چیز کی کمی ہے بھلا' میں تو کہتی ہوں طلاق دے کر فارغ کرو' پھر پڑھتی رہے بیٹھ کر ساری عمر....''

''نہیں بڑی امی' یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''اتنا مشکل بھی نہیں ہے' بس تمہیں اپنا دل ذرا سا مضبوط کرنے کی ضرورت ہے' لازمی نہیں ہے کہ بڑوں کا کیا فیصلہ تم ساری عمر نبھاؤ' تمہارے بڑے ابا کو بڑی خواہش تھی کہ تمہیں اپنا بیٹا بنانے کی۔'' رشتوں کے کچھ روپ بہت بھیانک ہوتے ہیں' ڈراؤنے خوابوں سے بھی زیادہ بھیانک' علیزہ حسین کے سامنے بھی اس وقت ایسا ہی ایک روپ آیا تھا۔ احزار کہہ رہا تھا۔

''میں اب بھی آپ کا بیٹا ہی ہوں بڑی امی' پلیز آپ ایسا نہ سوچا کریں۔'' احزار کے لہجے میں پھر لاپروائی تھی۔ چچی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

''ہاں بیٹے تو ہو' مگر بیٹی سے منسوب ہو جاتے تو اور بات تھی۔''

''علیزہ بھی آپ کی بیٹی ہی ہے بڑی امی' الویں دل نہ خراب کیا کریں اپنا' اچھا یہ بتائیں' کمل کہاں ہے' اس سے آج شام ڈنر کا وعدہ کیا تھا میں نے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ علیزہ کے قدم من من کے ہو گئے۔ تب ہی چچی بولی تھیں۔

''اپنے کمرے میں ہو گی اور کہاں ہونا ہے اس نے۔''

''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں' آپ کو امی بلا رہی تھیں۔''

جیسے ہی اس نے کہا تھا علیزہ فوراً الٹے پاؤں وہاں سے واپس چلی آئی تھی' اسے لگا جیسے کوئی اس کا دل نوچ رہا ہو۔ اس روز ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آ کر اس نے اپنے آنسوؤں کو کھل کر بہنے دیا تھا۔

''علیزہ.... کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟''

وہ کچن میں تھی جب ثمینہ فریج کا دروازہ کھول کر کچھ تلاش کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ علیزہ نے ہاتھ دھو کر گندھا ہوا آٹا سائیڈ پر رکھ دیا۔

''میں نے کیا کیا ہے امی؟''

''یہ بھی میں بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے؟ گھر بھر میں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے' کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا' بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ لیکن نافرمان اور سرکش ہو جائیں تو زحمت بن جاتی ہیں' فضول کی ضد لگا کر خوب صلواتیں وصول کر رہی ہو گھر کے بڑوں سے' مرے ہوئے رشتوں کی حرمت کا احساس بھی نہیں ہے تمہیں۔'' اس کی ماں

بہت نرم طبیعت کی حامل خاتون تھیں اس نے انہیں کبھی اتنے غصہ میں نہیں دیکھا تھا۔
علیزہ کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔
"میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہے امی' میں بس ابھی ذہنی طور پر اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔"
"مگر کیوں؟ جب تم اور احزار ایک دوسرے پر جان دیتے ہو تو پھر اب یہ ضد کیوں؟"
"ضد وہ کر رہا ہے امی! میں نہیں۔"
"وہ ضد کیوں کر رہا ہے؟"
"وہ مجھے جھکانا چاہتا ہے' میری حیثیت دکھانا چاہتا ہے' صرف اپنی بات منوانا چاہتا ہے بس۔"
"کیسی بات؟"
اس بار ثمینہ نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا تھا جواباً" علیزہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ساری بات بتادی۔
"تمہیں یہ بات پہلے ہی بتادینا چاہیے تھی۔"
"مجھ میں ہمت نہیں تھی امی!"
"بہر حال وہ تمہارا شوہر ہے' تمہیں خوامخواہ اس بات کو طول نہیں دینا چاہیے تھا' وہ لڑکا ہے سو گناہ معاف ہیں اسے' مگر تمہارے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے' میں اب ایک دن کے لیے بھی اس بات کو ٹالنے کے حق میں نہیں ہوں۔"
"مگر امی!"
"کوئی اگر مگر نہیں' تم جانتی ہو جو کچھ اس گھر میں ہو رہا ہے' اوپر سے باپ بھی سر پر نہیں ہے تمہارے جو تمہارے حق میں آواز اٹھا سکے' دادا کی حالت سے بھی انجان نہیں ہو تم' میں رخصتی کی تاریخ طے کر رہی ہوں' تمہیں جو کرنا ہے کرلو۔"
حتمی انداز میں بات مکمل کرتے ہوئے وہ پھر کچن میں ٹھہری نہیں تھیں۔ علیزہ بے بس سی گہری سانس بھر کر رہ گئی!
احزار کے ننھیال میں شادی تھی مگر وہ نہیں گیا تھا۔ سر میں شدید درد اور زکام نے اسے جیسے نڈھال کر دیا تھا' تاہم اس کی باقی فیملی اور نرجس چچی اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھیں' نرجس چچی کو تو ویسے بھی تقریبات میں شمولیت کا موقع چاہیے ہوتا تھا تاکہ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے اچھے گھرانوں کے لڑکے اپنی نظر میں رکھ سکیں۔ منیر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا علیزہ نے بھی جانے سے معذرت کرلی' اس کی وجہ سے مسز حسین بھی گھر پر ہی رک گئی تھیں۔
وہ اپنے کمرے میں تھیں جب علیزہ دلیہ بنا کر اپنے دادا جی کے کمرے میں چلی آئی' ان کے چہرے پر اس وقت عجیب سی تکلیف کے آثار تھے۔ وہ دلیے کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے قریب چلی آئی تھی۔
"دادا جی۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"
"ہوں۔۔۔" ایک پل کے لیے آنکھیں کھول کر انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اور پھر پلکیں موند لیں۔
"احزار کہاں ہے؟" کچھ دیر بعد قدرے دھیمے لہجے میں انہوں نے پوچھا تھا۔
"وہ۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں ہے دادا جی' ابھی گھر آیا ہے۔"
"اسے میرے پاس بلا کر لاؤ' کہو دادا جی بلا رہے ہیں۔" پلکیں موندے انہوں نے حکم جاری کیا تھا۔
علیزہ مشکل میں پڑ گئی۔
"دادا جی' وہ شاید سو رہا ہے' آپ مجھے بتادیں کیا کام ہے؟"
"تم نہیں۔۔۔ اسے بلا کر لاؤ ابھی۔"
اسے لگا جیسے وہ بہت مشکل سے بول پار ہے ہوں۔ علیزہ عجیب سی کشمکش کی شکار سر ہلا کر کمرے سے نکل آئی۔
احزار حسن کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ وہ اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی' تاکہ اسے مخاطب کرتا' مگر دادا جی کی طبیعت کے پیش نظر وہ مجبور ہو گئی تھی۔
احزار کا کمرا لاک نہیں تھا' دروازے کے ہینڈل پر ذرا سا دباؤ ڈالنے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہو گئی تھی

سامنے ہی وہ کمبل میں لپٹا سو رہا تھا۔ سامنے ٹیلی وژن کی اسکرین پر کوئی انگلش مووی لگی تھی۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب چلی آئی تھی۔

"احزار......"

وہ جو تکیہ بانہوں میں دبائے 'بائیں کروٹ پر بے خبر سو رہا تھا۔ ٹس سے مس تک نہ ہوا' تب دوسری اور تیسری بار بھی بلند آواز سے پکار کر دیکھ لیا' مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں' ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا مرجھایا مرجھایا سا چہرہ' اس کے اندر کی بے سکونی کا پتا دے رہا تھا۔

"احزار....؟" تیسری اور چوتھی بار پکارنے کے بعد بالآخر مجبور ہو کر اس نے اس کا بازو ہلایا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہوں بولو... کیا بات ہے؟"

وہ بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"تم بہت فضول شخص ہو احزار' مجھ سے غلطی ہوئی جو دادا جی کے حکم پر تم جیسے اسٹوپڈ انسان کو بلانے چلی آئی۔"

"بکواس بند کرو' بیوی ہو تم میری' یہ میرا حق ہے۔"

ایک دم سے گرفت ڈھیلی کر کے وہ خود بھی بستر سے نکل آیا۔ علیزہ معطل حواس کے ساتھ فوراً" سے پیشتر اس کے کمرے سے نکلی تھی۔ وہ دادا جی کے کمرے میں آئی تو احزار بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ تب ہی وہ وہاں سے بھی نکل آئی تھی مگر کمرے کی کھڑکی سے اس نے دیکھا تھا کہ دادا جی احزار کا ہاتھ تھامے بہت مشکل سے اسے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ اثبات میں سر ہلاتا بار بار ان کے ہاتھ تھپتھپاتا ہوا جیسے انہیں کچھ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے جھک کر دادا جی کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔

علیزہ کھڑکی سے پلٹ کر کچن میں آ گئی۔

جانے دادا جی اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس شخص سے کون سے راز و نیاز کر رہے تھے۔ اس نے فریج سے سبزی نکالی اور کاٹنے بیٹھ گئی' تبھی وہ کچن میں آیا تھا۔

"تمل اور یسریٰ لوگ نظر نہیں آ رہیں' کیا وہ بھی تائی ماں کے ساتھ گئی ہیں۔" اس کے کندھے سے کندھا ملا کر وہ عین برابر میں آ بیٹھا تھا۔ علیزہ خاموش رہی۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے؟"

"مجھے نہیں پتا' میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں؟"

"کیوں؟"

"یہ تمہیں پتا ہو گا کہ کیوں؟"

اس کی آنکھوں میں غصہ تھا' احزار دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں کر رہی ہو ایسا؟"

"میں کچھ نہیں کر رہی' تم جاؤ یہاں سے۔"

"تم پہلے ایسی نہیں تھیں علیزہ؟"

"تم بھی ایسے نہیں تھے پہلے۔"

"کیوں کون سی تبدیلی دیکھ لی ہے تم نے مجھ میں؟"

وہ بات سے بات نکال رہا تھا۔ علیزہ جھنجلا گئی۔

"احزار پلیز' تم جاؤ یہاں سے' مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"مگر کیوں' ایسا کیا جرم کر دیا ہے میں نے' جو ابھی تک تمہارا دل صاف نہیں ہوا۔ میرے دوست کی صرف منگنی ہوئی ہے مگر اس کی منگیتر خود کال کر کے اسے بلاتی ہے۔ اور ایک میں ہوں جس کی شرعی اور قانونی بیوی اسے قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔"

وہ اسی بات پر اڑا تھا۔ علیزہ جو اس سے احساس ندامت کی توقع کر رہی تھی مزید تپ اٹھی۔

"بڑا فخر ہے تمہیں اپنے دوست اور اس کی منگیتر پر؟ جہنم کی آگ بھر رہے ہیں اپنے دامن میں' خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں وہ' اپنے ماں باپ کو نہیں' مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں' کیونکہ میرا ایمان اور ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے' بے حد بے تحاشا' یہ بھی سچ ہے کہ تم میرے وجود پر پورا پورا حق رکھتے ہو۔

کیونکہ میں تمہارے نکاح میں ہوں مگر..... یہ حق ابھی میری ماں نے تمہارے سپرد نہیں کیا ہے' میں نہیں چاہتی کہ کل کو میری ماں جب مجھے تمہارے ساتھ رخصت کرے تو اس کے پیچھے ان کی کوئی مجبوری ہو ان کی نظریں ندامت اور شرم سے جھکی ہوئی ہوں اور تم ... تم تمہارے دل میں میرے لیے کوئی شوق نہ ہو۔"

احزار کے شکوے پر وہ اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"ایم سوری احزار! میں کوئی ٹین ایجر نہیں ہوں لیکن میں تمہاری زندگی میں پوری روایتوں اور بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ آنا چاہتی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے' پھر رخصتی کروا لیتے ہیں' کیوں نہیں مان رہی ہو تم۔"

"صرف چند ماہ کی مہلت مانگی ہے میں نے۔"

"میں چند ماہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"مجھے تم پر بہت مان تھا احزار۔"

"مجھے بھی بہت مان تھا تم پر' تم نے لاج رکھی میرے مان کی؟ جب سے وہ بات ہوئی ہے پاس بیٹھنا تک چھوڑ دیا ہے تم نے' کہاں وہ آگے پیچھے پھرنا' میری ہر ضرورت کا خیال رکھنا' ذرا سی طبیعت خراب ہونے پر رات رات بھر جاگنا' میں نے سفر پر جانا تو نوافل پڑھ پڑھ کر میری سلامتی کی دعائیں مانگنا' گھر واپسی پر لیٹ ہو جانا تو نیند کو پس پشت ڈال کر صرف میرے لیے جاگنا' کیا تھا وہ سب؟"

وہ جذباتی ہوا تھا۔ علیزہ کی آنکھوں سے دو آنسو ایک ساتھ ٹپک پڑے۔

"محبت!" بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں سر جھکا کر جواب دیا تھا اس نے۔

"کیا اب محبت نہیں رہی؟"

"نہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں!"

"ٹھیک ہے' نمل آئے تو اسے کہنا' ایک کپ چائے بنا کر میرے کمرے میں بھیج دے۔"

علیزہ کے رخ پھیرنے پر لب بھینچتے ہوئے اس نے کہا تھا اور اگلے ہی پل کچن سے نکل گیا۔ علیزہ کتنی ہی دیر جامد دماغ اور کھٹی ہوئی سوچوں کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

احزار کا کینیڈا کے لیے ویزہ او کے ہو گیا تھا' نہ صرف ویزہ آ گیا تھا بلکہ اس کی سیٹ بھی کنفرم ہو گئی تھی۔

موسم بدل رہا تھا۔ گھر میں یسریٰ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ احزار کے ننھیال سے ہی اس کے لیے رشتہ آ گیا تھا اور مسز محسن کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ خود یسریٰ بھی سارے دن ہواؤں میں اڑتی محسوس ہوتی تھی۔

علیزہ کے پیپرز قریب تھے مگر اس کے باوجود مسز حسین نے اس کی رخصتی طے کر دی تھی۔ اپنے کمرے سے احزار عبدالہادی کے کمرے تک کا سفر اس کے لیے کسی پل صراط سے کم نہیں تھا' منیر صاحب' حسن صاحب' اس کی ماں سب خوش تھے' مگر وہ چپ تھی' احزار عبدالہادی کی ضد نے جیسے اسے اندر سے تکلیف پہنچائی تھی' مگر اس تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف اسے اس وقت ہوئی' جب وہ کمرے میں آیا' چپ چپ سا بے حد نڈھال' وہ کمرا لاک کرنے کے بعد بہت خاموشی سے اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"کیسی ہو؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد بہت بوجھل سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جب علیزہ نے خود ہی گھونگھٹ اٹھا دیا۔

"ایک ہارا ہوا انسان کیسا ہو سکتا ہے؟"

"تم ہاری نہیں ہو' ہار وہ ہوتی ہے جب کسی چاہنے والے کو دھتکار دیا جائے' دیکھو کتنی خوب صورت لگ رہی ہو تم اس وقت ——— یہ چوڑیاں' یہ سنگھار' یہ سب میرے لیے ہے ناں؟"

علیزہ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے وہ جس انداز میں بات کر رہا تھا' علیزہ کا دل ایک انجانے سے خوف

سے دھڑک اٹھا۔

"پتا نہیں تم واقعی اتنی خوب صورت ہو یا صرف مجھے لگتی ہو' مگر یہ سچ ہے علیزہ' میں نے تمہارے سوا کسی کو اپنے دل کا پتا نہیں دیا۔"

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر اس کی آواز گونجی تھی۔

"دیکھو' تمہاری ماں نے آج تمہیں پورے فخر اور مان سے رخصت کر کے میرے حوالے کیا ہے' اور میں تمہیں پوری روایتوں کے ساتھ دنیا کے سامنے اپنا بنا کر لایا ہوں مگر۔"

بہت بوجھل لہجے میں بولتے بولتے ایک دم سے وہ رکا تھا جب علیزہ نے فوراً" سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مگر۔۔۔؟"

"مگر اب وہ دل رہا ہے نہ دل کی خواہش۔"

وہ سنجیدہ تھا۔ علیزہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ ڈالا۔ اس کی آنکھیں ساکت رہ گئی تھیں' مگر احزار نے پروا نہیں کی' بنا اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کیے' وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ علیزہ پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی احزار اور اس کے بیچ اتنے فاصلے بھی بڑھ جائیں گے کہ دونوں ایک ہی بستر پر ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے صدیوں کی مسافت پر ملیں گے۔

اگلے روز رات دو بجے احزار کی فلائیٹ تھی۔ علیزہ کمرے سے ہی نہیں نکلی' اس کا دل جیسے پھٹ رہا تھا' اس وقت اس میں کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی' نہ دادا جی کا' نہ اپنی ماں کا' نہ نرجس چچی اور ان کی بیٹیوں کا' سردی کی بڑھتی ہوئی شدت نے جیسے اس کے احساسات منجمد کر دیے تھے۔

احزار عبدالہادی جیسے شخص کو سمجھنا بھلا اتنا آسان کہاں تھا؟

کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے چپکے سے کوئی بات کہی ہو جیسے
ایک لمحے میں سمٹ آیا ہے صدیوں کا سفر
زندگی تیز ۔۔۔ بہت تیز چلی ہو جیسے۔۔۔

یسریٰ کے رشتے کی بات فائنل ہو گئی تھی اور اب زرینہ بیگم کی خواہش تھی کہ منیر صاحب کی زندگی میں ہی یسریٰ بھی اپنے گھر رخصت ہو جائے' تاکہ دادا کی طرف سے جو کچھ علیزہ کو ملا وہ یسریٰ کو بھی ملے۔

احزار کو کینیڈا گئے چار ماہ ہونے کو آئے تھے اور ان چار ماہ میں ایک بار بھی اس نے علیزہ سے کھل کر بات نہیں کی تھی۔ سیل فون اور اسکائپ دونوں پر وہ صرف اپنی ماں' دادا یا یسریٰ' نمل لوگوں سے زیادہ بات کرتا تھا' علیزہ پاس بیٹھی منتظر رہتی کہ وہ اسے بلائے گا۔ مگر ہر بار اس کا یہ گمان دکھ میں بدل جاتا تھا۔

اس کی چپ اور اداسی کو دیکھتے ہوئے مسز حسین نے اسے دوبارہ کالج جوائن کرنے کی اجازت دی تھی۔ مگر عجیب بے کلی تھی کہ اب کالج میں بھی دل نہیں لگتا تھا' جتنا وہ احزار کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی تھی' اتنا ہی وہ اور اس کی یادیں اس کی سوچ کے دریچوں میں در آتی تھیں۔ ادھر سے آج کل یہ سننے میں آ رہا تھا کہ احزار نے کینیڈا میں کسی انڈین مسلمان لڑکی سے فرینڈ شپ کر لی ہے اور دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہیں' گھر بھر میں یہ خبر پھیلانے والی نمل تھی' جبکہ اسے ہنسی میں اڑا کر مشکوک کرنے والا خود احزار حسن تھا۔

علیزہ حسن کے اندر جیسے کوئی الاؤ دہکنے لگا' جس میں اس کی ایک ایک سانس جل رہی تھی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اس شخص نے اسے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ مگر وہاں اس کا درد سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

نمل نے احزار کے بعد اب آزر میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی' اور یہاں اسے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ آزر نے نہ صرف اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا تھا' بلکہ اپنی ماں سے کہہ کر بات بھی پکی کروالی تھی۔ جس پر زرینہ بیگم کا سالوں پرانا غصہ قدرے کم ہوا تھا۔

علیزہ کی رخصتی کی طرح یسریٰ کی شادی کا معاملہ

بھی چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق طے ہو گیا تھا۔ یسریٰ کا میاں کافی سال دوبئی میں رہنے کے بعد اب پاکستان میں سیٹل ہو گیا تھا۔ بہن بھائی سب شادی شدہ تھے اور ماں باپ کی رحلت ہو چکی تھی، نرجس بیگم کو وہی یسریٰ کے قابل لگا تھا کیونکہ یسریٰ کے مزاج میں بہت ترشی تھی۔

علیزہ کو یسریٰ کا شوہر زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ احزار نے بھی اس شادی میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ تاہم اس نے کینیڈا سے اسے بہت قیمتی تحائف بھجوا دیے تھے۔ ایک بات جو علیزہ نے محسوس کی تھی۔ وہ یسریٰ کے شوہر کاشف کے کردار کی کمزوری تھی، یسریٰ سے زیادہ وہ نمل اور کومل کی کمپنی کو انجوائے کرتا تھا۔ علیزہ کے ساتھ بھی اس نے ایک دو بار ضرورت سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزہ نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ وہ جتنا خوش شکل تھا اتنا ہی عاشق مزاج اور ڈیشنگ تھا۔

یسریٰ شادی کے بعد تقریباً" روز ہی ادھر پڑاؤ ڈالے رکھتی تھی، تبھی اس کا شوہر علیزہ کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا، کبھی کچن میں، کبھی چھت پر، کبھی کمرے میں، جہاں اکیلا پایا تا گھیر لیتا، وہ اس کی حرکتوں سے سخت عاجز تھی۔ مگر دادا جی کے علاوہ اور کسی سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اگر اس نے اس بارے میں کسی سے کچھ کہا تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا، سب اسے ہی موردالزام ٹھہرائیں گے۔

اس روز وہ کالج سے گھر آئی تو سب لاؤنج میں ہی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ کاشف بھی وہیں موجود تھا۔ وہ سب کو سلام کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی، تبھی اس نے کاشف کی آواز سنی تھی۔

"یسریٰ یار، تم لوگ اس لڑکی کو اس کے شوہر کے پاس کیوں نہیں بھجوا دیتے، آج کل زمانہ نہیں ہے، یوں شادی شدہ جوان لڑکیوں کو اکیلے گھر سے باہر بھیجنے کا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ یہ تو ہمیشہ سے اکیلی ہی جاتی ہے کالج۔" یسریٰ کی آواز آئی تھی۔ علیزہ کے ہاتھ دوپٹہ اتارتے اتارتے رک گئے۔

"ہوں، پھر تو یقیناً" خوب آگے چلی گئی ہو گی کہانی۔"

"کیسی کہانی؟"

"بھئی، یہ تو تم اپنی کزن سے ہی پوچھو، آج مارکیٹ میں کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے۔"

"کیا؟"

"جی ہاں، میری بات کا یقین نہیں تو بے شک بلا کر پوچھ لیں، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔" وہ جتنی ڈھٹائی اور اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ ثمینہ کے دل پر جیسے بجلیاں سی گر پڑی تھیں۔ تب ہی علیزہ شدید غصے میں اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔

"کاشف بھائی! خدا کا خوف کریں میں وہاں اکیلی نہیں تھی میری دوست بھی ساتھ تھی۔"

"میں نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"بکواس بند کرواپنی، میرے داماد کو کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی، اس نے جو دیکھا بتا دیا، پہلے کبھی نہیں بولا یہ جھوٹ، بتاؤ....."

"صحیح کہہ رہی ہیں امی، ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔" ماں کے چمک کر بولنے پر یسریٰ کا پارہ بھی ہائی ہوا تھا۔ علیزہ کٹ کر رہ گئی۔

"یہ جھوٹ بول رہے ہیں میں وہاں اپنی دوست کے ساتھ گئی تھی کیونکہ ہمیں اپنی ایک دوست کے لیے گفٹ خریدنا تھا اور میری دوست کے بھائی نے ہمیں کالج سے پک کر کے بازار ڈراپ کر دیا۔"

"تمہیں ضرورت کیا تھی کالج سے بازار جانے کی، وہ بھی گھر والوں کو بتائے بغیر۔" یہ سوال ثمینہ کی طرف سے تھا۔ علیزہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دوست اصرار کر رہی تھی امی، اچانک پروگرام بن گیا تھا۔"

"شریف گھرانوں کی لڑکیاں یوں دوستوں کے

اصرار پر اچانک پروگرام بنا کر کہیں بھی نہیں نکل جاتیں' خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا' ہم تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہتے۔"

زرینہ بیگم پھر چمکی تھیں۔ مسز حسین نے دکھ سے منہ پھیرلیا۔

"میں کسی کے ساتھ گھر سے بھاگی نہیں تھی چچی' جو آپ کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہتیں۔"

"یہی حالات رہے تو بھاگ بھی جاؤ گی ایک دن' ہونہہ یہ تم جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو ماؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر' ان کی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر' روز نئے چاند سورج چڑھاتی ہیں اور ان کی بے خبر ماؤں کو پتا تک نہیں چلتا' شوہر تو جان چھڑا کر بھاگ گیا۔ آج گھر کے داماد نے دیکھا ہے' کل کو لوگ دیکھ کر باتیں کریں گے پھر کیا جواب دیں گے انہیں بتاؤ۔"

علیزہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"جن کے اپنے آگے بیٹیاں ہوں' وہ کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسی بات نہیں کرتے چچی.....

"بکو اس بند کرو' تم جیسی بیٹیاں پیدا کرنے سے بہتر ہے بندہ ساری عمر بانجھ رہے۔" ان کی زبان کے آگے خندق تھی۔ کاشف سر جھکائے زیر لب مسکراتا رہا۔

"اباجی کو بھی جانے کیا ہو گیا تھا لے کر ضد ہی پکڑلی' ورنہ اللہ جانتا ہے میں ایک فیصد بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھی' باپ کا سایہ سر پر نہ ہو تو اولاد یونہی خود سر ہو کر رہ جاتی ہے' ماشاء اللہ پڑھا لکھا خوب صورت بیٹا ہے میرا' کس چیز کی کمی تھی اس میں جو مجھے اس کے لیے کوئی اچھے خاندان کی مال دار لڑکی نہ ملتی' اللہ معاف کرے بہت بڑی زیادتی کی ہے اباجی نے ہمارے ساتھ۔"

نادرہ جواب تک خاموش بیٹھی تھیں اس بار سنگ باری میں انہوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔ علیزہ کو لگا جیسے کسی نے ڈھیر سارے کانچ اس کے اندر اتار دیے ہوں۔ لفظوں کے دانت کتنے نوکیلے ہوتے ہیں یہ علیزہ حسین نے اس وقت جانا تھا۔ اسی روز اسے یہ پتا چلا تھا کہ گھر میں بزرگ' بوڑھے سایہ دار درخت کی مانند ہوتے ہیں جن سے امن کی فاختاؤں کی وابستگی ہمیشہ رہتی ہے' یہ پیڑ جب کٹ جاتے ہیں تو امن کی فاختائیں بھی اڑ جاتی ہیں اس کے گھر میں بھی یہی ہو رہا تھا۔

اس وقت وہ کسی گناہ گار مجرم کی طرح ہر الزام پر خاموش سر جھکائے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی تھی۔ ساس کو ماں کے برابر درجہ دیا جاتا ہے۔ مگر اس وقت اس ماں نے اس کا نازک سا دل ادھیڑ ڈالا تھا۔ ان دو عورتوں کے بیچ اس کی اپنی ماں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تھی۔ اس ماں کے پاس شاید اس وقت اپنی پارسا بیٹی کے حق میں کچھ کہنے کے لیے تھا بھی نہیں۔ جبکہ اپنے کمرے میں چت لیٹے منیر صاحب نے اپنی آنکھیں اذیت سے بند کرلی تھیں۔

✡ ✡ ✡

اس روز موسم بہت سرد تھا' اوپر سے بارش کا بھی امکان تھا۔

دیر تک کچن میں رات کا کھانا تیار کرنے کے سبب وہ اوپر چھت پر پھیلائے کپڑوں کو بھول ہی گئی۔ مسز حسین پچھلے تین روز سے تیز بخار میں پھنک رہی تھیں' جبکہ داداجی کی طبیعت بھی خطرناک حد تک خراب تھی۔ اتنی زیادہ ٹینشن میں علیزہ کو کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔

کھانا لگ گیا تھا اور سب نے کھا بھی لیا تھا' تبھی بارش شروع ہو گئی تو وہ کچن سمیٹنے کے بعد اوپر چھت پر چلی آئی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں کاشف ہو گا۔ کیونکہ لیپری کے مطابق وہ واک کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا' تبھی وہ بے خوف اوپر چلی آئی تھی' مگر اوپر پہنچ کر جیسے ہی اس نے جلدی جلدی کپڑے تار سے اتارنے کی کوشش کی' وہ ٹیرس کی طرف سے نکل کر اس کے عین پیچھے آکھڑا ہوا۔

"کپڑوں کی اتنی فکر' اور انسانوں کا کوئی خیال ہی نہیں' واہ۔"

وہ پلٹی تھی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کاشف

اس کے عین پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ باقی کے کپڑے تار پر ہی چھوڑ کر تیزی سے پلٹی تھی مگر اس نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے 'میں کوئی کھا تو نہیں رہا تمہیں۔ دیکھو کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ چلو ٹیرس پر چلتے ہیں 'تھوڑی سی انجوائے منٹ ہو جائے گی۔"

"شٹ اپ!" علیزہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا مگر کاشف نے پروا نہیں کی۔

"تم غلط کیوں سمجھتی ہو مجھے 'قسم سے میں تمہیں پسند کرتا ہوں علیزہ 'دل سے قدر کرتا ہوں تمہاری 'کیوں بندھی ہو اس شخص کے نام کے ساتھ 'جو تم جیسی پیاری 'حسین و جمیل لڑکی کے قابل ہی نہیں ہے۔" لگاوٹ سے کہنے کے ساتھ ہی اس نے علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ جب بے ساختگی میں اس نے فوراً" اس کے گال پر زور دار تھپڑ جڑ دیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔"

"چھوڑ دوں گا 'مگر اس تھپڑ کا بدلا چکانے کے بعد۔"

وہ مرد تھا اور اب اسے اپنی اصلیت دکھا رہا تھا۔ علیزہ نے بات بگڑنے کے ڈر سے چیخنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ صرف اس سے بچنے اور خود کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب یسری نے سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑے اسے کاشف کے اوپر جھکے دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔ پل کی پل میں سارا گھر وہاں چھت پر جمع ہو گیا تھا 'کسی کو بھی جیسے اپنے بھیگنے کی پروا نہیں تھی۔ کاشف نے جو یسری کو چیختے ہوئے دیکھا تو فوراً" علیزہ کو چھوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"میں یہاں اس گھر میں اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتا یسری! یہ لڑکی شوہر کی جدائی میں پاگل ہو رہی ہے۔"

کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے بجائے شرمندہ ہونے یا گھبرانے کے وہ الٹا یسری پر چڑھ دوڑا تھا۔ جواب میں وہ علیزہ پر ٹوٹ پڑی۔

"گھٹیا 'بے غیرت 'ذلیل لڑکی 'کوئی حیا نام کی چیز ہے تم میں کہ نہیں۔"

"گھٹیا 'بے غیرت 'ذلیل تمہارا شوہر ہے 'میں نہیں۔ ایسے کیوں نکیل ڈال کر نہیں رکھتیں تم۔" یسری کے تھپڑ کے جواب میں وہ چلائی تھی جب کاشف نے آگے بڑھ کر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔

"حد ہوتی ہے بے غیرتی اور ڈھٹائی کی 'اس سے پوچھو یسری 'جب اسے پتا تھا کہ میں اوپر ٹیرس پر ٹہلنے کے لیے آیا ہوں تو یہ اتنی بارش میں یہاں میرے پیچھے کیوں آئی؟ کیوں زبردستی روکا ہوا تھا اس نے مجھے؟ اس سے پوچھو اس نے مجھے کیوں کہا کہ میں تمہیں طلاق دے کر اس سے شادی کر لوں 'کیوں کہا اس نے مجھ سے کہ میں اسے اچھا لگتا ہوں 'احزار سے زیادہ خوب صورت لگتا ہوں۔"

وہ کتنا بڑا مکار اداکار تھا۔ علیزہ کو حقیقتاً" اس وقت اندازہ ہوا تھا۔ تبھی وہ گھبرا گئی تھی۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے یسری! مجھے قطعی خبر نہیں تھی کہ یہ اوپر چھت پر موجود ہے۔ میں تو صرف یہ کپڑے اتارنے آئی تھی۔"

"ہاں کپڑے ہی تو اتارنے آئی تھیں تم 'مگر میں نے تمہیں کامیاب نہیں ہونے دیا 'دادا جی کے بار بار بلانے پر یہاں تمہیں دیکھنے اوپر چھت پر چلی آئی۔"

جتنا زہر اس کے شوہر کے جھوٹ میں تھا اس سے کہیں زیادہ خاردار اس کے اپنے الفاظ تھے۔ نرجس چچی نے جو یہ تماشہ دیکھا تو آگے بڑھ کر پے در پے کئی تھپڑ اسے رسید کر دیے۔

علیزہ سچ بتانا چاہتی تھی مگر منہ پر پڑنے والے پے در پے تھپڑوں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا 'وہ اسی وقت اسے اس کے لمبے بالوں سے کھینچتی چھت سے نیچے لائی تھیں۔ کاشف کے بیان میں کوئی جھول نہیں تھا 'علیزہ پر فرد جرم عائد ہو گئی۔

صحن کے ٹھنڈے فرش پر بے حس و حرکت وہ اکیلی بیٹھی سب کے کوسنے بھی سن رہی تھی اور مار بھی کھا

رہی تھی۔ اس کا سر ایک مرتبہ پھر قطعی بے گناہ ہوتے ہوئے مجرم کی طرح جھکا ہوا تھا جبکہ اس کے ارد گرد کھڑے لوگ اس پر لفظوں کی جوتیاں برسا رہے تھے۔

"ایک نمبر کی بے غیرت لڑکی ہے یہ امی! اتنا بھی خیال نہیں کہ کاشف اس کا بہنوئی ہے۔"

سرخ آنکھوں کے ساتھ روتے ہوئے یسری اس پر چلا رہی تھی اور وہ پتھر بنی بیٹھی تھی۔

"میں بھی کہوں میرا بچہ کیوں رخصتی کی ضد کر رہا تھا اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ گھر کی عزت بچانا چاہتا تھا مگر کامیاب نہیں ہوا اسی لیے چھوڑ کر چلا گیا اسے ہائے حسن کیسے ابا جی نے میرے چاند سے بیٹے کی زندگی برباد کر دی آپ ابھی فون کریں اسے اور کہیں کہ وہ ابھی فون پر طلاق دے اسے۔"

زرینہ بھی پیچھے نہیں رہی تھیں جبکہ محسن صاحب اور حسن صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ تیز بخار میں جلتی ثمینہ نے سب کے تبصرے سنے تھے۔ اور پھر خوب مارا تھا اسے۔

اسے لگا وہ اب زندگی میں کبھی سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی گردن ایک انجانے سے بوجھ کے احساس سے جیسے ٹوٹتی جا رہی تھی۔

آزر اس کی ماں کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کندھوں سے پکڑ کر کمرے میں لے گیا تھا۔ کاشف یسری کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ محسن صاحب اور حسن صاحب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کشادہ صحن کے بیچ وہ اکیلی بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ تیز بارش نے بھی اسے وہاں سے اٹھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

اس کے ذہن میں اس وقت جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔

"ایک نمبر کی بے غیرت لڑکی ہے یہ امی! اس نے یہ بھی نہیں سوچا کاشف اس کا بہنوئی ہے۔" یہ یسری کی آواز اور لفظوں کے کوڑے تھے جو اس کی روح پر پڑے تھے "فوراً" ہی ان کوڑوں کا انداز بدلا تھا۔

"میں بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے گھر بھر میں ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا بیٹی رحمت ہوتی ہے لیکن تم زحمت بن گئی ہو میرے لیے۔"

اس کی روح پر یہ کوڑے برسانے والی اس کی اپنی ماں تھی اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"علیزہ میں جانتا ہوں تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی ہے وہ بچپن تھا جس میں میرے کسی اور کے ساتھ کھیلنے پر تم بھاگی ہوئی آتی تھیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھیں "میلا اے" اب شاید ایسا نہیں ہے۔"

یہ آواز احزار عبدالهادی کی تھی اس کے احزار کی جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا جو اس کے دل کی اولین خواہش اور اس کا پہلا خواب تھا مگر .... اس کے کردار اور ایمان کی مضبوطی نے اس شخص کو بھی اس سے دور کر دیا تھا اور اب .... وہ گری تھی تو ایک ایسے شخص کی وجہ سے جسے وہ اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔

بارش تھمی تھی جب وہ اٹھ کر منیر صاحب کے کمرے میں آئی تھی تھر تھر سردی سے کانپتی وہ سو رہے تھے علیزہ نڈھال سی ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا دادا جی خدا کی قسم یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" مگر وہاں اس کی پکار اور اس کا رونا سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پرہیزگار مشفق جان لٹانے والے دادا جی ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر کب کی پلکیں موند چکے تھے شاید وہ اتنا ہی برداشت کر سکتے تھے۔ علیزہ کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

"دادا جی!"

اس نے آواز دی مگر منیر صاحب نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ اس کے ہر دکھ پر تڑپ جانے والی وہ ہستی پہلی بار بے سدھ گہری نیند سوئی رہی تھی۔ تبھی وہ چلا اٹھی۔

"دادا جی پلیز آنکھیں کھولیں۔"

اور آزر جو ابھی ابھی مسز حسین کے کمرے سے نکلا تھا لپک کر فوراً وہاں چلا آیا۔

"کیا ہوا؟"

"پتا نہیں، پلیز دادا جی کو دیکھو' یہ آنکھیں نہیں کھول رہے ہیں۔"

"تم ہٹو پیچھے' میں دیکھتا ہوں۔"

وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ دونوں انہیں ہسپتال لے آئے تھے۔ پیچھے حسن صاحب اور محسن صاحب بھی آ گئے' عجیب قیامت کی رات تھی کہ اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بھیگے کپڑوں کے ساتھ' ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پر' بنا کسی گرم شال کے سودائیوں کی طرح بیٹھی وہ روئے جا رہی تھی کہ پچھلے چند دنوں میں اس نے اتنا کچھ کھویا تھا کہ اس میں اب مزید کچھ کھونے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

صرف ایک رشتہ ہی تو باقی بچا تھا اس کے پاس جینے کے لیے اور اب وہ رشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹتا دکھائی دے رہا تھا۔

اگلی صبح اپنے ساتھ نئے طوفان لے کر حاضر ہوئی تھی۔

گزشتہ رات علیزہ حسین کی زندگی کے سب سے پیارے رشتے نے' اسے ہمیشہ تنہا رونے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں سب لوگ رو رہے تھے۔ منیر صاحب سے اپنی اپنی محبت اور تعلق کا اظہار کر رہے تھے مگر وہ خاموش تھی۔ یوں جیسے اس کی خوب صورت آنکھوں کی جھیلیں خشک ہو گئی ہوں۔

تدفین سے قبل احزار حسن بھی پاکستان پہنچ گیا۔ گھر کی خواتین میں ایک طرف سر جھکائے بیٹھی علیزہ حسین کو اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہو سکی تھی' سوئم والے روز جب وہ تیز بخار میں سوگواری سی صوفے پر پاؤں سمیٹے بیٹھی تھی اس نے نرجس چچی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

"اب تو ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے سینے میں۔ لے لی ابا جی کی جان۔ اب کر لینا عیاشی جی بھر کر۔"

"ہوش سے کام لیں بھابھی' یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔" زرینہ جو قریب ہی بیٹھی تھیں۔ فوراً بولی تھیں مگر نرجس نے پروا نہیں کی۔

"کیوں ہوش سے کام لوں' دنیا کو پتا تو چلے اس کے کرتوتوں کا' صرف اسی کی وجہ سے ابا جی کی جان گئی ہے۔"

"پھر بھی ہمارے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔"

"آپ رکھیں اسے عزت بنا کر' ہم تو اب اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رہیں گے' ہونہہ آئی بڑی گھر کی عزت......"

ان کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔ علیزہ پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی اب اسے اس گھر کی عزت نہیں رہنے دیا جائے گا۔ وہ ایک شخص جو اس کے دل کی اولین خواہش اور اس کا پہلا خواب تھا' اس شخص کو اب اس کے سکھ اور دکھ کا ساتھی بھی نہیں رہنے دیا جائے گا۔

ابھی تک اس نے احزار حسن کا سامنا نہیں کیا تھا مگر پھر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ شخص اب اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ اسے اپنی عزت اور اپنے رشتے علیزہ حسین سے زیادہ پیارے تھے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی جب شام میں سب احزار کو گھیر کر گویا عدالت لگا کر بیٹھے تھے۔ زرینہ اور نرجس چچی نے ایک ایک بات خوب بڑھا چڑھا کر پیش کی تھی' جبکہ اس کی اپنی ماں تاحال خاموش کھڑی تھیں' شاید انہیں اس گھر میں رہنا تھا' شوہر اور سسر کے بعد بیٹی کی حمایت میں بول کر وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے دربدر ہونا نہیں چاہتی تھیں تب ہی خاموش تھیں۔ مگر یسری' نمل اور باقی لوگ خاموش نہیں تھے۔ احزار سر جھکائے سب کی باتیں سن رہا تھا جب زرینہ نے اس سے کہا۔

"علیزہ اب ہماری بہو رہنے کے قابل نہیں ہے احزار' بہتر ہے تم اسے ابھی طلاق دے کر فارغ کر دو' میں اب مزید کوئی تماشا دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

علیزہ کی آنکھوں سے آنسو موتی کی لڑیوں کی طرح ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

"علمزہ جیسی لڑکیاں کسی ایک کی ہو کر رہ ہی نہیں سکتیں۔ یہ کبھی بھی تمہاری وفادار نہیں ہو سکتی۔"
نرجس نے نفرت سے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

"بس بڑی امی بس.... بہت کیچڑ اچھال لیا آپ نے اس کی ذات پر اور بہت صبر سے کام لے لیا میں نے۔"

"احزار! تم پاگل ہو گئے ہو بھلا اس لہجے میں بات کرتے ہیں بڑوں سے؟ یہاں کوئی کسی پر کیچڑ نہیں اچھال رہا ہے' تم سے جو کہا ہے وہ کرو' یوں سمجھ لو کہ ایک طرف تمہاری ماں کھڑی ہے اور دوسری طرف یہ لڑکی اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کس کو چنتے ہو کسے چھوڑتے ہو" اس کے بھڑک اٹھنے پر زرینہ نے اسے ڈپٹا تھا۔ جب وہ ان کی طرف پلٹ آیا۔

"میں اپنی ماں کو چنوں گا امی' باوجود اس کے کہ میری ماں نے حق اور سچ کا ساتھ نہیں دیا' باوجود اس کے کہ میری ماں نے کسی بے قصور بے گناہ کا دل دکھایا ہے' میں اپنی ماں کو ہی چنوں گا کیونکہ بیٹا جو ہوں آپ کا۔"

"میں نے کسی کا دل نہیں دکھایا' جو حقیقت تھی' وہ سب جانتے ہیں۔"

"سب وہ نہیں جانتے جو حقیقت ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا' ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"میں آپ کو جھوٹا نہیں کہہ رہا' مگر سچائی وہ نہیں ہے امی! جو آپ جانتی ہیں۔ سچائی وہ ہے جو میں جانتا ہوں' آپ کیا سمجھتی ہیں کسی بھی لڑکی کی پاکدامنی بس یہیں تک ہے کہ کوئی بھی اس پر جھوٹا الزام لگا دے تو وہ گنہگار ثابت ہو جائے۔ مجھے دیکھیے' میں کاشف بھائی سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ ہوں' کس چیز کی کمی ہے مجھ میں' جائز رشتہ بھی ہے میرا اس کے ساتھ اس کے باوجود میں اس کی پارسائی کو چیلنج نہیں کر سکا' کبھی بتایا اس لڑکی نے آپ کو کہ کیوں اسے سولی پر لٹکا کر چلا گیا تھا میں؟ نہیں بتایا ہوگا اس نے' میں بتاتا ہوں۔ میں اپنے نفس کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ رخصتی سے قبل ہی اسے' اپنی خواہش کے تابع کرنا چاہا تھا۔ مگر اس نے میری خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا' جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ اسے اپنی ماں کا مان عزیز تھا' اپنی حیا اور اپنا کردار عزیز تھا۔ تو پھر میں کیسے مان لوں کہ یہ لڑکی ایسے کمزور کردار کی ہوگی۔"

علمزہ کے آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی!

"آپ لوگوں کو شاید پتا ہی نہیں ہے کہ اللہ نے ایک مومن عورت پر بہتان لگانے والوں کی سزا کیا رکھی ہے' یہ چاہتی تو میری خوشی کے لیے میری خواہش پوری کر سکتی تھی' میں اس کا قانونی اور شرعی شوہر تھا' مگر اس نے میری خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا کردار کتنا مضبوط ہے' اس نے مجھے بتایا عورت کی اصل خوب صورتی کیا ہے' ایک عورت محبت کے بغیر سو سال گزار سکتی ہے' مگر عزت کے بغیر ایک لمحہ نہیں....."

وہ جذباتی ہوا تھا۔ علمزہ روتی رہی۔

"احزار تم بیوقوف بن رہے ہو' کاشف نے خود اسے....."

"کیا کاشف نے خود اسے....؟ کاشف اس گھر کا داماد ہے تو اس کی ہر بات معتبر ہے اور یہ بیٹی ہے تو اس کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں' آپ کومل سے پوچھیں' اس کے ساتھ کیا کیا تھا کاشف بھائی نے۔"

وہ بھڑکا تھا اور وہاں موجود سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خود کاشف بھی کب وہاں سے کھسکا' کسی کو پتا بھی نہ چل سکا۔ نمل سے چھوٹی کومل نے سب کے بیچ کاشف کے کردار کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ جب ایک روز اسے کمرے میں تنہا پا کر وہ اس کے ساتھ بدتمیزی پر اتر آیا تھا مگر کومل نے عزت کے ڈر سے اور کچھ اپنی بہن کا گھر بچانے کے لیے اس بات کا تذکرہ سوائے احزار کے اور کسی سے نہیں کیا۔

"سارا گھر بھی آج اگر اس کے خلاف ہو جائے' تب بھی میں علمزہ کا ساتھ دوں گا امی' کیونکہ یہ میری عزت ہے۔ آج اگر یہ بے عزت ہے تو اس میں میرا قصور ہے' میں اس کی عزت نہیں کروا سکا' حالانکہ میں نے اپنے دادا جی سے اس کا وعدہ کیا تھا کہ اسے عزت

اور تحفظ فراہم کروں گا' مگر اپنی جھوٹی انا کو قائم رکھنے کے لیے میں اپنے فرض سے غافل ہو گیا اور دوسروں کو موقع مل گیا۔" سب کی زبانوں کو تالا لگ گیا تھا۔ علیزہ کے آنسو تھم چکے تھے۔ اس کا صبر رائیگاں نہیں گیا تھا' اس کے ایمان اور کردار کی مضبوطی نے اسے سرخروئی نصیب کردی تھی۔

پہلی بار اسے جنم دینے والی ماں کا سر' سب کے درمیان فخر سے بلند ہوا تھا۔ پیار بھری ایک نظر علیزہ پر ڈالنے کے بعد انہوں نے روتے ہوئے احزار کو گلے لگایا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات میں جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو علیزہ اسی کے کمرے میں بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس کے مقابل آبیٹھا۔

"اسلام علیکم!"

"وعلیکم اسلام......!" بخار کی حدت سے دہکتے چہرے کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر احزار کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال تھا تم پر صرف بلیک اور سرخ کلر ہی سجتا ہے' مگر یہ تو آج پتا چلا کہ تم سفید کپڑوں میں سب سے زیادہ پیاری لگتی ہو۔"

اس کا وہی نارمل انداز تھا' علیزہ کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ اس کے گلے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"اوئے پاگل.... خبردار اب اگر مزید ایک آنسو بھی بہایا تو.... تمہارا بدھو لوٹ کر گھر کو آ گیا ہے ناں' پھر اب رونے کی کیا ضرورت ہے؟"

اسے پیار سے خود سے الگ کرنے کے بعد' اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اگلے ہی پل اس نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دیا تھا۔

"دیکھو علیزہ! جب انسان پر نفس غالب آتا ہے تو وہ اچھے برے' جائز ناجائز کی تمیز کرنا بھی بھول جاتا ہے' میں غلط نہیں تھا لیکن تم بھی اپنی جگہ صحیح تھیں۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اس کی روایات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میری اس لمحاتی لغزش کے ایسے نتائج بھی نکل سکتے تھے جو ہم دونوں کے لیے شرمندگی کا باعث ہوتے۔ مجھے معاف کردو۔"

علیزہ کے دونوں ہاتھ تھامے وہ اسے اپنے غلط عمل کی وضاحت دے رہا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے ٹیک لگائے بیٹھی چپ چاپ سنتی رہی۔

"تم میرا مان ہو علیزہ' میں اپنے اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے میری تقدیر میں تم جیسی صابر اور باکردار بیوی لکھی۔"

"تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا تھا احزار' مگر آج سب کے درمیان جیسے تم نے مجھے معتبر کیا ہے' اس احسان کے لیے میں نے تمہارے سارے قصور معاف کیے۔"

"اچھا جی ملکہ عالیہ' بہت بہت مہربانی' اب پلیز بڑی امی اور میری مما کو بھی معاف کر دینا وہ دونوں تم سے بہت شرمندہ ہیں۔"

"نہیں' مجھے تمہاری ماں سے کوئی شکایت نہیں ہے احزار' انہوں نے دوسروں کی آنکھوں اور کانوں سے دیکھا سنا' مگر میری ماں' وہ تو میرا حوالہ تھیں احزار' میں نے ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا' وہ تو جانتی تھیں کہ میں ایسی نہیں ہوں' پھر بھی انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا' اس روز جب سب مجھ پر لفظوں کے پتھر برسا رہے تھے' وہ خاموش کھڑی میرا تماشا دیکھتی رہیں' انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ میں ایسی نہیں ہوں وہ تو میری ماں تھیں احزار! ماں سے بڑھ کر اولاد کو کون جان سکتا ہے؟"

"وہ مجبور تھیں علیزہ' پلیز معاف کر دو انہیں پلیز۔"

اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ علیزہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلکیں موند لیں۔ بہت دنوں کی تھکن کے بعد اس رات اسے

سکون نصیب ہوا تھا۔

٭ ٭ ٭

منیر صاحب کے چالیسویں کے بعد احزار اور علیزہ کا ولیمہ منعقد کیا گیا تھا۔

یسریٰ اس تقریب میں شرکت کے لیے نہیں آئی تھی' مگر کمل اور کومل نے علیزہ کو پوری پوری کمپنی دی تھی۔ بلیک ڈنر سوٹ میں احزار بے حد خوب صورت دکھائی دے رہا تھا' جبکہ علیزہ نے بھاری کام والی فراک پہنی تھی۔ احزار بظاہر اسے نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی ساری توجہ اسی پر تھی۔

رات تقریباً گیارہ بجے وہ دونوں کمرے میں آئے تو علیزہ کا موڈ بے حد آف تھا۔ احزار کی اتنے دن کی بے نیازی نے اسے بہت ہرٹ کیا تھا' کہاں تو ایک دن صبر نہیں ہو رہا تھا اور کہاں اب ساری بے قراری ہی سرد پڑ گئی تھی۔

وہ بیڈ پر آ کر بیٹھی تو احزار نے اسے پھر تپا دیا۔

''تم تھک گئی ہو گی علیزہ! یہ بھاری ڈریس اتار کر ریسٹ کر لو۔''

''کیوں' میں کھیتی باڑی کر کے آئی ہوں جو تھک گئی ہوں گی۔'' اس کے خفا خفا سے لہجے پر چونک کر پلٹتے ہوئے وہ مسکرا یا تھا۔

''نہیں یار... باہر اتنی دیر تک ایک ہی پوزیشن میں سر جھکا کر بیٹھی رہی ہو۔ اسی لیے کہہ رہا تھا۔''

''بہت شکریہ' میرا احساس کرنے کے لیے' تمہیں تھکن محسوس ہو رہی ہے تو سو جاؤ' مجھے جب محسوس ہو گی میں سو جاؤں گی۔''

وہ خفا بھی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ احزار کا دل مچل اٹھا۔

''ٹھیک ہے' مگر رو کیوں رہی ہو؟'' اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

علیزہ نے آنکھیں صاف کر لیں۔

''میری مرضی میں روؤں یا ہنسوں' تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق تو پڑتا ہے یار...!'' مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے اپنے بازو علیزہ کے گلے میں ڈال لیے تھے۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ...'' نچلا لب دبا کر مسکراتے ہوئے اس نے شرارت سے اسے دیکھا تھا۔ جواب میں علیزہ نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''اگر تم اسی میں خوش ہو تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے احزار' شاید میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ...''

''اوئے... جان لے لوں گا تمہاری اگر کوئی غلط بات زبان سے نکالی تو' پاگل لڑکی' سچ میں پگلی لڑکی ہو تم' قسم سے' ایویں تنگ کر رہا تھا تمہیں اتنے دنوں سے تم بھی ناں۔'' وہ نادم بھی تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔

علیزہ کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گریبان میں جذب ہو گیا۔

''اور وہ جو رخصتی والے دن کہا تھا کہ تمہاری خواہش مر گئی ہے وہ...؟''

''ہاہاہا... وہ بھی تنگ ہی کر رہا تھا تمہیں' مگر تم ہو کہ میں ہی نہیں تنگ' خیر اب کیا ارادہ ہے؟''

شرارتی لہجے والے اس شخص کی روشن نگاہوں میں خوشی اور مسرت کے ہزاروں جگنو دمک رہے تھے۔ علیزہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا دی۔

''نہیں۔''

''کیا نہیں' بہت پتھر رکھ لیے دل پر' اب ایک لمحے کی رعایت بھی نہیں دینی تمہیں' ایسی کی تیسی تمہاری نہیں کی...''

اس بار مسکرا کر کہتے ہوئے احزار نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ علیزہ کی روح سرشار ہو گئی۔

اپنے اپنے جذبوں میں ثابت قدم ان دونوں محبت کرنے والوں کے لیے' خوشبو لٹاتی اس رات کا ایک ایک پل مہک رہا تھا۔

زینت زوبی

میں نئیں جانا کھیڑیاں دے نال
دل وچ رانجھے دا خیال
میں نئیں جانا کھیڑیاں دے نال
رانجھا تاں میرا سب توں سوہنا
کوئی وی نہ ہیر سیال
میں نئیں...
میں نئیں...

لوگوں کے اس قدر ہجوم میں نجانے کون تھا جو ایسی پرسوز آواز اور الفاظ کا ربط قائم کیے ہوئے تھا اور وہ جو صحن کے ایک کونے میں دبکی ہراساں بیٹھی تھی، کسی ایسے پرندے کی مانند جو پرواز کے پہلے دن ہی اپنا آشیانہ بھول جائے، یہ آواز سن کر مزید زور و شور سے رونے لگی۔ بھانت بھانت کے لوگ، شور بجتے ڈھول کی تھاپ نے اسے بتا دیا کہ گھر بیٹھ کر سوچنا ہے اور، جبکہ اس سوچ پر عمل کر کے بے سائبان ہونا، بالکل الگ ہے۔ سیاہ چادر سے منہ چھپاتی ہوئی مہاہ آنکھوں میں بسا خوف و اضطراب بھی نہ چھپا پا رہی تھی۔ نکلتے وقت وہ بھلا کب جانتی تھی کہ وہ خالی ذہن اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کہاں پہنچ جائے گی اور اب پہنچ گئی ہے تو کیا کرے... آگے کدھر جائے؟

✲ ✲ ✲

مٹی کے پیالے میں پانی اور نمکین و میٹھے چاول جو اکٹھے ہو کر عجب رنگ کے نظر آ رہے تھے، کا شاپر کسی نے اس کی طرف بڑھایا۔ سانولے جھریوں بھرے پاؤں جن کی ایڑیاں پھٹی تھیں۔ ان سے مہاہ کی نظریں ہوتی ہوئیں جھریوں اور انگوٹھیوں سے بھرے سانولے ہاتھوں پہ ٹک گئیں۔ کھانے کو دیکھ کر بھوک کی انتہا بڑھی۔ اس نے صبح سے ایک بوند پانی تک حلق سے نہ اتارا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کھانے پر ہی ٹکی رہیں۔ اس مہربان چہرے تک نہ گئیں۔

"لے لے... تیرے ہی لیے لائی ہوں۔" وہ بوڑھی فقیر سی عورت مہاہ سے ہی مخاطب تھی۔

"ڈر نہیں۔ صبح سے دیکھ رہی ہوں تجھے۔ اسی کونے میں دبکی بیٹھی ہے، لے کھا لے۔" کہتے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

مہاہ جو اس دیوانی عورت سے ہراساں تھی مگر انکار نہ کر سکی۔ مہاہ نے وہ تھیلی تھامی۔ وہ عورت مہاہ کو من و سلویٰ تھما کر پھر خود میں منہمک ہو گئی۔

مائیں نی میں کنوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

مہاہ کے حلق میں نوالہ اٹک گیا اور آنسو بھل بھل بہنے لگے۔ نہ جانے کیوں کبھی کبھی انسان اس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ اسے کائنات کا ہر غم اپنی ذات، اپنے ہی غم میں مدغم ہوتا نظر آتا ہے اور اس کا غم جو انفرادی حیثیت سے اسے محسوس ہوتا ہے، تمام غموں کا اجتماع سا بن کے اس کے وجود میں سمٹ آتا ہے۔ دکھ کی ہر آواز، ہر لفظ اسے اپنی ہی روح کا حصہ لگنے لگتا ہے۔ آج مہاہ بھی یہ ہی محسوس کر رہی تھی۔

اس نے کچھ حیرانی سے اس دیوانی کو دیکھا۔ جس کی آواز میں انتہا کا سوز تھا۔ مہاہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

دکھاں دی روٹی، سولاں دا سالن
آہیں دا بالن بال نی
مائیں نی میں کنوں آکھاں

وہ جو آنکھیں بند کیے مگن سی تھی، اچانک بولی۔
"حیران ہو رہی ہے نا؟ ہاہاہا... خیال رکھیو! ایک دن لوگ تجھ پہ بھی حیران ہوں گے۔" وہ کچھ معنی خیزی سے بولی۔
"میں سمجھی نہیں۔" مہراہ اس عجیب عورت کو دیکھ کر واقعی حیران ہو رہی تھی۔
"بائیس سال کی تھی میں، جب اس دربار پہ آئی تھی۔ اب پچپن برس سے اوپر ہو گئی ہوں، ادھر ہی ہوں۔ جانتی ہوں تیرا یہاں آنا۔ میری جگہ یہاں تو بیٹھے گی اور تیری جگہ پھر کوئی اور بیٹھی ہو گی۔ تو نادان کڑیے سن! ادھر میری جگہ بیٹھنا آسان نہیں ہے۔"
ہاہاہا... وہ پھر بے ڈھنگا ہنسی۔
"آپ... آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" اب تک مہراہ جان چکی تھی کہ یہ عورت پاگل نہیں ہے۔
"گھر سے بھاگی ہے؟" اب کے اس عورت کا لہجہ نرم اور آنکھوں میں اپنائیت تھی۔
"بول۔" اسے مہراہ کے چہرے پر حال دل سنانے کی آمادگی نظر آئی تو مزید اصرار کرنے لگی۔
"جی۔" مہراہ اتنا ہی کہہ سکی اور نظریں جھکا گئی۔

آنسو ایک دفعہ پھر رواں تھے۔

"کیوں؟" اب کے مہرماہ چپ رہی۔

"عشق کا چکر ہے کوئی؟" مہرماہ اب بھی کچھ نہ بولی۔

"اگر عشق ہے معبود والا تو نیا پار سمجھ... پر... اگر عشق ہے عبد والا تو... رل جائے گی" ناصحانہ انداز سے کہا گیا۔

"صبح نکاح ہے میرا مگر میں یہ کرنا نہیں چاہتی۔" اب کے مہرماہ کھل کے روئی۔ "میں یہ زبردستی کا رشتہ نہیں نبھا سکتی۔ میرا دل ہے... میرا دل کہیں اور اٹکا ہے۔ میری روح کسی اور میں ضم ہے تو... میں یہ خالی جسم کا لوتھڑا لیے کسی اور کے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں۔" مہرماہ اب آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اٹک اٹک کر بول رہی تھی' پھر گھٹنوں پہ سر رکھے رونے لگی۔

"پازیب پہنے گی یا بیڑی؟" مہرماہ کے سر پہ ہولے سے ہاتھ رکھ کر پوچھا بڑے عجیب انداز سے' مہرماہ اس بے تکے سوال پر جھنجلا گئی۔

"میں گھر سے بھاگی ہوں' یہاں پناہ لینے آئی ہوں کچھ پہننے نہیں۔" اب کے وہ کچھ کرخت لہجے میں بولی۔

"جھلی ہے کیا؟ پناہ لینے ادھر آگئی جدھر نری بے امانی ہے۔ امان کی جگہ تو بس گھر کی چھت ہی ہے۔" وہ بھی کچھ لٹھ مار کر بولی۔

"یہاں بے امانی ہے تو میں کہیں اور رہ لوں گی مگر واپس گھر نہیں جاؤں گی۔" مہرماہ کا انداز ضدی تھا۔

"تو یوں بول نا پازیب پہنے گی۔" مہرماہ خاموشی سے اس کا جھریوں بھرا سانولا چہرہ دیکھے گئی' جس کی ایک ایک سلوٹ میں کرب رقم تھا۔

"دیکھ کڑیے! دو راستے ہیں' ایک ان چاہا اور ایک من چاہا... یہاں کروڑوں لوگ ہیں جنہیں ان چاہے راستے پہ چلنا پڑتا ہے' زمانہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتا ہے' ریت و رواج کی بیڑیاں' انا' عزتوں کی بیڑیاں اور ان بیڑیوں کے قفل کی چابی زمانے کی جیب میں ہوتی ہے۔ وہ تالا قبر تک ساتھ جاتا ہے' پھر زندگی سے موت تک کے سفر میں کیسے بھی نشیب و فراز آئیں۔ ان بیڑیوں کو ڈالے چلنا ہی پڑتا ہے' پاؤں لہو رنگ ہو جائیں یا آبلوں سے بھر جائیں' ان بیڑیوں کی کریہہ آوازیں کانوں میں زہر گھولتی ہی رہتی ہیں۔ جس نے یہ پہنی ہوں وہ مر جاتا ہے۔" وہ دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی' مہر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پھر معاشرے کے گدھ اس مردار کو نوچتے رہتے ہیں اور اس پہ شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتے۔" اب وہ آنکھوں میں انجانی سی نفرت لیے مہرماہ کو دیکھ رہی تھی' لیکن یہ نفرت مہرماہ کے لیے نہ تھی۔

"اگر تو پازیب پہنے گی' خوب صورت چمکتی ہوئی' چھن چھن کرتی تو اس کی چھن چھن بھی چبھے گی تجھے' کیونکہ... کیونکہ اس کی چھن چھن کے پیچھے بھی بہت آئیں گے' تب بھی یہ گدھ تجھ پر پل پڑیں گے۔ گھر چلی جا واپس... ابھی وقت ہے...." اب وہ حیران و پریشان' سوچوں میں گھری مہرماہ کو باقاعدہ دھکے دے رہی تھی۔

"جا' جا' نوچ لینے کو آرہے ہیں تجھے سب' جا بیڑی پہن لے۔" اس کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔ وہ پاگل دکھ رہی تھی۔ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے اور وہ بے قابو۔ دو لوگوں نے اسے بازوؤں سے تھاما۔

"بے چاری کئی سالوں سے یہاں پڑی ہے' سنا ہے محبت کے لیے گھر سے بھاگی تھی' پر گھر سے باہر عورت کی کیا عزت ہے۔" ہجوم میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔

مہرماہ نڈھال قدموں سے چلتی ہجوم کو... چیرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپسی کا سفر کٹھن ضرور ہوا کرتا تھا مگر غلط نہیں... یہ مہرماہ نے اس بوڑھی' دیوانی فقیرنی کی باتوں سے جان لیا تھا۔

نگہت سیما

## مکمل ناول

وہ کرسمس کی رات تھی۔ لندن میں برف گر رہی تھی۔ چھتیں برف سے ڈھک گئی تھیں۔ گلیوں میں پرسکون ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ گھروں میں پکوانوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے چہرہ ٹکائے لان میں موجود کرسمس ٹری کو دیکھ رہی تھی۔ جسے پال نے ایلن کے ساتھ مل کر سجایا تھا۔ اس نے کچھ دیر شیشے سے دیکھنے کے بعد کھڑکی کا پٹ کھول دیا یک دم ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ ہوا جس میں برف کی خنکی تھی۔

"ہے.... جوزی! تم تیار نہیں ہوئیں۔ کیا تمہیں ایلی کی پارٹی میں نہیں جانا۔" مارتھا نے لاؤنج میں جھانکا اور پھر اندر آ گئی۔

اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مارتھا تقریباً "تیار" تھی۔ منی اسکرٹ اور بہت نیچے گلے والا بغیر آستین کا بلاؤز۔ ہاتھ میں چھ انچ کی ہیل والے باریک اسٹریپ والے جوتے پکڑے ہوئے وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اور جھک کر جوتے پہننے لگی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم دراصل...." مارتھا نے ایک انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا اور پھر ہنسنے لگی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جوتے پہن کر سیدھی ہوئی اور پھر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ یقیناً "نشے" میں تھی۔ صبح سے لے کر اب تک اس نے اسے دو تین بار اپنے لیے ڈرنک بناتے اور پیتے دیکھا تھا۔ وہ انگلی اس کی طرف کیے ہنس رہی تھی جب پال نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ وہ شاید ابھی باہر سے آیا تھا۔ اس کے کوٹ پر کہیں کہیں برف تھی۔

"اتنا ہنس کیوں رہی ہو میری ڈارلنگ!" وہ جب موڈ میں ہوتا تو اسے میری کہہ کر بلاتا تھا۔

"یہ تمہاری بیٹی!" مارتھا اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب آ کر اس کے کوٹ کی آستینوں سے برف جھاڑی۔ پال کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں اور

پھر قریبی صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔
"یہ اس پارٹی میں نہیں جانا چاہتی حالانکہ ایلن نے بہت تاکید کی تھی کہ اسے پارٹی میں ضرور لاؤں اور ....." اس نے پھر پال کے کندھے پر پڑی نادیدہ برف جھاڑی۔
"یہ صبح کرسمس کی تقریبات میں شرکت کے لیے بھی میرے ساتھ چرچ نہیں گئی۔"
"اچھا!" پال نے اس کی طرف دیکھا' جو اب کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔
"وہ.... میں۔" اس نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کو مسلا۔ وہ جب اپ سیٹ ہوتی تھی یوں ہی اپنے ہاتھ مسلنے اور رگڑنے لگتی تھی۔
"میری طبیعت .... ڈیڈ! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" پال کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس نے جملہ مکمل کیا۔
"کچھ نہیں ہوا اس کی طبیعت کو پال! دراصل یہ جو چار سال اپنے سوتیلے باپ کے گھر رہی ہے تو اس نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔"
"لیکن میری ڈیر! جب میں اسے لایا تھا تو یہ دس سال کی تھی۔ بالکل بچی اور اب یہ آٹھ سال سے تمہارے ساتھ ہے۔ اگر اس نے سوتیلے باپ کے گھر اپنے مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانا تو کیا یہ تمہارا فرض نہیں تھا کہ تم اسے اپنے مذہب سے آگاہی دو۔" پال کا آج خلاف معمول موڈ اچھا تھا اور وہ بہت نرمی سے بات کر رہا تھا۔
"میں تو اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیتی لیکن صرف تمہاری وجہ سے .... پھر تم کہتے کہ میں تمہاری بیٹی پر سختی کرتی ہوں۔ یہ کام تو تمہیں خود کرنا چاہیے تھا۔"
مارتھا لہراتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی تو پال نے اس کی طرف دیکھا جو ہونٹ بھینچے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔
"تم جانتی ہو جوزی! تمہارا دادا پادری تھا ایک سچا عیسائی اور تم۔"
"میں بھی ایک سچی عیسائی ہوں ڈیڈ!" اس نے فوراً" اپنے سینے پر صلیب بنائی اور صوفے کے پیچھے سے نکل آئی۔
"خداوند یسوع مسیح مجھے معاف کرے۔ میری طبیعت واقعی خراب ہے' لگتا ہے۔ مجھے ٹمپریچر ہے۔"
پال نے ایک جتاتی نظر مارتھا پر ڈالی اور سوچا۔ "یہ مارتھا ہمیشہ ہی مجھے جوزی سے بدظن کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔"
مارتھا نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ ایسی نظر جو اسے اندر تک سہا دیتی تھی اور پال کی طرف دیکھا۔
"تم لنچ پر کہاں تھے؟"
"دوستوں کے ساتھ تھا۔ تم نے کیا بنایا تھا؟"
"ٹرکی روسٹ کیا تھا اور تمہاری لاڈلی نے ایک پڈنگ بنائی تھی جبکہ ایلن چاکلیٹ کیک لایا تھا۔" مارتھا نے جواب دیا۔
"میں نے لنچ نہیں کیا۔"
"میں کچھ لاتی ہوں ڈیڈ!"
وہ فوراً" ہی لاؤنج سے نکل گئی۔ مارتھا نے اسے جاتے دیکھا اور پال کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔
"تم جانتے ہو پال! ایلن تمہاری بیٹی میں انٹرسٹڈ ہے۔"
"اچھا!" پال نے اب ٹانگیں دراز کر لی تھیں اور مطمئن نظر آرہا تھا۔
"تو اور کیا۔ وہ یوں ہی مہربان نہیں ہے۔ اس کا دل آگیا ہے اس پر۔" وہ تھوڑا سا اور جھکی اور اس کا لہجہ مزید دھیما ہوا۔
"اس نے نیا اپارٹمنٹ لیا ہے۔ پہلے سے بڑا اور وہ چاہتا ہے کہ جوزی اس کے ساتھ اس کی پارٹنر بن کر اس کا اپارٹمنٹ شیئر کرلے۔"
"کیا مطلب! شادی کرنا چاہتا ہے وہ؟" پال ایک دم خوش ہوا تھا۔
"شادی!" مارتھا یک دم منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ پال حیرت سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"تم پاکستان میں نہیں ہو پال! یہاں ارد گرد جتنے گھر ہیں' ان میں کتنے شادی شدہ جوڑے ہیں؟ ایک بھی نہیں پال! یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرتے ہیں اور جب دل بھر جائے تو۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔

"تمہارا مطلب ہے بغیر شادی کے... ایلن چاہتا ہے کہ جوزی بغیر شادی کے اس کے ساتھ رہے؟" پال کی آنکھوں کی حیرت دوچند ہوئی تھی۔ "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" مارتھا چلائی۔ "تم... پال تم!" اس نے دایاں ہاتھ قدرے بلند کر کے شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ "اندر سے وہی دقیانوسی پاکستانی ہو۔ دیسی عیسائی۔" اس نے زمین پر تھوک دیا۔

"یہ یورپ ہے پال! یہاں ایسے ہی چلتا ہے۔ سب ایسے ہی رہتے ہیں۔ ایلن کہتا ہے۔ یہاں ہم شادی افورڈ نہیں کر سکتے۔ ڈائیورس کی صورت میں بہت نقصان ہوتا ہے۔ کیا پتا کب چھوڑنا پڑ جائے۔"

پال نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو دیسی عیسائی کہلوانے پر شرمندہ ہوتا تھا لیکن مارتھا کے سامنے نہیں۔ اس لیے وہ فوراً" ہی اس شرمندگی سے باہر نکل آیا تھا۔

"اور تم کون سی ولایتی میم ہو۔ تمہارا ماموں تو آج بھی گوجرانوالہ میں میونسپلٹی میں کام کرتا ہے جبکہ میرا باپ پادری ہے۔ ایک معزز شہری اور میرا دادا ہالینڈ سے آیا تھا۔ اعلا خاندان سے تعلق تھا اس کا۔"

"اور تمہارے دادا نے ایک اینگلو انڈین نرس سے شادی کی تھی۔ تو تمہارا باپ بھی پھر دیسی عیسائی ہوا نا... اور تمہاری ماں... کہنے کو تو ٹیچر تھی پرائمری اسکول کی مگر تھی تو وہی میونسپلٹی میں کام کرنے والے خاندان کی۔"

مارتھا اپنے اوپر تو بات کبھی آنے ہی نہیں دیا کرتی

تھی اور پال کی باتوں کو تو چٹکیوں میں اُڑا دیا کرتی تھی۔
جب پال نے اس سے شادی کی تھی' تب بھی اس کی ماں اور ـــــ باپ کارپوریشن کے ملازم تھے' لیکن وہ ہمیشہ پال پر احسان دھرا کرتی تھی' جیسے اس نے پال سے شادی کرکے اس پر بڑا احسان کیا ہو۔
جب پال سے اس کی ملاقات ہوئی تھی تو وہ بی۔ ایڈ کرنے لاہور آئی ہوئی تھی' اور ایجوکیشن کالج فاروہمن میں پڑھتی تھی۔ پال کی چھوٹی بہن مارگریٹ زریں اس کی روم میٹ تھی۔ مارتھا پروین جس کے ماں باپ دونوں ہی گوجرانوالہ کی میونسپل کمیٹی کے ملازم تھے' چاہتے تھے کہ وہ پڑھ لکھ کر ٹیچر بن جائے۔ جبکہ اس کے چاروں بھائیوں نے بھی زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔
وہ اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے مختلف تھی۔ گوری چٹی' بھوری آنکھیں' بھورے بال۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی شکل و صورت میں بالکل اپنی ماں پر تھیں لیکن وہ تو ـــ۔ اگر وہ پال پر احسان دھرتی تھی تو اس کے نزدیک کچھ غلط نہ تھا' کیونکہ پال تو شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ تھا۔ بے شک ان کی علیحدگی ہو چکی تھی' تو وہ جوان دنوں ایک گلوکار پر دل ہی دل میں مرتی تھی' اس نے پال سے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا ـــ صرف مارگریٹ سے پال کے متعلق سن کر اسے دیکھے بغیر۔ بہرحال پال کا سماجی رتبہ اس سے بہتر تھا۔ پال کا باپ ایک چھوٹے شہر کے گرجے میں پادری تھا۔ شہر بہت چھوٹا بھی نہ تھا۔ اسے ضلعے کا درجہ حاصل تھا۔ پال کے تینوں بڑے بہن بھائی اعلا تعلیم یافتہ تھے اور اچھی پوسٹوں پر تھے' جب کہ پال بھی گریجویٹ تھا اور اس کی چھوٹی بہن بی ایس سی کے بعد اب بی ایڈ کررہی تھی۔ سو مارتھا ہر وقت مارگریٹ کے ساتھ رہتی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب پال مارگریٹ سے ملنے آتا تھا۔ بلکہ ایک بار تو وہ مارگریٹ کے ساتھ اس کے گھر سے بھی ہو آئی تھی۔
مارگریٹ کے ماں باپ اس سے بہت محبت سے ملے تھے۔ گرجے کے ساتھ منسلک ایک چھوٹا سا انگلش میڈیم اسکول تھا' جسے پال چلاتا تھا۔ ان دنوں جب وہ مارگریٹ کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی تو پال بیوی کی بے وفائی اور بچی کی جدائی سے زخم خوردہ تھا۔ مارتھا کو پال کا چھوٹا سا بنگلہ جو گرجے کے ساتھ ہی تھا۔ اور گرجے کی طرح سرخ اینٹوں سے بنا ہوا تھا بہت پسند آیا تھا۔ سو اس نے پال کی دل جوئی شروع کردی تھی کیونکہ وہ پال سے شادی کا فیصلہ کرچکی تھی۔
"پھر بھی میرا خاندان ایک معزز خاندان تھا' جبکہ تمہارا خاندان ـــ اور تم نے شادی سے پہلے ایک دن بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ تمہارے خاندان کے لوگ وہاں گوجرانوالہ میں ـــ" پال کو بھی یاد آگیا تھا کہ مارتھا نے کیسے اپنے خاندان کے متعلق چھپایا تھا۔
"اور تم!" مارتھا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔
دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی تھی اور کچن میں ٹرالی پر سامان سجائے کھڑی جوڑی بے چینی سے اپنے ہاتھ مسل رہی تھی اور انگلیاں موڑ رہی تھی اور پال اور مارتھا لڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ یقیناً "کرسمس کی رات برباد ہوچکی تھی۔
دونوں لڑ بھڑ کر سو جائیں گے اور ایلن کی پارٹی میں جانا نہیں پڑے گا۔ وہ برا نہیں تھا۔ اچھا لڑکا تھا' لیکن اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ جب وہ اپنی نیلی کنچوں جیسی آنکھیں اس پر گاڑتا تو پتا نہیں کیوں دو سیاہ بھنورا جیسی آنکھیں اس کے تصور میں آجاتیں۔ اسے ایلن کی بے تکلفی بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔
اس نے اطمینان بھرا سانس لے کر ٹرالی کا جائزہ لیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔ اس نے پال کی پسند کی ساسز ٹرالی میں رکھیں۔ اسے پال سے بہت محبت تھی۔ وہ ممی کے مقابلے میں پال سے زیادہ قریب تھی' اس لیے۔ جب ممی اور پال کے درمیان علیحدگی ہوئی تھی تو وہ بہت ڈسٹرب ہوئی تھی حالانکہ وہ صرف پانچ سال کی تھی' لیکن وہ ہر وقت پال کو یاد کرکے روتی رہتی تھی اور بہت ضدی ہوگئی تھی کہ اسے ڈیڈی کے پاس جانا ہے۔ لیکن پھر جب ممی نے شادی کرلی تو انہوں نے پال کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیٹی کو لے جائے

لیکن پال کو اس کا پیغام نہیں ملا تھا یا پھر وہ اسے جان بوجھ کر لینے نہیں آیا تھا کیونکہ اس کی زندگی میں مارتھا آ چکی تھی، لیکن پھر چار سال بعد وہ اسے لینے آ گیا تھا۔

"ہے جوزی! کہاں مر گئی ہو؟"

یہ مارتھا تھی جو لاؤنج سے اسے پکار رہی تھی۔ شاید اس کے پاس پال سے لڑنے کے لیے اسلحہ بارود ختم ہو چکا تھا۔ "یقیناً" باقی کا غصہ اس نے جوزی پر نکالنا تھا۔

جوزی نے ٹرالی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتی ہوئی لاؤنج کی طرف جانے لگی۔

"پھنو!" اندر سے پال کی آواز آئی تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

یعنی ابھی میدان کارزار گرم تھا۔ پال کو جب بہت غصہ آتا تھا تو وہ اسے چڑانے کے لیے اس نام سے پکارتا تھا جس نام سے اس کے گھر والے بلاتے تھے۔ یہ نام پروین کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ لیکن پال اور مارگریٹ سے ملنے کے بعد وہ صرف مارتھا ہی رہ گئی تھی۔

"ادھر دو مجھے اور مرو، کہیں دفعہ ہو جاؤ میری نظروں سے دور۔" مارتھا لاؤنج سے نکلی تھی اور ٹرالی اس کے ہاتھوں سے جھپٹی تھی۔ وہ حیرت سے مارتھا کو دیکھتی رہ گئی جو ٹرالی دھکیلتی لاؤنج میں چلی گئی تھی۔ مارتھا کے متعلق قبل از وقت کچھ بھی کہنا ممکن نہ تھا۔

اسے کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اگلے لمحے وہ کیا کرنے والی ہے۔

کچھ دیر وہ یونہی کھڑی رہی اور پھر آہستگی سے بیرونی دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل آئی۔ کچھ دیر یونہی گھر کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ وہ اس وقت گھر سے باہر کیوں آئی تھی، وہ خود نہیں جانتی تھی۔

باہر اب بھی ہلکی برف باری کا سلسلہ جاری تھی۔ برف اس کے کندھوں پر بازوؤں پر اور سر پر گر رہی تھی۔ دراصل وہ مارتھا اور پال کی لڑائی سے خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ ہمیشہ ہی.... اور اب بھی وہ ارد گرد سے بے نیاز سوچ رہی تھی کہ پال اور مارتھا اب بھی جھگڑ رہے ہوں گے اور پتا نہیں کب تک جھگڑتے رہیں گے۔

تب ہی سامنے والے گھر کا دروازہ کھول کر کوئی باہر نکلا۔

اور اس کے قریب آ کر رکا تھا۔

"ہیلو مس! اینی پرابلم؟" اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی، گمبھیر دل میں اترتی ہوئی سی۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔

"نو۔" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں ان سیاہ بھنورا سی آنکھوں سے ٹکرائیں جو اس پر جمی تھیں۔

"ہم نے تمہیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ سوچا شاید کوئی پرابلم ہو۔" اب اس کے پیچھے کھڑی لڑکی نے دائیں طرف ہو کر کہا تو وہ چونکی.... اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"یہ لڑکی ہمیشہ اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ یہ فیملی جو چار افراد پر مشتمل تھی۔ ماں، باپ اور یہ دو۔ اب پتا نہیں یہ لڑکی اس کی بہن تھی یا بیوی۔ یہ فیملی ہفتہ بھر پہلے ہی اس گھر میں منتقل ہوئی تھی اور ہفتہ بھر پہلے ہی اس نے اسے دیکھا تھا اور تب سے یہ سیاہ بھنورا سی آنکھیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کیا تھا ایسا.... اس نے نظریں اٹھائیں۔

"ہیپی کرسمس!" لڑکی مسکرائی۔

"ہیپی کرسمس!" اس نے بہت آہستگی سے کہتے ہوئے نظریں جھکالیں۔

"آپ کا کرسمس ٹری بہت خوب صورت ہے۔" سیاہ بھنورا آنکھوں والا ان کے لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو!"

"میں خوش جمال ہوں۔" لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اور ہم پاکستانی ہیں.... مسلم اور تم؟" لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"میں....!" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا، لیکن مارتھا کسی بھی لمحے باہر آ سکتی تھی اور....

"تم کسی مسلم سے بات نہیں کرو گی اور کسی مسلمان سے دوستی نہیں کرو گی۔ سمجھیں!" اس کے کانوں میں مارتھا کی آواز آئی۔

جب چار سال بعد پال اسے ممی کے پاس سے لے

کر آیا تھا تو مارتھا نے پہلی بات یہی سمجھائی تھی کیونکہ ممی نے جس شخص سے شادی کی تھی۔ وہ مسلمان تھا۔

اس نے لڑکی کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور ایک دم پلٹ کر اپنے گھر کا دروازہ دھکیلتی اندر چلی گئی تھی۔

"عجیب لڑکی ہے۔" خوش جمال نے کندھے اُچکائے تھے۔

"خوشی! یہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ لوگ بلاوجہ انٹرفیئر کریں۔"

"میرا خیال تھا کہ یہ پاکستانی یا انڈین فیملی ہے۔ ماں سے بی یہاں کی ہو لیکن باپ اور بیٹی کی رنگت ظاہر کرتی ہے کہ ان کا تعلق برصغیر سے ہے۔"

خوش جمال نے اپنا خیال ظاہر کیا اور اپنے بازوؤں سے برف جھاڑتے ہوئے اپنا اسکارف درست کیا۔

وہ دونوں اب واپس گھر کی طرف جا رہے تھے اور وہ لاؤنج کی کھڑکی کے شیشوں سے انہیں جاتے دیکھ رہی تھی۔

"یہ لوگ پاکستان سے آئے تھے... یہ مسلمان تھے۔ وہ لڑکا پتا نہیں اس کا نام کیا تھا... اور اس کی آنکھیں... اس کی آنکھیں کتنی سیاہ تھیں بالکل... بالکل... اس نے کتنے سالوں بعد ایسی گھور سیاہ آنکھیں دیکھی تھیں۔

اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے لڑکے نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ مارتھا اور پال لاؤنج سے جا چکے تھے۔ ٹرالی ایسے ہی بھری پڑی تھی۔ ایک پلیٹ میں کیک کا چھوٹا سا پیس کٹا ہوا پڑا تھا۔ یقیناً" پال نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔

گویا آج بڑے دنوں بعد دونوں میں زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ تھینک گاڈ! وہ باہر چلی گئی تھی' ورنہ وہ سامنے ہوتی تو مارتھا کی توپوں کا رخ اس کی طرف بھی ہو جاتا اور وقتاً" فوقتاً" وہ دونوں طرف گولا باری کرتی رہتی۔

اس نے زمین پر اوندھی پڑی پلیٹ اٹھا کر ٹرالی میں رکھی اور ٹرالی دھکیل کر کچن کی طرف لے جانے لگی۔

وہ فٹ بال گراؤنڈ کے باہر گراؤنڈ کے کنارے ہاتھ گود میں دھرے زمین پر بیٹھا تھا۔ پچھلے چھ دن سے یہاں ایگل کلب فٹ بال ٹورنامنٹ ہو رہا تھا اور یہ ٹورنامنٹ ڈسٹرکٹ فٹ بال ایسوسی ایشن کے تحت ہو رہے تھے۔

آج لیاقت میموریل اور اقبال میموریل کے درمیان میچ تھا۔ یہ دونوں ٹیمیں تلہ گنگ کے دو مختلف دیہاتوں سے آئی تھیں اور انہوں نے بے حد شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ گراؤنڈ سے باہر مبہوت سا بیٹھا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ گراؤنڈ اب خالی تھا۔ کھلاڑی جا چکے تھے بلکہ شائقین بھی۔ وہ تنہا خالی میدان کے باہر بیٹھا گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک کھلا اور وسیع میدان تھا گراؤنڈ سے اس طرف سفیدے کے درختوں کی قطاریں تھیں۔

اس کے پیچھے میدان میں کلب کی عمارت تھی اور عمارت سے پیچھے حد نظر کھیت ہی کھیت تھے۔ سورج کا سرخ گولا ہولے ہولے درختوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔ اور ملگجا سا اندھیرا دھیرے دھیرے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ درخت اب دور سے سیاہ نظر آ رہے تھے اور پیچھے کلب کے مین گیٹ پر ایک چھوٹا سا بلب جل اٹھا تھا۔ اس بلب کی مدھم روشنی گراؤنڈ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ تاہم گیٹ کے آس پاس کا اندھیرا کم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر کلب کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ اور پھر گراؤنڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ کھلاڑیوں سے بھر گیا۔ یکایک اس کے کانوں میں سیٹیاں' شور اور تالیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

وہ گراؤنڈ کے کنارے زمین پر بیٹھا تھا لیکن گراؤنڈ کے اندر ہی تھا کھلاڑیوں کے درمیان بال کے پیچھے بھاگتا ہوا۔ وہ بال کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا اور مختلف کھلاڑیوں کو ڈاج دیتا گول پوسٹ کے پاس پہنچ گیا تھا اور پھر اس کی ایک ہی کک نے بال کو گول میں پہنچا دیا تھا۔ اس کے کانوں میں تالیوں اور سیٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھلاڑیوں کے گھیرے میں گراؤنڈ میں کھڑا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے یک دم

کوئی پرندہ تیز آواز نکالتا ہوا اڑا اور اس کے سر کے اوپر سے اڑتا ہوا کلب کی عمارت کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ گراؤنڈ سنسان تھا اور وہ اکیلا گراؤنڈ کے کنارے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے وجود پر کپکپی سی طاری ہو گئی اور خنکی کی ایک لہر اس کی رگوں میں اتر گئی۔ حالانکہ یہ ستمبر کا وسط تھا لیکن رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی کیونکہ اس چھوٹے سے شہر کے اردگرد پہاڑی علاقے تھے۔ یہاں سردی جلد پڑتی اور دیر سے جاتی تھی۔ ایگل کلب شہر سے باہر مضافات میں تھا اور اس کا گھر سامنے سفیدے کے درختوں کے پیچھے تھا۔ یہ سفیدے کے سینکڑوں کی تعداد میں لگے ہوئے درخت ان کے تھے۔ یہ زمین ان کی تھی۔

ایگل کلب فٹ بال ٹورنامنٹ شروع ہوئے چھ دن ہو گئے تھے اور وہ چھ دن سے یہاں آ رہا تھا اور سب کے جانے کے بعد بھی بیٹھا رہتا۔ گراؤنڈ کو دیکھتا رہتا اور اس کا الوژن چند لمحوں کے لیے گراؤنڈ کو آباد کر دیتا اور وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں اس وقت بیٹھا ہے۔ لیکن ایک آنکھ تھی جو چھ دن سے اسے نوٹ کر رہی تھی اور یہ آنکھ کوچ محی الدین کی تھی' جو اس وقت کلب کے فرسٹ فلور پر موجود اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پیچھے کھیتوں میں کوئی گیدڑ چیخا تھا۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلایا۔ بند کیا۔ کھولا۔ جھک کر ایک چھوٹے سے پتھر کو اٹھا کر مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کی لیکن پتھر نیچے گر پڑا۔ اس کے چہرے پر مایوسی سی پھیل گئی۔

وہ سر جھکائے درختوں کی طرف چل پڑا۔ جن کے بیچوں بیچ ایک کچا راستہ اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے سے وہ جلدی گھر پہنچ جاتا تھا' ورنہ کلب کے پیچھے سے پکی سڑک بھی تھی۔ وہ بھی اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

اندھیرے میں دونوں اطراف موجود درختوں کے ہیولے عجیب و غریب شکلیں اختیار کیے ڈراتے تھے۔ لیکن وہ سر جھکائے تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے گھر میں داخل ہوتے وقت کبھی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ گیٹ پھلانگ کر اندر آ جاتا تھا اور پھر پورچ سے گزر کر گلی میں سے ہوتا کچن کے پچھلے دروازے سے اندر آتا تھا۔ برتن دھونے والی ماسی اور صفائی والی ماسی بھی ادھر سے ہی آتی تھی۔ جب بھی وہ لیٹ ہو جاتا تھا۔ کچن کا یہ دروازہ اسے اندر سے کھلا ملتا تھا ورنہ رات کو اندر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

اور اب تو وہ چھ دن سے لیٹ آ رہا تھا اور دروازہ اسے کھلا ہی مل رہا تھا اور وہ جانتا تھا یہ کام مشاعل کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا وہ دل ہی دل میں اس کا ممنون ضرور ہوتا تھا لیکن اس نے اس کا شکریہ کبھی ادا نہیں کیا تھا لیکن آج کچن کا دروازہ نہ صرف یہ کہ اندر سے بند تھا بلکہ باہر جالی کے دروازے پر بھی تالا لگا ہوا تھا اور اسے تب ہی بند کیا جاتا تھا' جب کہیں جانا ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر پریشان سا کھڑا رہا پھر واپس پورچ سے ہوتا گیٹ تک آیا۔ باہر سے گیٹ پھلانگنا آسان تھا۔ لیکن اندر سے مشکل۔

"کیا میں باہر جا کر بیل دوں؟"

اس نے سوچا اور پھر واپس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر کچھ دیر وہ اندرونی گیٹ کے پاس کھڑا رہا اور پھر دروازے سے کچھ فاصلے پر موجود کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی' لیکن کھڑکی پر بھاری پردے پڑے تھے۔

تب وہ مڑ کر دروازے کے پاس آیا اور لکڑی کے بھاری دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔

دروازے کے اس طرف مینو تھی۔ مینو کا نام تو امینہ تھا لیکن سب اسے مینو کہتے تھے۔ وہ چار سال پہلے ان کے گھر کام کے لیے آئی تھی۔ تب وہ دس سال کی تھی اور کام سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

اس نے اندر قدم رکھا۔ مینو نے دروازہ بند کر کے پیچھے مڑ کر لاؤنج کی طرف دیکھا اور پھر واپس مڑی لیکن مڑتے ہوئے اس نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی جس

میں ترحم تھا' ترس تھا اور ہمدردی۔ وہ کچھ دیر یونہی سن روم میں کھڑا رہا پھر اس نے سن روم اور ٹی وی لاؤنج کو علیحدہ کرتے پردوں کی طرف دیکھا۔ لاؤنج سے ٹی وی کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ اس طرف کون بیٹھا تھا۔ وہ اندازہ کرسکتا تھا۔ مشاعل کی ممی ہمیشہ بلند آواز میں ٹی وی لگاتی تھیں' جبکہ پاپا آہستہ آواز میں۔۔۔ تو پاپا۔

اس نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ میدان میں زمین پر بیٹھا رہا تھا یقیناً" کپڑوں پر مٹی لگی ہوگی۔ اس نے غیر ارادی طور پر کپڑوں کو جھاڑا اور لاؤنج کی طرف بڑھا۔ وہ ساری رات یہاں سن روم میں نہیں رہ سکتا تھا اسے بہرحال اپنے کمرے میں جانے کے لیے لاؤنج میں سے گزرنا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پردہ ہٹا کر لاؤنج میں قدم رکھا۔ وہ بالکل سامنے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا' جو لاؤنج سے اوپر تک جا رہی تھیں۔

اس کے دائیں طرف یقیناً" پاپا بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ مشاعل کی ممی' لیکن اس نے دانستہ ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظریں سامنے سیڑھیوں کی طرف تھیں' جبکہ صوفے دائیں طرف دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ تھا اور پھر سیڑھیاں' لیکن اس کے لیے یہ چند قدم طے کرنا پل صراط طے کرنے کے برابر تھا۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" یہ پاپا کی آواز تھی۔ اب اسے دائیں طرف دیکھنا ہی تھا۔ اس کے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

اس کا ننھا سا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ حبیب الرحمٰن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن کے چہرے پر اس کے لیے کوئی پدرانہ محبت یا شفقت نہ تھی ہاں آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے منہ کھولا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ میچ دیکھنے گیا تھا لیکن اس کی آواز گھٹ گئی۔ حلق میں جیسے گولا سا پھنس گیا۔ پچھلے دو سال سے اس کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ پاتا تھا۔ کوئی انجانی طاقت اس کا گلا بھینچ لیتی تھی۔ بولنا چاہتا تو ہکلا کر رہ جاتا۔ عام حالات میں وہ بات کرلیتا تھا اگرچہ کم گو تھا لیکن جب کوئی غصے میں ہوتا' خاص طور پر پاپا تو وہ بول نہ پاتا تھا۔

اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ اپنی پوری توانائی بولنے کے لیے اکٹھی کر رہا تھا لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

"یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا۔ اپنی عمر دیکھو۔ اس عمر میں کن بری صحبتوں میں پڑ گئے ہو تم؟"

اس کی نظریں لمحہ بھر کلاک پر ٹھہریں۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پونے سات بجے مغرب کی اذان ہوتی تھی۔ اور وہ اذان کے بعد اٹھنا چاہتا تھا۔ میچ تو چھ بجے ختم ہو جاتا تھا اور ساڑھے چھ تک گراؤنڈ خالی ہو جاتا تھا۔ لیکن کوئی انجانی طاقت اسے وہاں باندھ دیتی تھی۔ وہ اٹھ نہ پاتا۔ یہ چھوٹا شہر تھا۔ یہاں لوگ آٹھ بجے تک رات کا کھانا کھا کر نو بجے تک سو جاتے تھے۔

"ہاں بولو' کہاں تھے اس وقت تک؟" سوال پھر دہرایا گیا تھا۔

وہ بتانا چاہتا تھا لیکن پھر کچھ کہنے میں ناکام رہا۔ بس ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

"اب منہ میں گھنگھنیاں کیوں ڈال لی ہیں۔ بتاؤ نا اپنے باپ کو' کہاں جاتے ہو؟" یہ تیز چیختی آواز اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی اور اعصاب چٹخنے لگتے تھے۔

"ایک دن کی تو بات نہیں حبیب! یہ تو ہر روز ہی دیر سے آتا ہے۔ اللہ جانے کہاں آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔"

"ہر روز نہیں' صرف چھ دن سے۔ جب سے ایگل کلب ٹورنامنٹ شروع ہوا ہے تب سے۔"

وہ وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن لفظ اندر ہی کہیں دم توڑ گئے تھے اور اس کے ہونٹ صرف لرز کر رہ گئے اور اس نے پاپا کو صوفے سے اٹھتے اور اپنی طرف آتے دیکھا تو سر مزید جھکا لیا۔

"جواب کیوں نہیں دیتے؟" انہوں نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ "میں کیا

بکواس کر رہا ہوں اتنی دیر سے۔" اس کے بال ان کی مٹھی میں تھے اور چہرہ اونچا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے ہی اس کی نظر ان پر پڑی تھی۔ سرخ لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر بڑی کریہہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اٹھے ہوئے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے کھلے ہونٹوں سے لمبے لمبے دانت جھانکنے لگے اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا بلکہ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ وہ جب مشاعل کی ممی کی طرف دیکھ رہا ہوتا تو اس کے دیکھتے دیکھتے ان کی شکل چڑیلوں جیسی ہو جاتی تھی۔ اس نے جھرجھری لی۔ اس کے بالوں میں تکلیف ہو رہی تھی اور گردن میں بھی۔

"خدانخواستہ کچھ غلط ہو گیا تو لوگ تو مجھے ہی برا بھلا کہیں گے سوتیلی جو ہوئی۔"

وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے ابھی ان کے دانت اس کی گردن پر ہوں گے اور وہ اس کا خون چوس لیں گی۔

"بول کہاں تھا رات کے آٹھ بجے تک؟" انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ وہ گرتے گرتے سیدھا ہوا تو ان کا تھپڑ اس کے رخساروں پر پڑا۔

"کن دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کر رہا تھا۔"

اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ کبھی کوئی دوست نہیں بنا پایا تھا اور اس کی وجہ اس کی شخصیت میں موجود اس کی جسمانی کمزوریاں تھیں یا نفسیاتی، لیکن وہ کبھی کسی کلاس فیلو سے بھی بے تکلف نہیں ہو سکا تھا، حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک جب اس کی ماما ام کلثوم زندہ تھیں تو وہ بہت خوش اخلاق اور ہنس مکھ بچہ تھا اور پوری کلاس اس کی دوست تھی، لیکن پھر وہ ہولے ہولے اپنی ذات میں سمٹتا گیا تھا۔

"توبہ کس قدر ڈھیٹ لڑکا ہے۔ باپ پوچھ رہا ہے اور یہ ہونٹ سیے بیٹھا ہے۔"

یہ آواز مشاعل کی ممی کی تھی اور اسے لگا جیسے ان کے لمبے لمبے دانت اس کی گردن میں دھنس گئے ہوں۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حبیب الرحمٰن جیسے غصے سے پاگل سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مشاعل کی ممی کی طرف دیکھا تھا۔

"اس کا ڈھیٹ پن تو میں نکالتا ہوں۔"

مشاعل کی ممی ہمیشہ جلتی پر تیل کا کام کیا کرتی تھیں۔ سو آج بھی کامیاب رہی تھیں۔ لاتیں، مکے، ٹھڈے، تھپڑ۔

حبیب الرحمٰن اس پر پل پڑے تھے۔ وہ نیچے گر گیا تھا۔ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے مشاعل نے آنکھیں بند کر کے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے، لیکن پھر چند لمحوں بعد آنکھیں کھول دیں۔ مینو اس کے کندھے پر سے دیکھ رہی تھی اور اس کے منہ سے چیں چیں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"مینو!" مشاعل نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔ "ہادی کو بہت درد ہو رہا ہو گا۔"

"ہوں!" مینو کے منہ سے نکلا تھا۔

حبیب الرحمٰن اندھا دھند مار رہے تھے اور وہ زمین پر گرا اپٹ رہا تھا۔ بے اختیار وہ کچن کے دروازے سے باہر نکل کر حبیب الرحمٰن کے قریب آئی۔

"انکل! یہ میچ دیکھنے جاتا ہے۔ ادھر ایگل کلب کے گراؤنڈ میں فٹبال کے میچ ہو رہے ہیں۔"

"رات کے آٹھ بجے اس کا باپ میچ کھلاتا ہے وہاں؟" انہوں نے ہاتھ روک کر مشاعل کی طرف دیکھا تھا۔ "میچ چھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔"

"جی!" وہ حبیب الرحمٰن سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ "یہ صرف چند دنوں سے لیٹ آرہا ہے ہمیشہ نہیں آتا لیٹ اور وہ......"

مشاعل کی ممی نے اس کے بازو میں اپنے لمبے ناخن کھبو دیے۔ اس کے منہ سے سسکاری نکلی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ممی کی طرف دیکھا جو حبیب الرحمٰن کی طرف متوجہ تھیں۔

"آپ بھی غصے میں کچھ نہیں سوچتے سمجھتے۔ بچہ ہے۔ کیا اب مار ڈالیں گے اسے۔

وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ زمین پر ٹیک رکھے تھے۔

"چلیں حبیب! کمرے میں 'خوامخواہ بی پی ہائی ہو جائے گا۔"

مشاعل کی ممی نے حبیب الرحمٰن کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہوں نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔ ان کے بالکل پیچھے مشاعل کی ممی تھیں۔ انہوں نے اس کے نیچے ٹیکے ہوئے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھا اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھیں۔ اب انہوں نے جان بوجھ کر پاؤں رکھا تھا یا انجانے میں اس نے یک دم ہاتھ کھینچا تھا اور اس کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی تھی۔ لیکن حبیب الرحمٰن نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ دروازہ کھول کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ مشاعل کی ممی نے پیچھے مڑ کر مشاعل کی طرف دیکھا' جو ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

"اپنے کمرے میں جاؤ۔" انہوں نے غصے سے مشاعل کی طرف دیکھا اور دروازے کو زور سے بند کرتی بیڈ روم میں چلی گئیں۔

وہ سیدھا ہوا۔ پورا جسم درد سے دکھ رہا تھا لیکن ہاتھ میں شدید تکلیف تھی۔ انگلیوں پر سے تھوڑی سی جلد چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے اٹھا' اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ بغیر لائیٹ جلائے اپنے بیڈ تک آیا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ جو کھڑکی کے شیشوں سے آرہی تھی۔

وہ بیڈ پر گر پڑا تھا۔

درد' تکلیف' بے وقعتی' ناقدری' بہت سارے احساسات تھے' جو اسے چیخ چیخ کر رونے پر مجبور کر رہے تھے' لیکن وہ ہونٹوں کو زور سے بھینچے کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ رونے سے زندگی آسان نہیں ہوتی مشکل ہو جاتی ہے۔ چند دن پہلے اس نے یہ جملہ کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بھی سختی سے بند کرلی تھیں۔ جن کے پیچھے سمندر ابل رہے تھے کیونکہ زندگی پہلے بھی آسان نہیں تھی اور وہ اسے مزید مشکل نہیں بنانا چاہتا تھا' سو وہ آنکھیں بند کیے ہونٹ بھینچے تکلیف برداشت کرنے کی اور آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے لگا کہ کوئی آکر اس کے بیڈ پر بیٹھا ہے پھر اس کے بالوں میں کسی نے انگلیاں پھیریں۔

"ہادی میرے بچے میرے چاند!" یہ آواز' یہ لمس وہ پہچانتا تھا۔

"ماما!" اس کے لبوں سے نکلا۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ بیڈ پر کوئی نہیں تھا۔ اس کا تصور ہمیشہ اسے یوں ہی طلسم دکھاتا تھا یا پھر شاید لمحہ بھر کے لیے اسے غنودگی آگئی تھی۔

"ماما!" اس کے لبوں سے پھر نکلا تھا اور اس نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی تھی اور رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"رونے سے اگرچہ زندگی آسان تو نہیں ہوتی لیکن دل پر دھرا بوجھ کم ضرور ہو جاتا ہے۔" وہ یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا تھا اور اب وہ درد کی شدت سے رو رہا تھا جو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں سے لے کر کندھے تک بے تحاشا درد تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ روتا رہا۔ لیکن درد بڑھتا جا رہا تھا۔

تب ہی دروازہ کھلا۔ باہر سے روشنی کی ایک مدھم سی لکیر اندر آئی اور اس کے ساتھ کسی کے قدموں کی آہٹ بھی' جو اس کے بیڈ کے پاس آکر تھم گئی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ اس کے کمرے میں کون آیا تھا۔ کون آسکتا تھا' وہی جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر آتی تھی۔ کبھی فوراً' کبھی کچھ تاخیر سے۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی سسکی روکی اور اپنا چہرہ گویا دیوار سے چپکا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے آنسو دیکھے۔

"ہادی!" وہ مشاعل تھی' جو اسے پکار رہی تھی' لیکن وہ بے حس و حرکت لیٹا رہا اس نے بیڈ پر گھٹنا ٹیک کر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی اور پھر وہ یا تیقی کی

طرف آئی اور اسے دیکھنا چاہا لیکن وہ جیسے اور زیادہ دیوار سے چپک گیا اور اپنا بازو اس طرح چہرے پر رکھ لیا کہ وہ اسے دیکھ نہ سکے۔

"مجھے پتا ہے تم سو نہیں رہے ہو۔ اتنی تکلیف میں کوئی کیسے سو سکتا ہے۔ تمہیں درد ہو رہا ہے نا اور تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی۔"

وہ تھی تو دس سال کی' لیکن اس میں بلا کا اعتماد تھا اور وہ بہت ہوشیار بھی۔

"میں تمہارے لیے برگر لائی ہوں۔ انکل ہمارے لیے لائے تھے تمہارے اور میرے لیے۔"

وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ایسی کی ممی تھیں جنہوں نے پاپا سے اس کی شکایت کی تھی۔

وہ یونہی لیٹا رہا۔ مشاعل کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر مڑ کر دروازے کے پاس آئی اور لائیٹ آن کردی۔ پورا کمرا ایک دم روشن ہو گیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر آنکھوں پر رکھا اور ساتھ ہی اس کی سسکی نکل گئی۔ حرکت کرنے سے ہاتھ کے درد میں اضافہ ہوا تھا۔

وہ بیڈ کے قریب آئی۔

"ہادی پلیز۔ اٹھ جاؤ نا۔ برگر ٹھنڈا ہو جائے گا اور یہ چاکلیٹ بھی ہے۔ تم یہ کھالو۔ میں مینو سے مانگ کر تمہارے لیے درد والی گولی بھی لے آؤں گی اور گرم دودھ بھی۔"

اس نے آنکھوں سے ہاتھ اٹھایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔ لمبی سفید جالی کی فراک پہنے وہ اس وقت اسے کسی فرشتے کی طرح لگی۔ اس کی سانولی رنگت میں اس وقت ہلکی سرخی کی آمیزش تھی اور چہرے سے پریشانی جھلکتی تھی۔ وہ بہت تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی' جو خالی خالی نظروں سے بیڈ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے صبح بھی ناشتا نہیں کیا تھا بس چائے پی تھی۔ اور پھر اسکول سے آکر تم سو گئے تھے۔ کھانے کے لیے ممی نے تمہیں جگانے نہیں دیا اور پھر جاگنے کے بعد تم میچ دیکھنے چلے گئے۔ مجھے پتا ہے تمہیں بھوک لگی ہے۔" اس نے برگر اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

وہ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ مشاعل سے لے کر تو ہرگز نہیں' لیکن برگر کو دیکھ کر اس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی تھی۔ مشاعل برگر کے اوپر سے براؤن کاغذ ہٹا رہی تھی۔

"لو۔" اس نے تھوڑا سا ریپر ہٹا کر اس کی طرف برگر بڑھایا۔

بالکل غیر ارادی طور پر اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر برگر پکڑ لیا۔ اسے بھوک لگی تھی۔ وہ صبح سے بھوکا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے ریپر مزید نیچے کرنا چاہا لیکن درد کی شدید لہریں انگلیوں سے ہوتی پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھیں اور رنگت درد کی شدت سے یوں زرد پڑ گئی جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا۔

"تمہارا ہاتھ!" مشاعل نے اس کا ہاتھ ایک دم پکڑا۔ "یہ... یہ پھول گیا ہے اور یہ سوج بھی گیا ہے۔ کیسے اتنا زیادہ۔"

"تمہاری ممی نے اپنا پاؤں رکھا تھا اس پر۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

یہ اتفاق نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا انہوں نے دانستہ پاؤں رکھ کر اس پر دباؤ بھی ڈالا تھا۔

"نہیں... اوہ۔" مشاعل کی آنکھوں میں جیسے اس کا درد اتر آیا تھا۔ "یہ اتنی تیزی سے سوج رہا ہے ہادی! مجھے لگتا ہے۔ تمہاری انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ میرا مطلب ہے انگلی کے اندر جو ہڈی ہوتی ہے وہ.... ممی کتنی موٹی ہیں۔ مائی گاڈ!

وہ ہادی سے صرف ایک سال چھوٹی تھی۔ لیکن پوری دادی اماں تھی۔ ممی کبھی کبھی اسے "میری نانی" کہتی تھیں۔

ہادی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ مشاعل کی ممی ہی تھیں نا جنہوں نے اس کا ہاتھ کچلا تھا۔ لیکن مشاعل تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں مینو کو بتاؤں۔" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے اس گھر میں مینو کے علاوہ شاید ہادی کا کوئی اور ہمدرد نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن ہادی خاموش رہا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے برگر کا ایک چک لیا۔

"میں تمہارے لیے پانی اور گولی لاتی ہوں۔ تمہیں بہت درد ہو رہا ہے' مجھے پتا ہے۔"

وہ تیزی سے مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا' جو پہلے سے زیادہ سوج گیا تھا۔ مشاعل کہہ رہی تھی کہ انگلی ٹوٹ گئی ہے۔ اسے بہت رونا آیا۔ اس کے ہاتھ تو پہلے ہی کمزور تھے یوں تو مشاعل اس سے چھوٹی تھی' لیکن وہ اس کے مقابلے میں بہت ساری چیزوں کے متعلق اس سے زیادہ جانتی تھی اور شاید زیادہ سمجھ دار تھی۔ وہ دونوں ایک ہی اسکول میں اور ایک ہی کلاس میں تھے۔ دونوں ففتھ کلاس میں تھے۔ وہ گیارہ سال کا تھا اور وہ دس سال کی تھی' لیکن وہ اس کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھی یا شاید اس نے دیر سے داخلہ لیا تھا کہ دونوں ایک ہی کلاس میں تھے۔

مشاعل تین سال پہلے اپنی ممی کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی۔ کیونکہ اس کی اپنی ماما کا سال بھر پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ وہ سات سال کا تھا تب جب مما کا انتقال ہوا تھا۔ وہ آٹھ سال کا تھا جب حبیب الرحمٰن نے مشاعل کی ممی سے شادی کرلی تھی۔ مشاعل کی ممی کی آنکھوں میں پہلے دن ہی اس نے اپنے لیے ناپسندیدگی محسوس کی تھی' لیکن مشاعل اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی اسے اپنا دوست بنانا چاہتی تھی' لیکن وہ کبھی بھی اسے اپنا دوست نہیں بنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ مشاعل تھی۔ ان کی بیٹی جن کے آنے کے بعد اس کے پاپا اسے نظرانداز کرنے لگے تھے' جو بڑے دھڑلے سے اس کی ماما کے بیڈ روم میں رہتی تھیں اور ان کی چیزیں استعمال کرتی تھیں اور جو اس سے نفرت کرتی تھیں' لیکن پھر بھی وہ اس کی ہمدردی اور اس کے تعاون کو قبول کرلیتا تھا کیونکہ اس کے پاس دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔

ایک بار جب ممی نے اسے واش روم میں بند کردیا تھا تو یہ مشاعل ہی تھی' جس نے رات کو' جب وہ خوف اور ڈر سے مرنے والا تھا باہر نکالا تھا۔ اس روز پاپا اپنے کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے' اور جب بھی ممی اسے کھانا نہیں دیتی تھیں' مشاعل ہی رات کو ممی کے سونے کے بعد اسے مینو سے لے کر چپکے سے کھانا دے جاتی تھی۔

وہ مشاعل کی مدد کبھی بھی نہیں لینا چاہتا تھا' لیکن اسے اس کی مدد لینی پڑتی تھی۔ آج بھی وہ مشاعل کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا تھا' لیکن خالی پیٹ میں بھوک سے آنتوں میں بل پڑ رہے تھے۔ وہ پانی اور ٹیبلٹ لینے چلی گئی تھی۔ وہ منع کرنا چاہتا تھا' لیکن کر نہیں سکا تھا اور اب بیڈ پر بیٹھا برگر کھا رہا تھا' لیکن ہاتھ میں درد اتنا شدید تھا کہ اس سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔ آدھا برگر کھا کر اس نے باقی آدھا سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور دعا کرنے لگا تھا کہ مشاعل جلدی سے گولی لے کر آجائے۔

اسے یقین تھا کہ گولی کھانے سے اس کے ہاتھ کا درد ٹھیک ہو جائے گا یا کم ہو جائے گا۔ حالانکہ درد ہر جگہ تھا' پسلیوں میں' کمر میں' رانوں پر' حبیب الرحمٰن کے ٹھڈے لاتیں جہاں جہاں لگے تھے سب جگہ' لیکن ہاتھ کا درد ناقابل برداشت تھا اور مشاعل ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اب وہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ سونا چاہتا تھا' لیکن درد اتنا شدید تھا کہ سونا بھی مشکل تھا۔ اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا اور ایک بار پھر رو رہا تھا ہولے ہولے۔

مشاعل کچھ دیر بعد آئی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور دائیں ہاتھ سے آنسو پونچھے۔ مشاعل نے تاسف اور دکھ سے اسے دیکھا۔

"مجھے پتا ہے ہادی! تمہیں بہت درد ہو رہا ہے لیکن وہاں نیچے کچن میں ممی تھیں۔ مینو سے سنی کی فیڈر دھلوا رہی تھیں اپنے سامنے۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس اور گولی اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے خاموشی سے گلاس پکڑ کر گولی کھالی تو مشاعل نے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ اور ٹیبل پر پڑا برگر اٹھا کر دراز میں رکھ دیا۔

"جب بھوک لگے تو پھر کھا لینا۔"

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے برگر کیوں چھپایا ہے کہ

کہیں ممی نہ آجائیں۔ اتنی شدید تکلیف میں بھی وہ مشاعل کی اس حرکت پر مسکرایا۔ اس کی ممی ٹھیک کہتی تھیں کہ وہ پوری دادی اماں ہے۔ مشاعل اب فراک کی جیب سے ایک ٹیوب نکال رہی تھی۔

"ہاتھ مجھے دو ہادی! مالش کردوں۔ ممی کے گھٹنوں میں جب درد ہوتا ہے تو وہ یہ لگاتی ہیں۔"

اس نے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا لیکن اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"نہیں بس اب تم جاؤ۔ میں سو جاؤں گا۔"

"اچھا لیکن تم دروازہ اندر سے لاک نہ کرنا۔ مینو جب مجھے دودھ دینے آئے گی تو میں وہ تمہیں دے جاؤں گی۔"

ممی نے یہ کہہ کر کہ اسے دودھ پسند نہیں ہے مینو کو منع کر دیا تھا کہ رات کو اس کے لیے دودھ نہ لے جایا کرے۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔"

اس نے آہستگی سے کہا اور لیٹ گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی سیدھا لیٹا رہا پھر اس کی آنکھوں کے کونوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ آخر وہ گیارہ سال کا بچہ ہی تو تھا۔

☼ ☼ ☼

پارٹی عروج پر تھی۔ ایلن کی نظریں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"کیا کوئی خاص مہمان آرہا ہے؟" ڈیوڈ نے اس کے جام کے ساتھ جام ٹکرایا۔

"میرے لیے خاص ہی ہے۔" ایلن مسکرایا۔

تب ہی پال اور مارتھا کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے سرخ لانگ اسکرٹ پر سیاہ بلاؤز پہنا ہوا تھا' بلاؤز پر سرخ ستاروں اور سرخ نگینوں سے دو چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ گلے میں ایک نازک سی چین تھی اور نیچرل لک دیتے میک اپ کے ساتھ' وہ وہاں موجود سب لڑکیوں سے مختلف لگ رہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں بلا کی ملاحت تھی اور اس کی

سیاہ آنکھوں کا سحر مسحور کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں انجانا سا ملال ہلکورے لیتا تھا۔ ڈیوڈ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا اور ایلن کو کہنی ماری۔

"یہ ہے تمہاری بیوٹی کوئن ایلی!"

ایلن نے مسکرا کر اسے دیکھا اور ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

"ہیلو مسٹر اینڈ مسز پال .... آپ بہت دیر سے آئے۔"

"سوری۔ ہم کچھ لیٹ ہو گئے۔" مارتھا مسکرائی تو اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہیلو جوزی! بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اتنی کہ دل بے قابو ہو رہا ہے۔"

اس نے جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر فوراً" چھوڑ دیا اور اس کے اگلے جملے پر اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی اور آنکھوں سے ناگواری جھلکنے لگی تھی۔ ڈیوڈ نے حیرت سے اس کی ناگواری اور جھجک کو دیکھا۔

"یہ لڑکی!"

"یہ جوزفین ہے مسٹر پال اور مارتھا کی بیٹی۔" ایلن نے تعارف کروایا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی پیاری لڑکی۔"

ڈیوڈ کی نظریں جیسے اس کے وجود کے اندر اتر رہی تھیں۔ اس نے جوزفین سے ہاتھ ملایا تو پھر دیر تک نہ چھوڑا۔ اس سردی میں بھی اس کے ہاتھوں میں پسینہ آرہا تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچا تو ڈیوڈ نے ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا۔ پال اور مارتھا ہال میں آگے بڑھ گئے تھے' جہاں پال کے کچھ فرینڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ ایلن نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"آؤ جوزی! اپنے دوستوں سے ملواؤں۔"

وہ بنا کچھ کہے اس کے ساتھ چل دی اور کہنے کو اس کے پاس تھا ہی کیا۔ کیا کہتی وہ کہ وہ اس کے دوستوں سے نہیں ملنا چاہتی .... اور اگر وہ مارتھا کو بتا دیتا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو پھر خوامخواہ شامت آجاتی اس کی۔

وہ تو ٹرالی کچن میں رکھ کر اور چیزیں سمیٹ کر اپنے کمرے میں آکر کتاب پڑھنے لگی تھی۔ مطمئن تھی کہ اس لڑائی کے بعد پارٹی میں جانا کینسل ہو جائے گا لیکن کچھ ہی دیر بعد مارتھا نے آکر اس کا اطمینان غارت کر دیا تھا۔

"پال کہہ رہا ہے۔ بیس منٹ میں تیار ہو کر آجاؤ۔"

پتا نہیں مارتھا کیوں چاہتی تھی کہ وہ ایلن کے ساتھ دوستی کرے۔ جانے کیا مفاد تھا اس کا' اور پال بھی تو یہی چاہتا تھا' لیکن وہ ایسا نہیں چاہتی تھی اور وہ کیا چاہتی تھی۔ اسے خود علم نہیں تھا۔ دو سال پہلے وہ یہاں آئے تھے۔ پال کے بڑے بھائی بہت سال پہلے یہاں آئے تھے اور یہاں ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے بہت کوششوں سے انہیں بلوایا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے وہ کراچی میں تھے۔ کراچی میں وہ بہت خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ پال اس کا بہت خیال رکھتا تھا بلکہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اور مارتھا کا رویہ نہ اچھا تھا نہ برا۔ وہ اس کے معاملات میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی لیکن یہاں آکر وہ بہت بدل گئی تھی۔ یہاں کراچی میں اس کی پال سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی' لیکن یہاں وہ اکثر لڑتے رہتے تھے۔ پال کے بھائی نے صرف چند ہفتے انہیں پاس رکھا تھا اور پھر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کہیں اور بندوبست کرلیں کیونکہ اس کی برٹش بیوی کو پسند نہیں تھا سو مارتھا کو بھی جاب کرنا پڑی تھی۔ پال بھی جاب کر رہا تھا۔ صرف وہ تھی جو ابھی تک گھر پر ہی رہتی تھی۔

یہاں آکر اس کا تعلیمی سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا' جس کا اسے بہت دکھ تھا' لیکن وہ اب اس کی پڑھائی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں غیر ملکیوں کے لیے پڑھائی بہت مہنگی تھی۔ ہاں برٹش نیشنلز کے لیے بہت سہولتیں تھیں۔ ہائر ایجوکیشن میں اور پروفیشنلز کالج میں بھی ان کے لیے بہت رعائتیں تھیں۔ اس کی تعلیم صرف اولیول تک تھی۔ وہ اپنا اے لیول مکمل نہیں کر سکی تھی جب انہیں یہاں آنا پڑا تھا۔۔۔ پال بھی چاہتا تھا اور وہ بھی کہ وہ اپنا اے لیول مکمل کرلے' صرف چند ماہ کی بات تھی' لیکن یہ مارتھا کی ضد تھی کہ اب اگر مارشل نے انہیں اسپانسر کیا ہے اور انہیں ایک موقع مل رہا ہے باہر جانے کا تو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

تو پچھلے سات سالوں سے وہ مارشل کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ انہیں کسی نہ کسی طرح وہاں بلوالے اور اب یوں اس کی تعلیم کا صرف ایک ہی فائدہ تھا کہ اس کی انگلش بہت اچھی تھی جبکہ مارتھا جو گریجویٹ تھی اور اس نے بی ایڈ بھی کر رکھا تھا' روانی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

شروع میں تو اسے خاصی مشکل درپیش ہوئی تھی۔ مارشل کی انگریز بیوی اور اس کے بچے اس کی انگریزی سن کر بہت ہنستے تھے لیکن اب دو سالوں میں وہ روانی سے بولنے لگی تھی۔ دو سال سے وہ ایک اسٹور میں جاب کر رہی تھی اور پال کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا اور یہ نوکریاں انہیں مارشل کی وجہ سے فوراً" ہی مل گئی تھی۔

مارتھا تو چاہتی تھی کہ جوزفین بھی جاب کرلے لیکن یہ پال تھا جس کی مشرقی روح اور جوزفین سے محبت اسے روکتی تھی اور ابھی تک وہ جوزفین کو جاب کے لیے نہیں کہہ سکا تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ جوزفین کی ٹوٹی ہوئی تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑ سکے۔

وہ جوزفین کو ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا اور اگر وہ پاکستان میں رہتا تو ایسا کر سکتا تھا۔ وہ بہت لائق تھی۔ اس نے اولیول میں نائن اسٹارز لیے تھے اور اسے یقین تھا کہ اے لیول میں بھی اس کا رزلٹ شاندار ہو گا۔ لیکن یہ یہاں آکر ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں اخراجات بہت زیادہ تھے۔ وہ جتنا کماتے تھے سب مکان کے کرائے' بلوں اور ٹیکسوں وغیرہ پر خرچ ہو جاتا تھا۔ وہ دو سال میں کچھ بھی بچت نہیں کر سکا تھا۔

ایلن اسے سب سے ملواتا پھر رہا تھا۔

"ہے ایلی! تمہاری گرل فرینڈ تو بڑی زبردست ہے'

کیا فگر ہے۔" وہ شاید ایلن کا کوئی دوست تھا۔ اس نے بمشکل اپنی ناگواری چھپائی۔

"اوہ یاہ!" ایلن نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا اور اپنا ایک بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیا اور یوں ہی لیے ہوئے ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

"تم بیٹھو میں تمہارے لیے ڈرنک لاتا ہوں۔"

وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے پال کو دیکھنے کے لیے چاروں طرف نظر دوڑائی' اس سارے ہجوم میں صرف وہی تھا' جو اس کی کیفیات سمجھ سکتا تھا کہ وہ بہرحال اس کا باپ تھا اور اس نے بھی اپنی دو سال پہلے تک کی زندگی ایک بالکل مختلف ماحول میں گزاری تھی۔ اور اس نے مارتھا سے دبے لفظوں میں کہا بھی تھا کہ اگر جوزی نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے۔ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والی لڑائی کی وجہ سے وہ زیادہ تکرار نہیں کر سکا تھا۔

ہال میں مختلف میزوں پر لوگ بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ ایک کونے میں شیشے کی ٹیبل پر چھوٹا سا کرسٹل کا کرسمس ٹری رکھا ہوا تھا۔ جس میں لگے ننھے ننھے رنگین بلبوں سے روشنی نکل رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھا۔ اتنا خوب صورت اور اتنا قیمتی کرسمس ٹری اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' شاید اس میں لٹکے یاقوت اصلی تھے۔ وہ حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے پال کہیں نظر نہیں آیا اور اب اس کی نظریں ٹری پر تھیں۔

کرسمس ٹری والی ٹیبل کے ساتھ ہی کوئی خاموش بیٹھا تھا۔۔۔ وہ اکیلا تھا اور وہ ڈرنک بھی نہیں کر رہا تھا۔ جب اس نے اچانک سر اٹھایا تو وہ چونک گئی۔۔۔ وہ تو وہی تھا۔۔۔ سیاہ گھور سیاہ آنکھوں والا ان کا پڑوسی۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ وہ لڑکی نہیں تھی۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔

اس نے ذہن پر زور دیا۔

"خوش جمال۔"

تب ہی ایلن دو گلاس ہاتھ میں لیے آگیا۔

"یہ۔" اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا اور نفی میں سر ہلایا۔

"میں ڈرنک نہیں کرتی۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے سوئٹی۔" اس نے پوچھا۔

"اٹھارہ سال سات ماہ۔"

"تو تم قانوناً پی سکتی ہو۔"

"نہیں مجھے نہیں پینا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"آج کرسمس ہے ڈیر! اس کی خوشی میں۔"

اس نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

"اوکے ایز یو وش۔"

اس نے ہلکا سا سر خم کیا اور اس کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور اس کے گلاس سے ٹکرا کر مسکرایا۔

"اس خوب صورت شام کے نام جب تم میری آنکھوں کے سامنے ہو۔"

وہ شعوری کوشش سے مسکرائی۔ اسے اب یہاں ہی زندگی گزارنی تھی' بہت جلد انہیں برٹش پاسپورٹ مل جائے گا۔ پال کا یہی خیال تھا اور پھر شاید۔

وہ زندگی جو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی' وہ اس زندگی سے بالکل مختلف تھی اور یہ زندگی اور اس کے تقاضے اس زندگی سے مختلف تھے۔ یہ سب اس کے ہم مذہب تھے' لیکن وہ ان کے ساتھ گھل مل نہیں پا رہی تھی۔ وہاں اس کا رہن سہن' رسم و رواج' اقدار سب مختلف تھیں۔ وہاں کے رسم و رواج اور رہن سہن کے مطابق سب وہی پاکستانیوں کی طرح شادی میں مہندی مایوں سارے فنکشن ہوتے تھے۔ اسے اپنی پھوپھی مارگریٹ کی شادی یاد تھی۔ بقول مارتھا کے 'وہ دیسی عیسائی تھے اور سوائے چھٹی والے روز چرچ سروس کے لیے جانے' کرسمس اور ایسٹر منانے' یسوع مسیح اور کنواری مریم کے پیروکار ہونے کے علاوہ ان میں عیسائیوں والے اور کیا رواج تھے بھلا۔ لیکن اب انہیں پورا عیسائی بننا تھا۔ وہاں وہ اقلیت تھے اور یہاں اکثریت۔۔۔ انہیں اب اکثریت کے ساتھ رہنا تھا' لیکن سولہ سالوں تک وہ شلوار قمیص دوپٹے میں خود کو جتنا آرام دہ محسوس کرتی تھی' جینز شرٹ اور اسکرٹ وغیرہ میں نہیں۔ اسے لگتا تھا جیسے سب اسے ہی دیکھ رہے ہوں۔ کبھی وہ سینے پر ہاتھ باندھ لیتی' کبھی گلے میں مفلر

لٹکا لیتی اور کبھی اپنے بال دو حصوں میں تقسیم کر کے آگے ڈال لیتی۔

مارتھا ہنستی تھی اس پر۔

"اب تو آدھے پاکستان کی آدھی عورتیں یونہی ننگے سر ٹی شرٹس اور جینز پہنے سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہیں۔ ٹی وی پر بھی کسی کو دوپٹا لیے نہیں دیکھا اور یہ 1950ء کی پیداوار۔"

ایلن اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے جیسے اس کی خوب صورت آنکھوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔

"آج رات رک جاؤ جوزی!"

"نہیں میں نہیں رک سکتی سوری!"

وہ گھبرا کر ایک بار پھر پال کو دیکھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑانے لگی۔ تب ہی میوزک بجنے لگا۔ جوڑے اٹھ کر تھرکنے لگے۔ آج کرسمس کی رات تھی اور سب ہی خوش تھے۔

اس نے دیکھا' مارتھا ایک ادھیڑ عمر مرد کا ہاتھ تھامے فلور کی طرف جا رہی تھی۔ وہ یقیناً" نشے میں تھی۔

پچھلے کرسمس پر مارشل کے ہاں وہ سب کس قدر شرمندہ ہوئے تھے۔ مارشل انجینئر تھا۔ اس کے تعلقات جن لوگوں سے تھے اس کا شرمندہ ہونا بجا تھا۔ اس کی برٹش بیوی جو ڈاکٹر تھی اس نے بعد میں جو کچھ مارشل سے کہا تھا۔ وہ ناقابل بیان تھا شاید اسی لیے اس بار مارشل نے انہیں نہیں بلایا تھا۔ اس نے مارتھا سے نظریں ہٹالیں۔

"اوہ۔" ایلن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"کم آن سوئٹی!" ایلن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھالیا تھا۔

"ایلی پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"یہ ادھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھو۔" اس نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیا۔ وہ جھجک کر اور ڈر ڈر کر پاؤں اٹھا رہی تھی۔ اس کے قدم میوزک کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھے۔ اس کی نظروں نے مارتھا کو ڈھونڈا تھا... وہ ناچ رہی تھی' بلکہ بے ڈھنگے انداز میں ادھر سے ادھر لچک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے کب کا اس بوڑھے شخص کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا اور اسے دیکھ کر جوزفین کو پنجابی فلموں کا تصور آ رہا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے بلکہ قہقہے لگانے لگے تھے۔

اس نے شرمندہ ہو کر مارتھا پر سے نظریں ہٹالی تھیں اور چاہتی تھی کہ دوبارہ مارتھا کی طرف نہ دیکھے۔ ایلن کے ہونٹ اس کے گردن کو چھو رہے تھے۔

انجانے میں یا جان بوجھ کر' وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کی قربت سے سرشار ہو کر اس نے اور بھی اسے قریب کیا تھا لیکن جوزفین نے اس کا پاؤں کچل دیا تھا۔ اس کے قدم صحیح نہیں اٹھ رہے تھے۔ وہ پہلی بار یوں کسی کے ساتھ... جب تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے یک دم ایلن کا ہاتھ اپنی کمر سے ہٹایا اور تقریباً" بھاگتی ہوئی فلور سے اتر کر رکے بغیر ہال سے باہر نکل گئی۔

ایلن نے اسے باہر جاتے دیکھا۔ حیرت سے کندھے اچکائے اور جینی کی طرف بڑھا' جو کچھ دیر پہلے فلور پر کرسٹل کے ساتھ تھی اور اب ڈیوڈ کی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"جینی! کیا تم میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرو گی؟"

"وائے ناٹ!" وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ڈیوڈ نے اپنا گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور ہال سے باہر نکل آیا۔ کسی نے جوزفین کو ایلن کا ہاتھ ہٹاتے اور باہر جاتے نہیں دیکھا۔ سب مستی میں تھے' لیکن ڈیوڈ نے اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔

اسے یہ شرماتی جھجکتی لڑکی اچھی لگی تھی۔

اگر وہ ایلی کو پسند نہیں کرتی تو ضروری نہیں مجھے بھی پسند نہ کرے۔ ایلن تو یوں بھی۔

وہ مسکرایا اور کچھ سوچتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی اس نے گھٹنوں پر سر رکھا ہوا تھا' اور غالباً" رو رہی تھی۔ وہ سب اس پر بھی ہنس رہے ہوں گے ایلی سمیت جس طرح وہ مارتھا پر ہنس رہے

تھے اور انہیں ہنسنا چاہیے۔ کاش ہم یہاں نہ آتے، وہاں ہی رہتے وہاں زندگی اچھی تھی۔ میں اب کسی میڈیکل کالج میں ہوتی اور چند سالوں بعد ایک معزز ڈاکٹر۔

ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "تم یہاں کیوں آگئی ہو؟"

وہ اس کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

ایلن کا گھر کا بہت خوب صورت تھا۔ یہاں چار سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے اطراف دو چھوٹے چھوٹے سبز گھاس والے قطعے تھے جن پر خوب صورت پھولوں والے گملے رکھے تھے اور کناروں پر درخت تھے۔

"ویسے ہی۔" اس نے جلدی سے ہاتھوں کی مٹھیوں سے آنسو پونچھے۔

"کیا ایلی سے ناراض ہو گئی ہو؟"

"نہیں تو۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیوں رو رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔"

"کیا کوئی یاد آ رہا تھا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"ہاں دادا... اپنے گرینڈ پا یاد آ رہے تھے۔"

"اوہ!" ڈیوڈ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا "میں سمجھا کوئی بوائے فرینڈ۔"

"میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔" اس کے لہجے سے خفگی کا اظہار ہو تا تھا۔

"اوہ۔" ڈیوڈ نے ہونٹ سکیڑے۔ "ویسے تمہارا وطن کون سا ہے۔ میرا مطلب ہے تم کہاں سے آئی ہو؟"

"پاکستان سے۔"

"بٹ یو آر کرسچن... ایم آئی رائٹ۔"

"یس آف کورس!" اس کے لہجے میں ایک فخر جھلک آیا۔ "میں ایک سچی عیسائی ہوں۔ میرے دادا وہاں پادری ہیں۔ ہمارا گھرانا بہت مذہبی ہے اور میں سنڈے مارننگ سروس کے لیے ہمیشہ جاتی تھی۔"

ڈیوڈ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن سے لے کر اب تک وہ کتنی بار چرچ گیا تھا۔

"اوہ... اچھا سمجھا۔ ایلی نے کوئی گستاخی کی ہو گی۔" اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"ویسے تم ہو ہی اتنی کیوٹ... تمہارا قد، تمہارے بال، تمہارا فگر، تمہاری آنکھیں۔ اف! سب بہت اٹریکٹو ہیں۔ کیا تمہیں کبھی کسی نے نہیں بتایا۔"

"میری گرینڈ ماما نے۔ کہتی تھیں کہ میں بہت کیوٹ ہوں۔"

ڈیوڈ کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ لیکن وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

"وہ صحیح کہتی تھیں، تمہیں دیکھ کر خود کو روکنا بہت مشکل ہے۔" وہ اور جھکا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں اندر چلتی ہوں، ممی ڈیڈی پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

ڈیوڈ وہاں ہی سیڑھی پر بیٹھا اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا جب کہ وہ نروس سی کھڑی ہاتھ رگڑ رہی تھی۔

تب ہی دروازہ کھلا اور آنے والے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ آنے والے نے ڈیوڈ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

"ڈیوڈ! مجھے اجازت ہے۔ میں کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔"

"او... یس تمہارے آنے کا شکریہ۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ پھر وہ جوزفین کی طرف مڑا، جو اب بھی نروس سی کھڑی تھی۔

"جوزی! یہ میرا دوست ہے۔ غلام مصطفیٰ، ایک بہترین فٹ بالر... ایلما کلب کی طرف سے کھیلتا ہے۔ لیکن بہت جلد مانچسٹر یونائیٹڈ کی سرخ جرسی پہننے والا ہے۔"

اس کی سیاہ آنکھوں میں یک دم جگنو سے چمکے تھے۔

"اور تم بھی مجھے بہت جلد سرخ جرسی پہنتے نظر آ رہے ہو۔" اس نے مسکرا کر ڈیوڈ کو دیکھا تھا۔

"آپ نے کبھی ڈیوڈ کو کھیلتے دیکھا۔"
وہ پوچھ رہا تھا۔۔۔ اور وہ ڈیوڈ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔۔۔ ابھی آج ہی تو پہلی بار وہ ڈیوڈ سے ملی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"آپ کو فٹ بال سے دلچسپی نہیں؟"
اسے فٹ بال کے علاوہ اور کسی کھیل سے دلچسپی تھی ہی نہیں۔ وہ بہت شوق سے فٹ بال کے میچز دیکھا کرتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ بھنورا سی آنکھیں۔ اوہ تو شاید تب ہی اس کی آنکھیں اسے جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ اس نے اہلما فٹ بال کلب کے پچھلے دنوں ہونے والے سارے میچز دیکھے تھے۔ اور اہلما کے اس سیاہ آنکھوں والے کھلاڑی کو بہت کوریج دی گئی تھی۔ وہ جو پچھلے کئی دنوں سے الجھ رہی تھی اور یہ سیاہ آنکھیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں کہ بھلا پہلے کب اور کہاں اس نے یہ آنکھیں دیکھی تھیں۔۔۔ آج یہ الجھن خود بخود سلجھ گئی تھی۔ بہت مطمئن سا ہو کر اس نے اپنی طرف دیکھتے مصطفیٰ سے کہا۔
"بہت۔۔۔ مجھے فٹ بال کا کھیل بہت پسند ہے اور میں ٹی وی پر دکھایا جانے والا ہر میچ دیکھتی ہوں۔"
"گڈ!" ڈیوڈ مسکرایا۔ "تو پھر مجھے ضرور جانتی ہوں گی ڈیوڈ کیمرون۔"
اب کے اس نے چونک کر سر ہلایا تھا۔
ڈیوڈ کیمرون جس پر سارے یورپ کی نظریں لگی تھی۔
"مجھے ایک بار پھر تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"
ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پُرجوش مصافحہ کیا۔ وہ جھینپ کر مصطفیٰ کو دیکھنے لگی اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
"تم گھر جا رہے ہو تو کیا لفٹ دے سکتے ہو مجھے؟"
وہ حیران ہوا لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"میں پاپا کو بتا کر آتی ہوں' دراصل مجھے بھی تھکن ہو رہی ہے۔ پارٹی تو دیر تک چلے گی۔" وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
"اسے تم جانتے ہو پہلے سے۔"
"صرف اتنا کہ یہ میرے گھر کے سامنے رہتی ہے۔"
"اوہ۔۔۔ ہو!" ڈیوڈ نے ہونٹ سکیڑے۔ "مشرقی حسن!" وہ بڑبڑایا۔
اس نے ہال میں داخل ہو کر چاروں طرف دیکھا تھا۔ اور پھر اسے پال ایک کونے میں تنہا بیٹھا نظر آ گیا۔
"پاپا!" اس نے شکر کیا تھا کہ مارتھا اس کے ساتھ نہیں تھی۔
"پاپا! میں گھر جا رہی ہوں۔۔۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
پال جو ہلکے ہلکے سرور میں تھا اس نے سر ہلا دیا اور اس نے شکر کیا کہ پاپا نے زیادہ سوال نہیں کیے۔ اگر وہ نارمل حالت میں ہوتا تو ضرور سوال کرتا کہ کیسے کیوں' کس کے ساتھ وغیرہ وغیرہ۔
وہ فوراً" ہی باہر نکل آئی تھی۔ جہاں ڈیوڈ اور وہ لڑکا مصطفیٰ انگلش پریمئر لیگ بولٹن کے متعلق باتیں کر رہے تھے جو مانچسٹر یونائیٹڈ کے ساتھ جلد ہی مقابلے کے لیے میدان میں اترنے والی تھی۔ مصطفیٰ نے اسے آتے دیکھا تو ڈیوڈ سے ہاتھ ملایا۔
"او کے ڈیوڈ بائے۔"
وہ پارکنگ کی طرف بڑھا تو وہ اس کے ساتھ ساتھ تھی اور حیرت کی بات تھی' ہر ایک سے ڈرنے والی جوزفین اس کے ساتھ اکیلے گھر جاتے ہوئے بالکل خوفزدہ نہ تھی۔
"اور ڈیوڈ کا دل تم پر آ گیا ہے۔ بیوٹی کوئین اور جس پر اس کا دل آ جائے وہ اسے اپنا بنائے بغیر نہیں چھوڑتا' ڈیوڈ کیمرون مستقبل کا عظیم کھلاڑی۔"
اس نے جاتی ہوئی جوزفین کو دیکھا اور دروازہ کھول کر واپس اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ کچھ دیر ہادی کے کمرے کے باہر دروازے کے

ساتھ لگی کھڑی رہی۔ اندر سے ہادی کی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ دو بار اس نے ناب پر ہاتھ رکھا۔ وہ اندر جا کر اسے تسلی دینا چاہتی تھی۔ اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی' لیکن اس کے تسلی بھرے الفاظ یا اس کے آنسو پونچھ لینے سے ہادی کا درد کم نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر اس کی انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں تو اسے کچھ اور کرنا چاہیے۔ کچھ ایسا جس سے اس کا درد کم ہو جائے لیکن وہ ایسا کیا کرے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور بنا آہٹ کیے سیڑھیاں اترنے لگی۔

اس کا بیڈ روم نیچے تھا۔ ممی کے بیڈ روم کے ساتھ' پہلے وہ بیڈ روم ہادی کا تھا' لیکن جب وہ ممی کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی تو ممی نے حبیب الرحمٰن سے یہ کہہ کر وہ لڑکی ہے اور چھوٹی بھی ہے اسے تنہا اوپر خوف آئے گا۔ (نیچے دو ہی بیڈ روم تھے) اور ہادی لڑکا ہے' ہادی کا بیڈ روم اسے دے دیا تھا اور ہادی اوپر شفٹ ہو گیا تھا۔ اس نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ حبیب الرحمٰن لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ وہ اکثر ممی اور سنی کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے اپنا کوئی پسندیدہ ٹاک شو دیکھنے کے لیے لاؤنج میں آجاتے تھے۔ پہلے وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ اسے اوپر سے آتے دیکھ کر خفا نہ ہوں۔ ممی ہوتیں تو ضرور ڈانٹتیں لیکن وہ اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

وہ اپنے روم میں جانے کے بجائے چپ چاپ ان کے صوفے کے دائیں طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

انہوں نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کچھ چاہیے گڑیا! تمہاری ممی تو سو گئی ہیں۔" اس وقت ان کا لہجہ کچھ دیر پہلے کے حبیب الرحمٰن سے بالکل مختلف تھا۔ نرم اور شفیق۔

"وہ... وہ انکل... ہادی!" وہ ممی کے اصرار کے باوجود انہیں ڈیڈی کہنے کے بجائے انکل ہی کہتی تھی۔ جیسے ہادی ہمیشہ اس کی ممی کو مشاعل کی ممی کہتا تھا۔

ان کے چہرے کے نرم تاثرات میں یکدم سختی اتر آئی تھی۔ ہادی انہیں بہت مایوس کر رہا تھا۔ آئے دن اس کی شکایات سن سن کر وہ تھک چکے تھے۔

"وہ۔" اس نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور کچھ خوف زدہ سی ہو گئی۔ تیزی سے بولی۔ "اس کی انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔"

"کیا؟"

"ہاں!" وہ نگاہیں نیچے کیے بولتی چلی گئی۔ "اس کا ہاتھ بہت سوج گیا ہے۔ اسے بہت تکلیف ہے اور وہ بہت رو رہا ہے۔ اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ آپ پلیز اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔"

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ انہوں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو حیرت سے دیکھا اور جیسے خود سے کہا۔

"لیکن اس کی انگلیاں کیسے....."

"وہ ممی... ممی نے اس کے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ شاید غلطی سے.... میں نے دیکھا تھا تب۔"

وہ ایک دم ٹی وی بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ بہت پیارا تھا وہ انہیں۔ اس کے حوالے سے کبھی انہوں نے کلثوم کے ساتھ مل کر بہت سے خواب دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت اونچے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے' لیکن وہ انہیں مسلسل مایوس کر رہا تھا' جیسا کہ زری انہیں بتاتی رہتی تھی اور اب انہوں نے خود دیکھا تھا' اتنی سی عمر میں وہ اتنا لیٹ گھر آرہا تھا۔ غصے کے وہ ہمیشہ سے تیز تھے اور غصے میں پھر انہیں کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مشاعل وہاں ہی صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ ممی کی آنکھ نہ کھلے۔

حبیب الرحمٰن سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور کے لاؤنج میں پہنچے اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تھا' گھٹنوں پر سر رکھے اور اس کا پورا وجود اس کی سسکیوں سے ہل رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔
اس کا خیال تھا مشاعل اس کے منع کرنے کے باوجود
اس کے لیے دودھ لائی ہوگی لیکن حبیب الرحمٰن کو دیکھ
کر اس کے لبوں سے بے ساختہ ''نہیں'' نکلا اور اس
کے بہتے آنسو رک گئے تھے اور خوب صورت
آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ آنکھیں جو بالکل ام
کلثوم کی آنکھوں کی طرح تھیں۔ گھور سیاہ آنکھیں
جن پر گھنی پلکوں کے جنگل تھے اور ان پر آنسو اٹکے
ہوئے تھے۔

''ہادی!'' وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھے۔ وہ غیر
ارادی طور پر دونوں ہاتھ اٹھا کر پیچھے ہٹا اور بالکل بیڈ
کراؤن سے چپک گیا۔ اس کا رنگ یک دم سفید پڑ گیا تھا'
جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ خوف زدہ
نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور اپنے ہاتھ یوں اوپر کیے
ہوئے تھے جیسے ان کی متوقع مار سے بچنا چاہتا ہو۔

اس نے پورے جسم کی توانائی اکٹھی کر کے بولنا چاہا
لیکن لفظ اندر ہی اندر چکرا کر رہ گئے۔ بے بسی سے جیسے
اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ مشاعل کو
اوپر اس کے کمرے میں آتے دیکھ کر اسے مارنے آئے
ہیں۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ مشاعل خود اسے برگر
دینے آئی تھی اور یہ کہ اس نے بالکل تھوڑا سا برگر
کھایا ہے اور باقی کا برگر پڑا ہے۔ وہ چاہیں تو لے جائیں۔
لیکن وہ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

حبیب الرحمٰن اس کے بیڈ کے قریب آ گئے۔
انہوں نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اس نے کبوتر کی
طرح آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے بے طرح سوجے
ہوئے اور چھلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہے تھے انہوں نے
اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

''اُف!'' انہیں پہلی بار زری پر غصہ آیا اور وہ دل ہی
دل میں اس سے بدگمان ہوئے۔

وہ سہم کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس کی پسلیوں میں درد
ہونے لگا بلکہ اس کے پورے وجود سے درد کی لہریں
اٹھنے لگیں۔ وہ تصور میں ان کی لاتیں اور مکے اور
ٹھڈے اپنے وجود پر پڑتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ملتجی
نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس کے نازک وجود میں مزید
مار سہنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے
معاف کر دیں' آئندہ وہ کبھی دیر سے گھر نہیں آئے گا۔
لیکن وہ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے
اور جوڑ دیے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

حبیب الرحمٰن کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔
ابھی کچھ دیر پہلے مشاعل نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ یہ
بچے بھی۔ لیکن مشاعل کی نظروں میں درخواست
تھی التجا تھی لیکن اس کی نظریں..... وہ آنسو بھری
آنکھیں۔ ان میں خوف تھا۔ ڈر تھا۔ انہوں نے بے
اختیار اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا'
اور اس کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ ''مجھے مت
ماریں۔''

حبیب الرحمٰن کا دل جیسے پگھل کر پانی ہوا۔
''ہادی بیٹا! تمہارا ہاتھ بہت سوج گیا ہے۔ ڈاکٹر کو
دکھانا پڑے گا۔ فریکچر نہ ہو گیا ہو۔''

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اسے لگ رہا تھا'
جیسے حبیب الرحمٰن کے منہ سے اس نے صدیوں بعد
یہ لفظ سنا ہو۔ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور
مشینی انداز میں کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اس کا دایاں
ہاتھ پکڑ لیا۔ کمرے سے باہر آئے مشاعل نے جو ابھی
تک لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھی اسے حبیب
الرحمٰن کے ساتھ سیڑھیاں اترتے دیکھا تو مطمئن سی
ہو کر کھڑی ہو گئی۔ حبیب الرحمٰن اس کے پاس آ کر رکے
تھے۔

''ہم ڈاکٹر کی طرف جا رہے ہیں شہر' واپسی پر شاید
ہمیں دیر ہو جائے۔ تم کمرے میں جا کر سو جاؤ۔''
''جی۔ اس کا ہاتھ تو ٹھیک ہو جائے گا نا۔''
''ان شاء اللہ!''

وہ اسے لے کر گیٹ سے باہر نکلے۔ مینو نے
اندرونی دروازہ بند کیا۔ باہر والا گیٹ انہوں نے خود ہی
باہر سے مقفل کر دیا تھا اور مینو کو سمجھا دیا تھا کہ اگر بیگم
صاحبہ اٹھ جائیں تو انہیں بتا دینا میں شہر گیا ہوں۔ خود
سے جگا کر بتانے کی ضرورت نہیں۔

میجر لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ اسے ان کی واپسی تک جاگنا تھا۔ یوں بھی ٹی وی کے لیے تو وہ پوری رات جاگ سکتی تھی۔ مشاعل اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اسے نیند آرہی تھی۔

شہر صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ انہوں نے اسپتال پہنچنے تک پھر اس سے بات نہیں کی تھی۔ بس وہ تین بار اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بار بار دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتا تھا۔

ڈاکٹر نے چیک کرنے اور ایکسرے کروانے کے بعد بتایا تھا' دو انگلیوں میں معمولی سی لکیر آگئی ہے۔ اس نے کریپ بینڈیج باندھ دی تھی اور صبح آنے کے لیے کہا تھا، کہ ضرورت ہوا تو صبح پلاسٹر چڑھا دیں گے۔ اس نے درد کی شدت کم کرنے کے لیے انجکشن بھی لگا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے ایمرجنسی میں اس سے زیادہ ٹریٹ منٹ نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اسے بہت بے دردی سے مارا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتے تھے' لیکن وہ بہت خاموش سا بیٹھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے دل سے رنج کا کچھ بوجھ کم ہو جائے۔ وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ وہ اس کے خیر خواہ ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں اور انہیں خود افسوس ہے کہ انہوں نے اسے مارا۔ بڑی دیر بعد انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ مشاعل بتا رہی تھی تم میچ دیکھنے جاتے ہو۔"

اس نے سر ہلا دیا۔

"لیکن میچ کے بعد تم کہاں جاتے ہو؟"

وہ صرف ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ کلاس میں سبق سنا لیتا تھا۔ تھوڑی بہت بات چیت ہم جماعت لڑکوں سے بھی کر لیتا تھا لیکن حبیب الرحمٰن کے سامنے جیسے اس کی زبان بند ہو جاتی تھی اور وہ اس پر بہت چڑتے تھے۔

"بل بیٹا! بتاؤ نا!" وہ بہت محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"وہ بس ایسے ہی... گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا ہوں۔ اچھا لگتا ہے مجھے... وہاں بیٹھ کر گراؤنڈ کو دیکھنا۔"

یہ ان کے لہجے کی نرمی اور شفقت تھی کہ بمشکل

اس نے اٹک اٹک کر کہا تو انہیں یاد آیا۔ وہ کتنا بولتا تھا اور کتنے سوال کرتا رہتا تھا۔

"تمہارا بیٹا بہت باتونی ہے ام کلثوم! میرا دماغ کھا جاتا ہے۔"

وہ ام کلثوم سے کہتے تھے اور ام کلثوم مسکرا کر اسے چمٹا لیتی تھی۔

"یہ تو میرا طوطا ہے' میرا مٹھو۔ اس کے دم سے میرے گھر میں رونق ہے۔"

وہ اسے چوم لیتی۔

اور اب ہادی بولتا ہی نہیں تھا۔ پتا نہیں کب اس نے بولنا چھوڑا تھا۔ انہیں اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ام کلثوم کے بعد وہ کم گو ہو گیا تھا لیکن زری سے شادی کے بعد انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اور اس نے بولنا بالکل چھوڑ دیا تھا اپنی کسی ضرورت کے لیے بھی اس نے ان سے کبھی نہیں کہا تھا۔ پہلے زری نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا' پھر سنی نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ ابھی صرف چند ماہ کا تھا اور بہت پیارا تھا۔ شاید ان کے ذہن میں تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے اور اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔ لیکن ابھی وہ اتنا بڑا نہیں ہوا تھا۔ اور اسے ان کی توجہ کی ضرورت تھی۔ انہیں اس طرح اسے مارنے کے بجائے نرمی اور محبت سے بات کرنا چاہیے تھی۔

وہ کس قدر سہما ہوا لگ رہا تھا بلکہ ابھی بھی سہما ہوا تھا۔ میں اب اس کا خیال رکھوں گا۔ خود میچ دکھانے لے جاؤں گا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے میں خود بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ اسکول اور کالج کی ٹیم کے ساتھ ہمیشہ کھیلنے جاتے رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنا احتساب کر رہے تھے۔ اگر ام کلثوم زندہ ہوتی تو اس وقت وہ ان کے ساتھ بیٹھا چہک رہا ہوتا لیکن اس وقت وہ ہاتھ گود میں دھرے خاموش بیٹھا تھا۔ اس وقت اسے ان کے پاس یوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا اور ایسا کتنے عرصے بعد ہوا تھا کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسے بھی ماما یاد آرہی تھیں' جب وہ تھیں تو اکثر رات کو آئس کریم کھانے اور جوس پینے شہر آتے

تھے' کتنا مزا آتا تھا۔ کاش! ماما زندہ ہو جائیں۔ کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

سوچتے سوچتے اس نے سیٹ سے سر ٹکایا اور سو گیا۔ انجکشن میں غالباً" نیند کا بھی اثر تھا۔ گھر پہنچ کر انہوں نے گاڑی سے اتر کر بیل دی اور گیٹ کھول کر گاڑی اندر لائے۔ مینو نے اندرونی گیٹ کھول دیا تھا۔

"مینو! باہر کا گیٹ لاک کر دو۔"

انہوں نے مینو سے کہہ کر اسے دو تین بار آواز دی' لیکن وہ گہری نیند میں تھا۔ انہوں نے اسے اٹھالیا۔ وہ بہت دبلا پتلا تھا اور اس کا وزن اپنی عمر کے حساب سے بہت کم تھا۔

"زری سے کہوں گا۔ اس کی خوراک کا خاص خیال رکھا کرے۔ وہ پہلے تو اتنا کمزور نہیں تھا۔" انہوں نے سوچا اور اسے اٹھائے ہوئے لاؤنج سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگے اور جب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو دو آنکھیں بہت تنفر سے انہیں سیڑھیاں چڑھتے دیکھ رہی تھیں اور یہ دو آنکھیں زری کی تھیں' جو بیل کی آواز پر نیند سے بیدار ہو کر اپنے کمرے کے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور حبیب الرحمٰن کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ مینو کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں' جو نیند کے بوجھ سے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ جھول رہی تھی۔

انہیں مینو سے تفصیل جاننا تھی' وہ باہر نکل کر لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں اور اوپر ہادی کے کمرے میں اسے بیڈ پر لٹانے کے بعد وہ کچھ دیر کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ اس کا سرخ و سفید رنگ کتنا کملا گیا تھا۔ سوتے میں بھی تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"سوری ہادی بیٹے!" ان کی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اسے چادر اوڑھا کر آہستگی سے کمرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے دروازہ بند کیا۔ ابھی انہیں زری سے بھی پوچھنا تھا کہ کیا اسے ہادی کا ہاتھ نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً" اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہوگا' پھر بھی پوچھنا تو تھا نا' اور انہیں آج ہادی کے متعلق زری سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ وہ باتیں جو انہیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھیں' لیکن نہیں جانتے تھے کہ ان کی باتوں کا ردعمل الٹ ہوگا۔ وہ ہادی کا خیال رکھنے کے بجائے اس سے اور زیادہ نفرت کرنے لگیں۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے انہوں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔ آج رات وہ ہادی کے پاس اس کے کمرے میں ہی سو جائیں۔

وہ تکلیف میں ہے۔ کیا خبر رات کو زیادہ تکلیف ہو جائے۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا صبح تک سوتا رہے گا۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکے اور نیچے اترنے لگے۔ لاؤنج میں ایک طرف بستر بچھائے مینو سو رہی تھی۔ وہ اکثر لاؤنج میں ہی سو جاتی تھی یا پھر مشاعل کے کمرے میں کارپٹ پر بستر بچھا کر سو جاتی تھی۔ زری کمرے میں واپس جا چکی تھیں۔ وہ کمرے میں آئے تو وہ بیڈ پر منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

"کم از کم باہر جانے سے پہلے مجھے بتا کر جاتے۔"

"تم سو رہی تھیں' میں نے بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اب ایسا بھی آپ نے کیا مار دیا تھا اسے کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔ مکر کر رہا ہوگا۔ بڑا ڈرامہ باز ہے۔" وہ مینو سے ساری تفصیل معلوم کر چکی تھیں۔

"ہاں لیکن تم نے اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھا تھا۔ فریکچر ہوا ہے۔"

"اوہ تو میں نے کوئی جان بوجھ کر تھوڑا ہی رکھا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ہاتھ زمین پر ٹکائے بیٹھا ہے۔ میں تو اپنے دھیان میں آگے بڑھی تھی۔" جواب ان کے حسب توقع تھا۔

"میں ہادی سے بہت محبت کرتا ہوں۔" انہوں نے وارڈروب سے نائٹ ڈریس نکالتے ہوئے بتایا۔

"اور چاہتا ہوں کہ تم بھی اس سے محبت کرو۔ بے شک اتنی محبت نہ کرو جتنی سنی اور مشاعل سے کرتی ہو' لیکن اتنی محبت ضرور کرو کہ اسے ماں کی کمی محسوس نہ

ہو۔ زری!" وہ اس کی طرف پلٹے۔ "زری! ام کلثوم اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اکلوتا تھا نا اس کے بعد وہ بہت خاموش بہت تنہا ہو گیا ہے۔ تم پلیز اسے اپنی مشاعل کی طرح سمجھو۔"
ان کے لہجے میں التجا کا رنگ تھا۔
"مجھے یہ سب کچھ تم سے پہلے کہنا چاہیے تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ جس طرح میں مشاعل کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں' تم بھی اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھو گی۔ میں نے اس یقین کے ساتھ تم سے شادی کی تھی کہ تم اس کا بہت خیال رکھو گی۔"
"تو کیا میں اس کا خیال نہیں رکھتی؟" وہ چمک کر بولی تھیں۔ "میں اس کا مشاعل سے بڑھ کر خیال رکھتی ہوں حبیب! اگر میں نے اسے جنم دیا ہوتا تب بھی اگر وہ یوں ہر روز لیٹ آتا تو کیا مجھے تشویش نہ ہوتی۔ کیا میں اسے نہ روکتی اور آپ سے ذکر نہ کرتی۔ پہلے میں نے اسے خود سمجھایا تھا' لیکن اس نے میری بات کی پروا نہیں کی تو۔"
زری کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی تو وہ قائل سے ہو گئے۔
"ہاں ٹھیک ہے.... تم نے ٹھیک کیا زری! بس مجھے ہی غصہ آ گیا تھا لیکن وہ مشاعل کہہ رہی تھی کہ وہ صرف میچ دیکھنے جاتا ہے اور پھر وہیں گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا ہے۔ دراصل اسے بچپن سے ہی کھیل سے عشق ہے۔ اس کا ماموں قومی ہاکی ٹیم کے لیے سلیکٹ ہو گیا تھا اور فٹ بال کا تو اسے جنون تھا۔"
وہ کپڑے اٹھا کر وہاں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔
بہت ساری یادوں نے ایک دم یلغار کر دی تھی۔
ام کلثوم اور عبدالہادی دونوں بہن بھائی تھے اور دونوں میں بے حد پیار تھا۔ عبدالہادی قومی ٹیم کے لیے سلیکٹ ہو کر کیمپ میں چلا گیا تھا ٹریننگ کے لیے' وہاں جانے کے صرف دو ہفتے بعد اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ بچ نہ سکا تھا۔ ام کلثوم بھائی کے نام پر اس کا نام رکھنا چاہتی تھی لیکن ان کی والدہ جو تب زندہ تھیں۔ وہ اپنے کم عمری میں مر جانے والے بھائی کے نام پر اس کا نام رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ والدہ کی بات ٹال نہیں سکے تھے۔ لیکن ام کلثوم اسے ہادی ہی بلاتی تھی بلکہ ام کلثوم کیا' وہ خود بھی ہادی ہی بلاتے تھے۔ والدہ ہادی کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی وفات پا گئی تھیں' سو ہادی بلانے پر اعتراض کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور وہ شکل و صورت میں ہی نہیں' مزاج میں بھی اپنے ماموں کی طرح تھا۔ جب وہ چھ سال کا تھا اور ایک دن کلثوم لان میں اس کے ساتھ کھیل رہی تھی تو اس نے بلند آواز میں اسے بتایا تھا۔
"حبیب! دیکھیں' میرا بیٹا بالکل اپنے ماموں کی طرح ہے۔"
اور انہوں نے دیکھا تھا وہ چھ سالہ بچہ گیند کو ہاکی کے ساتھ لیے لیے دوڑ رہا تھا' پھر اس نے زبردست ہٹ لگائی تھی۔ ام کلثوم تالیاں بجا رہی تھی۔
"حبیب! حبیب! میرا بیٹا پیدائشی کھلاڑی ہے۔"
"آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا حبیب! کہ وہ گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا ہے۔ آخر آٹھ بجے تک وہ وہاں بیٹھ کر کیا کرتا ہے۔ خدانخواستہ....."
وہ لہجے میں تشویش لیے کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"اللہ نہ کرے۔ تم پریشان مت ہو۔ میں صبح جاؤں گا خود اور کلب کی انتظامیہ سے پوچھوں گا۔"
وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلے گئے۔ جب وہ تبدیل کر کے آئے تو زری سی کو تھپک رہی تھیں۔
"میں ہادی کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ رات میں کسی وقت خدانخواستہ اس کی طبیعت خراب ہو جائے۔ تم سو جانا۔ میں ادھر ہی سو جاؤں گا۔"
زری نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں غصہ حیرت اور تنفر تھا لیکن وہ زری کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے۔
ہادی گہری نیند میں تھا۔ وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر لیٹ کر ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ ہادی کو شاید نیند میں کچھ احساس ہوا تھا' کہ اس نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں کھول کر انہیں

دیکھا۔

"پاپا.....!" اور اپنا بازو ان کے گرد حمائل کیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اس نے اپنا گھٹنا موڑ کر ان کے پیٹ پر رکھا۔ تین سال پہلے ام کلثوم کے بعد وہ یونہی ان سے لپٹ کر سوتا تھا اور پھر زری ان کی زندگی میں آگئیں۔

زری ان کے آفس میں جاب کرتی تھیں۔ کلثوم کی وفات کے بعد جب وہ بہت اپ سیٹ تھے تو زری نے انہیں بہت سہارا دیا تھا۔ معمولی سی سلام دعا گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کلثوم کے بعد کسی اور کو اپنی زندگی میں لے آئیں گے۔ لیکن کلثوم کی وفات کے صرف ایک سال بعد وہ زری سے شادی کر کے انہیں گھر لے آئے تھے کہ گھر بہت ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ انہوں نے شادی کر لی تھی یہ غلط نہ تھا لیکن انہوں نے ہادی کو نظرانداز کر دیا تھا یہ غلط تھا۔ زری طلاق یافتہ اور ایک بچی کی ماں تھیں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی بچی کو تحفظ اور محبت دیں گے تو وہ بدلے میں ہادی کو ماں کا پیار دے گی۔

اور وہ ہادی کے پاس لیٹے اس کے اوپر ہاتھ رکھے دل ہی دل میں عہد کر رہے تھے کہ وہ اب بھی ہادی کی طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔ لیکن نہیں جانتے تھے کہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔ زری انہیں اپنے عہد پر قائم نہیں رہنے دیں گی۔

☼ ☼ ☼

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن اکھیوں سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی جوزی کی طرف دیکھا۔ وہ اس لڑکی کو آج سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ ہاں جب سے وہ اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے تھے تو اس نے اسے اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تھا۔ اس کا گھر بالکل اس کے گھر کے سامنے تھا۔ درمیان میں بس ایک سڑک تھی اور آج پہلی بار خوش جمال کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ گھر سے باہر نکلا تھا اور اس روتی ہوئی لڑکی سے بات کی تھی۔ خوش جمال تو ایسی ہی تھی۔ ہمدرد' رحم دل' ہر ایک کے لیے اس کے دل میں بے حد گنجائش تھی۔ کسی اجنبی کی بھی معمولی سی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتی تھی اور اسے دور کرنے کی کوشش کرتی تھی اور آج سہ پہر بھی وہ آرام سے گھر بیٹھا فرانس میں ہونے والے فٹ بال کے عظیم میلے کی سی ڈی دیکھ رہا تھا جب خوش جمال نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"مصطفیٰ! وہ اس سامنے والے گھر..... وہی جس کے لان میں موجود کرسمس ٹری بہت خوب صورتی سے سجا ہوا ہے۔ اس گھر میں رہنے والی لڑکی اپنے گھر کے باہر کھڑی رو رہی ہے۔"

"تو؟" مصطفیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ ہو سکتا ہے اسے ہماری مدد کی ضرورت ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے اور ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں۔"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی لڑکی ہے۔ اس کا کمپلیکشن بتاتا ہے کہ وہ..... اور پھر ایک دن میں نے گھر میں اسے دوپٹا لیے گھومتے دیکھا۔ ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی والدین بعض اوقات یہ دیکھ کر کہ لڑکا باہر ہے اپنی لڑکیاں بیاہ دیتے ہیں۔ لڑکا چاہے یہاں جھاڑو دیتا ہو اور ہر طرح کی برائیوں میں ملوث ہو' بے چاری لڑکیاں یہاں آکر مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ مس یوز ہوتی رہتی ہیں تو ممکن ہے یہ لڑکی۔"

"اوہ مائی گاڈ خوش جمال۔" وہ کمپیوٹر بند کر کے اس کی طرف مڑا۔ "تم افسانہ نگار کیوں نہیں بن جاتی ہو۔ خود ہی کہانیاں تخلیق کرتی ہو۔ اب کیا خبر اس لڑکی کے سر میں درد ہو یا پھر اس کا بوائے فرینڈ ناراض ہو گیا ہو..... اور پھر وہ اتنی چھوٹی بچی بھی نہیں ہے کہ اگر گھر سے باہر نکل آئی ہے تو چند قدم چل کر کسی فون بوتھ سے پولیس کو فون کر کے اپنی مدد کے لیے بلا سکتی ہے۔"

"کہانیاں ہوتی ہیں تو تخلیق ہوتی ہیں۔ اب چاہے

کچھ بھی ہو، پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ دیکھو! وہ ابھی تک رو رہی ہے۔"

اس نے تھوڑا سا آگے جھک کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں تو اپنے کھیل کے سوا کسی چیز کا پتا نہیں کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ یہاں دنیا میں کتنے پرابلمز اور مسائل ہیں۔"

"یہ دنیا بہت خوب صورت ہے خوش جمال! کیونکہ اس میں تم ہو۔ بابا ہیں اور امی۔"

خوش جمال مسکرائی۔ "ٹھیک ہے لیکن اس خوب صورت دنیا کے چہرے پر اگر کوئی آنسو نظر آئے تو ہمیں اسے پونچھنا چاہیے نا۔"

خوش جمال جب کوئی ارادہ کر لیتی تھی تو اسے روکنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا، سو وہ اُفوہ! کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "چلو۔"

آج سہ پہر وہ لڑکی ان کی بات کا جواب دیے بغیر چلی گئی تھی، لیکن اس وقت اس نے بغیر کسی جھجک کے اس سے لفٹ مانگ لی تھی۔ وہ تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا۔

ڈیوڈ نے اسے جوزی کہہ کر مخاطب کیا تھا جو یقیناً اس کا نک نیم ہوگا۔ ایک بار تو اس نے سوچا انکار کر دے۔ پتا نہیں وہ کس مزاج کی لڑکی ہے اور پھر اس وقت جب وہ مانچسٹر یونائیٹڈ کے لیے ٹرائل دینے جا رہا تھا۔ وہ کسی اسکینڈل کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بابا نے اسے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی، بلکہ وہ تو بلاوجہ اسے گھر سے بھی نکلنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن وہ ڈیوڈ کو منع نہیں کر سکا تھا کیونکہ ڈیوڈ پہلے ہی ایلن کو بتا چکا تھا کہ وہ غلام مصطفیٰ کے ساتھ آئے گا۔ اور ایلن نے بطور خاص فون کر کے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ لیکن جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ اسے خوش جمال کا خیال آ گیا تھا۔ وہ ہوتی تو ضرور اسے ساتھ لے چلنے پر اصرار کرتی۔

اس نے پھر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نروس سی ہاتھ مسل رہی تھی۔ وہاں ایلن کے ہاں بھی وہ بہت گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ جیسے وہ اس ماحول میں اَن فٹ ہو۔ نروس سی بار بار انگلیاں مسلتی تھی۔ ہو سکتا ہے خوش جمال کا خیال درست ہو اور یہ لڑکی کسی مشکل میں ہو۔ وہ ایلن کو نہیں جانتا تھا۔ ڈیوڈ اس کا دوست تھا۔ ڈیوڈ سے اس کی دوستی پچھلے چھ سال سے تھی۔ وہ ڈیوڈ کے کسی فرینڈ کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اس لیے ایک طرف الگ گوشے میں بیٹھ گیا تھا کیونکہ ڈیوڈ کو اپنی ایک گرل فرینڈ مل گئی تھی۔

"تم اس وقت رو کیوں رہی تھیں؟"

غلام مصطفیٰ نے اچانک ہی ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت۔" اسے یاد آیا کہ کچھ دیر پہلے وہ اسے اپنے گھر کے باہر روتے دیکھ چکا تھا۔ "وہ دراصل اندر میرے ممی اور ڈیڈی میں لڑائی ہو رہی تھی۔"

"تو تم اس لیے رو رہی تھیں؟"

اس نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اتنی چھوٹی تو ہرگز نہ تھی کہ ممی ڈیڈی کی لڑائی پر روتی۔ وہ سولہ سال سے تو زیادہ عمر کی ہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ غلط ہو بعض بچے ہوتے ہیں جو اپنی عمر سے بڑے لگتے ہیں۔ اس نے یوٹرن لیتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

"ممی، ڈیڈی میں کبھی کبھار لڑائی ہو جاتی ہے اور جب کبھی تم ممی کے رتبے پر فائز ہو گی تو ہو سکتا ہے۔ تم بھی اپنی ممی کی طرح۔"

اس کا رنگ سرخ ہوا اور اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ کچھ دیر وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ بے حد محظوظ سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے اس نے بمشکل سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"نہیں ــــ میں اپنی ممی کی طرح نہیں ہوں اور میرے ممی ڈیڈی میں کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر لڑائی

ہوتی ہے اور مجھے اس لیے رونا آتا ہے کہ یہ لڑائی اکثر میری وجہ سے ہوتی ہے۔"
"تمہاری وجہ سے؟" مصطفیٰ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
اس نے اثبات میں سرہلایا اور آنکھوں میں آئی نمی کو پلکیں جھپک کر چھپایا۔
"کیوں تمہاری وجہ سے کیوں؟"
"وہ۔" آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔
"وہ... ممی کو اچھا نہیں لگتا کہ ڈیڈی میری حمایت کریں۔ دراصل...." وہ ہچکچائی۔
"ممی میری اسٹیپ مدر ہیں نا تو زیادہ تر لڑائی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ڈیڈی میری سائیڈ لیتے ہیں اور ممی چاہتی ہیں کہ میں وہ کروں جو وہ کہتی ہیں۔ چاہے میرا اسے کرنے کو دل نہ چاہے تب بھی۔"
اور مصطفیٰ کے دل کو کچھ ہوا۔ اندر کہیں گہرائی میں کسی دبے ہوئے درد نے چٹکی بھری۔
"ویسے۔" اس نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔
"میری ممی سنڈریلا کی ممی کی طرح نہیں ہیں۔ وہ اچھی ہیں، لیکن بس کچھ باتیں ایسی ہیں جو مجھے اچھی نہیں لگتیں لیکن انہیں پسند ہیں۔"
اسے لگا جیسے ممی کے متعلق اس طرح کی بات کرنا مناسب نہیں تھا اور اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔
وہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کا پاؤں ایکسیلیٹر پر تھا' ہاتھ اسٹیرنگ پر اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک نرم سا شفیق سا محبت بھرا تاثر تھا اور وہ خوش جمال کی طرح اس کے لیے اپنے دل میں بہت گداز' بہت ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔
"کیا تمہارے ممی ڈیڈی میں بھی لڑائی ہوتی ہے۔"
وہ اس کے اس طرح دیکھنے سے پھر نروس ہو گئی تھی۔
"نہیں۔" اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے دیکھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے امی اور بابا کے چہرے آگئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے اور احترام کرتے تھے۔ اس نے انہیں کبھی لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
"تم کتنے لکی ہو۔" اس نے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔
مصطفیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بیتے ہوئے چند سالوں میں بہت سارے لوگوں نے اسے لکی کہا تھا۔ کیا وہ واقعی لکی تھا۔ اس نے رات کی تنہائیوں میں اکثر خود سے پوچھا تھا اور اگر لکی تھا تو کتنا.... کیا اتنا ہی جتنا لوگ سمجھتے تھے؟
"تم بہت اچھا کھیلتے ہو۔" جوزی کو یاد آیا کہ اس نے ابھی تک اس کے کھیل کی تعریف نہیں کی۔
"میں نے تمہارا وہ میچ دیکھا تھا جو تم نے بروکس مارتھ کلب کے خلاف کھیلا تھا لیکن جب ہفتہ بھر پہلے تم ہمارے گھر کے سامنے آکر رہے تو میں نے بالکل نہیں پہچانا کہ تم غلام مصطفیٰ ہو' ہمارا کلب کا فخر، لیکن تمہاری آنکھیں مجھے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہاری آنکھیں مجھے بہت جانی پہچانی لگی تھیں۔ لیکن مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ تمہیں کہاں دیکھا ہے۔ ڈیوڈ نے جب تمہارا تعارف کروایا تو میری الجھن دور ہوئی۔ نہیں تو اور پتا نہیں کتنے دن سوچتی رہتی کہ یہ آنکھیں میں نے کہاں دیکھی تھیں۔"
"چلو اب تمہیں مزید سوچنا نہیں پڑے گا۔" وہ مسکرایا تو اس کے لبوں پر بھی ایک جھجکی جھجکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"تم پاکستانی ہو یا انڈین؟" وہ شاید اس کے متعلق سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔
"پاکستانی۔"
"اوہ اچھا!" اسے لگا جیسے وہ اس کے پاکستانی ہونے کا سن کر خوش ہوئی ہو۔
"تم پاکستان میں کہاں رہتے تھے۔"
"لاہور....!" اس کا جواب مختصر تھا۔ وہ یک دم سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔
"لاہور۔" وہ ایک دم پُرجوش ہوئی تھی۔ میں نے

لاہور کے متعلق بہت سنا ہے اور مجھے لاہور دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میرے ڈیڈی ہمیشہ لاہور کی تعریف کرتے تھے اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار مجھے ضرور لاہور لے کر جائیں گے۔ دراصل انہوں نے بی ایس سی لاہور سے ہی کی تھی اور کچھ عرصہ وہاں سینٹ انتھونی میں پڑھایا تھا۔"

اس نے بھی کچھ عرصہ سینٹ انتھونی میں پڑھا تھا۔

وہ چونک کر پھر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے فوراً" نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں اور ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"تمہارے ڈیڈی کا کیا نام ہے۔ خوشی بھی سینٹ انتھونی میں پڑھتی تھی۔"

"آ.... نذیر۔" وہ پال کہتے کہتے رک گئی۔ "لیکن ڈیڈی نے صرف چند ماہ ہی پڑھایا تھا۔"

"کون سے سن میں۔"

"پتا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مارتھا کا حکم تھا کہ یہاں کسی کو نذیر شذیر بتانے کی ضرورت نہیں ہے.... اس کے ڈیڈی کا پورا نام نذیر پال تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کی فیملی یا کمیونٹی میں سب کے نام ایسے تھے۔ بلکہ زیادہ تر نام تو ایسے ہی تھے' جو عام مسلم معاشرے میں رکھے جاتے تھے۔ جیسے اس کے ایک چاچو کا نام عمر خیام تھا اور ایک پھپھو کا نام حمیرا نورین تھا۔ وہاں پاکستان میں سب اس کے ڈیڈی کو نذیر کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ ان کے سارے اسٹوڈنٹ انہیں سر نذیر ہی کہتے تھے' لیکن یہاں آکر مارتھا نے انہیں پال کہنا شروع کر دیا تھا۔

"تم لوگ کہاں سے آئے ہو۔ میرا مطلب ہے کس شہر سے۔" اس نے پوچھا۔

"کراچی سے.... یہاں آنے سے پہلے ہم کراچی میں تھے اور میرے ایک انکل یہاں ہوتے ہیں۔ وہ بہت سالوں سے کوشش کر رہے تھے ہمیں بلانے کی۔ لیکن ہم دو سال پہلے یہاں آئے ہیں اور تم کب آئے۔"

"تقریباً" آٹھ سال ہو گئے ہیں۔"

خوش جمال کو بتانے کے لیے اس کے پاس کافی مواد اکٹھا ہو گیا تھا۔ اور خوش جمال یقیناً" حیران ہو گی کہ اس لڑکی کے متعلق میں نے اتنا کچھ کیسے جانا اور میں بھی اس کو ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میں نے اسے گھر تک لفٹ دی ہے۔

وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا اور اب گاڑی مین روڈ سے اتر کر ان کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

اس نے اس کے گھر کے سامنے بریک لگائے۔

"تم میرڈ ہو۔"

بہت دیر سے جو سوال اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا' گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ اسے لگا تھا اگر وہ یہ سوال نہ پوچھتی تو شاید اسے رات بھر نیند نہ آتی۔

"نو۔" اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ ابھی وہ صرف بیس سال کا تھا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لڑکی خوش جمال اس کی بیوی نہیں بلکہ بہن ہے۔ اس کے اندر جیسے دور تک اطمینان پھیل گیا۔ پتا نہیں کیوں۔

گاڑی کا دروازہ بند کرتے کرتے اسے یاد آیا کہ اس نے اس کا شکریہ تو ادا ہی نہیں کیا۔

"سنو سنو!" اس نے شیشے پر ہاتھ مارا تو مصطفیٰ نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوری! مجھے تھینک یو کہنا یاد نہیں رہا تھا۔ تھینک یو۔"

"ویلکم!" وہ بے اختیار مسکرایا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی خم دار پلکوں والی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور سانولے رنگ میں بلا کی کشش تھی۔ اس کے نقوش تیکھے تھے اور قد لمبا تھا.... اور ہونٹ۔

اس نے بڑی تفصیل سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی پلکیں لرزیں' رخساروں پر سرخی نمودار ہوئی اور جھک گئیں۔

"اوکے بائے اینڈ اگین تھینکس۔"

وہ تیزی سے اپنے گھر کے دروازے کی طرف مڑ گئی' اور ہینڈ بیگ سے چابی نکالی۔ تینوں کے پاس گھر کی چابیاں ہوتی تھیں۔

مصطفیٰ کے پاس خوش جمال کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔ اسے اب یو ٹرن سے گاڑی واپس اپنے گھر کی طرف لانی تھی۔ اس نے مڑ کر اس کی گاڑی کو جاتے دیکھا اور لہراتی ہوئی سی گھر میں داخل ہوئی۔ اتنی خوش وہ ان دو سالوں میں کبھی بھی نہ ہوئی تھی.... لیکن خود وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ آج عام دنوں سے زیادہ خوش ہے۔ اس نے لاؤنج میں آکر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اس کی گاڑی اپنے گھر کے باہر کھڑی تھی۔

یہ سیاہ گھنگھور سیاہ آنکھوں والا لڑکا فٹ بال کا ابھرتا ہوا کھلاڑی غلام مصطفیٰ تھا۔

وہ پال کے واپس آنے پر اسے بتانے والی تھی' لیکن نہیں جانتی تھی کہ پال کے آنے پر کتنا بڑا ہنگامہ ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ آج پھر گراؤنڈ کے باہر بیٹھا تھا۔ میچ ختم ہوا تو انہوں نے اسے دیکھا لوگ جا چکے تھے اور خالی گراؤنڈ میں وہ تنہا بیٹھا تھا۔ کلب کے اندر جاتے جاتے وہ واپس مڑے تھے۔ آج وہ چار دنوں بعد آیا تھا اور وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آیا۔

غیر ارادی طور پر انہوں نے اس کا انتظار کیا تھا اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے گراؤنڈ کی طرف دیکھتے ہر بار انہوں نے سوچا تھا کہ اگر آج وہ لڑکا وہاں بیٹھا نظر آیا تو وہ ضرور اس سے بات کریں گے۔ ضرور اس لڑکے کو فٹ بال سے محبت ہے۔ انہیں اپنا بچپن یاد آیا تھا' جب وہ بھی یونہی آخری شخص کے جانے تک گراؤنڈ میں بیٹھے رہتے تھے لیکن چار دن سے وہ نظر نہیں آیا تھا اور آج وہ پھر بیٹھا ہوا خالی گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"محی الدین صاحب پلیز ایک منٹ!"

کلب کے اندر سے باہر آتے ہوئے لیاقت میموریل فٹ بال ٹیم کے کوچ نے انہیں بلایا تو وہ اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ دو دن بعد ایگل میموریل اور لیاقت میموریل کے درمیان فائنل تھا اور وہ اس بات سے بے خبر کہ کسی نے اسے دیکھا تھا اور کوئی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ گراؤنڈ کے کنارے پر بیٹھا گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سورج کا سرخ گولا درختوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا اور گراؤنڈ میں تاریکی چھا چکی تھی۔ لیکن وہ گراؤنڈ میں رونق دیکھ رہا تھا۔ اور وہ خود بال کو لے کر گول پوسٹ کی طرف بڑھ رہا تھا پھر ایک زوردار کک اور بال گول میں.... دور کہیں کتا بھونکا تو وہ چونکا۔ گراؤنڈ خالی تھا اور وہ ہاتھ گود میں دھرے خالی خالی نظروں سے گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عین اسی لمحے محی الدین صاحب کلب کی عمارت سے باہر نکلے۔ گیٹ پر جلنے والے بلب کی مدھم روشنی میں انہیں اس کا ہیولا نظر آیا۔ تو وہ ابھی تک وہاں بیٹھا ہے۔

وہ تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ آہٹ پر خوفزدہ ہو کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"تم آج بہت دنوں بعد آئے ہو؟" آواز میں بہت نرمی اور شفقت تھی۔

اس نے جواب نہیں دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں وہاں اپنے کمرے کی کھڑکی سے تمہیں بہت دیر یہاں بیٹھے دیکھتا تھا۔ پھر جب تم اتنے دنوں سے نہیں آئے تو میں نے سوچا شاید تم بیمار ہو۔ کیا تم بیمار تھے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

تب ہی ان کی نظر اس کے پلاسٹر چڑھے ہاتھ پر پڑی۔

"اوہ شاید تم گر گئے تھے۔ چوٹ لگی ہے ہاتھ پر۔"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تمہیں فٹ بال کھیلنا پسند ہے؟"

"ہاں!" اس نے اس بار جواب دیا۔ "لیکن شاید

میں بھی نہیں کھیل سکتا۔"
اس کے لہجے سے مایوسی جھلکتی تھی اور ایک گہرا درد جیسے اس کے دل کو چھیلتا تھا۔
"کیوں.... کیوں نہیں کھیل سکتے؟" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔
"اگر تمہیں شوق ہے اور سچی لگن ہے تو پھر کوئی چیز تمہیں کھیلنے سے نہیں روک سکتی۔"
"لیکن میں کبھی نہیں کھیل سکتا۔" وہ بے حد افسردہ نظر آنے لگا تھا۔
"میرے ہاتھ کمزور ہیں۔ میری انگلیاں کسی بھی چیز پر زیادہ دیر گرپ نہیں رکھ سکتیں۔ میری ماما کہتی تھیں، مجھے ہاکی کا کھلاڑی بننا ہے لیکن میں ہاکی کو زیادہ دیر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ نہیں سکتا۔ میں کتنی بھی کوشش کروں۔ تب میں نے سوچا۔ مجھے فٹ بال کھیلنا چاہیے اور مجھے فٹ بال کھیلنا اچھا لگنے لگا۔ میں ٹی وی پر فٹ بال کے میچز جہاں کہیں لگے ہوتے ہیں، دیکھتا ہوں۔"
وہ قدرے اندھیرے میں کھڑے تھے اور وہ پہلی بار بلا اٹکے ایک اجنبی شخص سے اپنی ذات کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔
"تم فٹ بال کھیلو گے؟" محی الدین نے نرمی سے پوچھا۔
لیکن وہ متذبذب سا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔
"میں اسکول میں فٹ بال کھیلتا ہوں۔ میرے پی ٹی سر کہتے ہیں۔ میری کک اچھی ہے اگر مجھے اچھا کوچ مل جائے تو۔"
"تو سمجھو تمہیں اچھا کوچ مل گیا۔"
انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہاں سے جانے سے پہلے اس بچے کو نور علی کے حوالے کر جائیں گے، جو بہت اچھا فٹ بال کا کھلاڑی رہا تھا اور آج کل ایگل میموریل کلب میں فٹ بال کا کوچ تھا۔
"تم کل اپنے ابو کے ساتھ آنا۔"
وہ خاموش رہا۔
"ہاں تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"
"ہادی....!"
اور انہیں عبدالہادی یاد آگیا تھا۔ ان کا گہرا دوست، حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا وہ۔ "تمہارا ہم نام میرا دوست ہاکی اور فٹ بال دونوں میں یکساں مہارت تھی اسے۔ لیکن یہاں فٹ بال کا اسکوپ نہیں ہے، اس لیے وہ ہاکی کھیلنے لگا تھا لیکن فٹ بال سے اس کی محبت کم نہیں ہوئی تھی۔"
وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے روشنی میں آ گئے تھے۔ بلب کی روشنی اب اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی سیاہ خم دار پلکوں والی آنکھوں میں بلا کا سحر تھا۔ بالکل عبدالہادی کی آنکھوں کی طرح لیکن اس کی آنکھوں میں اداسی اور خوف تھا جبکہ عبدالہادی کی سیاہ آنکھوں سے شوخیاں جھانکتی تھیں۔
"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس کی سیاہ آنکھوں کا سحر بڑھ گیا تھا۔ "میں اب جاؤں۔"
"ہاں اللہ کے حوالے، لیکن اپنے ابو کو لے کر ضرور آنا میں ابھی چند دن یہاں ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم بڑے پلیئر بن سکتے ہو۔"
وہ سر ہلا کر تیزی سے سفیدے کے درختوں کی طرف بڑھا جن کے پیچھے اس کا گھر تھا۔ اس کے پاپا آج کراچی گئے ہوئے تھے اور اس نے مشاعل اور مینو کو بتایا تھا کہ وہ میچ دیکھنے جا رہا ہے اور آج جلدی آجائے گا لیکن دیر ہو گئی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا لیکن کچن کا دروازہ کھلا تھا اور مینو روٹیاں پکا رہی تھی۔
اس نے جھانک کر دیکھا۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہ تیزی سے لاؤنج میں آیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آگیا اور آنکھیں موند کر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ بند آنکھوں میں ایک خواب اتر آیا تھا۔ ایک روز وہ بڑا فٹ بالر بنے گا۔
اور اب اسے حبیب الرحمٰن کا انتظار تھا۔ وہ آجائیں تو وہ انہیں لے کر کلب جائے گا۔ وہ پاپا کو بتائے گا کہ ان صاحب نے اس سے کہا ہے کہ وہ اچھا کھلاڑی بن سکتا ہے اور پاپا ضرور اس کی بات سنیں گے،

اور سمجھیں گے۔ آج کل وہ اس کو وقت دے رہے تھے۔ ان تین دنوں میں ایک بار بھی انہوں نے اسے ڈانٹا نہیں تھا۔ آج بھی کراچی جانے سے پہلے انہوں نے اسے پیار کیا تھا۔

ٹھیک ہے میرے ہاتھ کمزور ہیں۔ ان میں گرپ نہیں ہے لیکن محی الدین صاحب نے کہا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس نے سوچا وہ مشاعل کو محی الدین صاحب کے متعلق بتائے لیکن پھر یہ سوچ کر مشاعل سے ذکر نہیں کیا کہ کہیں وہ ممی کو نہ بتا دے اور ممی پہلے ہی پاپا کو منع کر دیں۔ اسے پہلے سے کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہیے بس پاپا کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ پاپا میچ ختم ہونے سے پہلے ہی آجائیں۔

آنے والے لمحوں سے بے خبر وہ دعا مانگ رہا تھا لیکن تقدیر کی کتاب میں کچھ اور ہی رقم تھا۔ کچھ ایسا جس نے اس کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

یہ تین دن بعد کی بات تھی۔ مسلسل بارش کی وجہ سے میچ نہیں ہو رہا تھا اور وہ گھر پر ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا جب مینو نے لاؤنج میں آکر اسے آواز دی تھی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

مینو اسے کھانے کے لیے بلا رہی تھی وہ اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دیکھا کہ سیڑھیوں کے پاس سنی کی کیری کاٹ پڑی تھی اور سنی آوازیں نکال رہا تھا۔ اسے سنی بہت پیارا لگتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن اسے مشاعل کی ممی سے ڈر لگتا تھا' اس نے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے سنی کی طرف دیکھا۔ یک دم ہی لاؤنج میں رکھے فون کی بیل ہوئی۔

"ضرور پاپا کا ہو گا!" اس نے سوچا۔

اسے پاپا سے بات کرنا تھی۔ اسے پاپا کو بتانا تھا کہ وہ کھیل سکتا ہے۔

وہ تیزی سے ایک ایک دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ کیری کاٹ کو اس کے پاؤں کی ٹھوکر لگی۔ سنی نے رونا شروع کر دیا تھا۔ مشاعل کی ممی یک دم ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں اور باہر نکلتے ہی انہوں نے اسے تھپڑ مارا۔

"اندھے ہو۔ بچے کو گرا دیا۔"

وہ گرا نہیں۔ وہ تو کاٹ میں ہے۔ اور میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ خود ہی رو رہا ہے۔"

سنی دونوں ہاتھ اونچے کیے ماما.... ماما کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماما اسے اٹھا لیں۔ مینو نے فون اٹھا لیا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے کبھی مشاعل کی ممی کو اور کبھی مینو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جی.... جی صاحب!" مینو ماؤتھ پیس میں کہتے ہوئے مشاعل کی ممی کی طرف دیکھ رہی تھی' جو چلا رہی تھیں۔

"تم دشمن ہو سنی کے' اسے مارنا چاہتے ہو۔" ایک اور تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ "میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے' تم نے اسے سیڑھیوں سے لڑھکایا جان بوجھ کر' وہ تو اللہ نے رکھ لیا...."

"صاحب کا فون ہے۔" مینو نے چلا کر بتایا حالانکہ وہ پہلے ہی جان چکی تھیں۔ وہ یونہی چلاتی ہوئی فون تک پہنچی تھیں۔ سنی اپنے نظر انداز ہونے پر اب اونچا اونچا حلق پھاڑ کر رو رہا تھا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔

مشاعل کی ممی رو رو کر کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ سن نہیں رہا تھا۔ مینو نے اس کے قریب آکر کہا تھا وہ فون پر اپنے پاپا سے بات کر لے شاید وہ اسے بلا رہے تھے۔ مشاعل کی ممی نے تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور جھک کر کیری کاٹ کے اسٹریپ کھولنے لگیں۔

وہ میکانکی انداز میں آگے بڑھا تھا اور نیچے پڑا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

"جی پاپا!" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"ہادی تم!" وہ بہت غصے میں تھے۔

"تم اپنے ہی بھائی کو مارنا چاہتے تھے ذلیل انسان!" وہ گالیاں دے رہے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں

کہہ سکا تھا۔

"کیا کروں میں تمہارا... مرجاتے تم بھی اپنی ماں کے ساتھ۔ بلکہ مر گئے ہو میرے لیے۔"

وہ صفائی میں ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں کہہ سکا۔ لفظ امڈ امڈ کر لبوں تک آتے، لیکن پھر لبوں سے باہر نہ نکل پاتے۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے سنی کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اس نے سنی کو نہیں گرایا۔ اس نے بے بسی سے مینو کی طرف دیکھا جو ٹی وی ٹرالی صاف کر رہی تھی۔ لیکن مینو نظریں چرا کر ٹرالی پر زور و شور سے کپڑا رگڑنے لگی اور مشاعل پتا نہیں کہاں تھی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو ممی اتنی دیدہ دلیری سے جھوٹ نہ بولتیں۔

"ہر روز تمہاری شکایتیں سن سن کر تھک چکا ہوں۔ ان چند دنوں میں تم نے کیا کیا نہیں کیا۔"

اب وہ اس کے قصور اور غلطیاں گنوا رہے تھے۔

"میں... میں آئندہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم میرے لیے مر گئے ہو، اوکے!"

دوسری طرف ریسیور زور سے پھینکا گیا تھا۔ اور وہ ریسیور تھامے ساکت کھڑا رہ گیا۔ ریسیور سے ٹوں ٹوں کی آواز آ رہی تھی۔

"مینو!"

مشاعل کی ممی نے سنی، مینو کو پکڑایا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر کریڈل پر ڈالا۔

"اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے تم۔"

"وہ کہاں جائے گا بھلا۔"

اس نے نم آنکھوں سے مشاعل کی ممی کو دیکھا تھا۔

"نکلو اس گھر سے۔ یہاں رہو گے تو سنی کو مار ڈالو گے۔"

انہوں نے اس کا بازو پکڑا اور دھکیلتے ہوئے دروازے تک لائیں اور پھر دروازے سے باہر دھکا دیتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور دروازہ بند ہونے سے پہلے اس نے مشاعل کو دیکھا تھا، جو آنکھیں ملتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی تھی اس نے ملتجی نظروں سے مشاعل کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا ممی؟"

"سنی کو مارنے لگا تھا۔ سیڑھیوں سے گرا دیا اسے۔"

اور دروازہ بند ہو گیا۔ بند دروازے کے باہر اس نے مشاعل کی باریک سی آواز سنی۔

"نہیں ممی! وہ کہاں جائے گا۔"

"میری طرف سے جہنم میں جائے۔" وہ زور سے چلائی تھیں۔

"یہاں رہا تو گلا گھونٹ دے گا میرے بچے کا۔"

"نہیں... نہیں پلیز دروازہ کھولیں۔" وہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس نے پہلی بار آج مشاعل کو آواز دی تھی۔

"مشی... مشاعل پلیز دروازہ کھولو۔"

اس نے سن روم کی کھڑکی کو بھی بجایا۔ آوازیں دیں۔ پھر وہ کچن کی طرف آیا۔ وہ کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پاپا کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ سنی کے ساتھ کیسے کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اس کا بھائی ہے اور وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ ٹھیک ہے پاپا نے اس سے کہا ہے کہ وہ اس کے لیے مر گیا ہے۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے، لیکن وہ ایک بار کوشش کر کے پاپا کو بتانا چاہتا تھا۔ وہ لکھ کر بتا دے گا جیسے بھی ممکن ہوا، لیکن اسے پاپا کو بتانا ہے ہر صورت، کہ وہ سنی کا دشمن نہیں ہے۔ وہ وہیں برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک بار اٹھ کر وہ کچن کی طرف بھی گیا تھا۔ کچن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کچن کی کھڑکی کی جالی سے چہرہ چپکائے اندر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ شاید مینو کچن میں یا پھر مشاعل کی ممی ہی آ جائیں وہ ان کی منت کر لے لیکن کچن میں اندھیرا تھا۔ وہ پھر آ کر برآمدے میں دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا اور کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے

کی کوشش کرتا رہا تھا۔ بہت دیر بعد اندر سے مینو اور ممی کی مدھم سی آواز آئی تھی۔ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور آوازیں دینے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھلا تھا۔ یہ مشاعل کی ممی تھیں۔

"تم ابھی تک یہیں مرے ہوئے ہو۔"

انہوں نے اسے پاؤں سے ٹھڈا مارا تھا اور بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گیٹ کی طرف لے جانے لگیں تو مشاعل روتی ہوئی ان کے پیچھے آئی۔

"ممی! ایسا نہ کریں ممی! ہادی کو نہ ماریں۔"

لیکن انہوں نے اسے گیٹ سے باہر نکال کر گیٹ بند کر دیا۔ کچھ دیر وہ یونہی گیٹ کے پاس کھڑا رہا۔ صبح سے ہونے والی بارش عصر تک ہوتی رہی تھی۔ اس وقت بھی فضا میں خنکی تھی' لیکن اوپر آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اس نے فوراً" ہی جیب سے ہاتھ نکالا۔ جیب میں ایک مارکر اور چند سکے تھے۔ یہ مارکر اس کے دوست کا تھا' جو چھٹی کے وقت اس سے پہلے نکل گیا تھا اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے وہ اسے نظر آ گیا تو اس نے اسے جیب میں ڈال لیا تھا کہ وہ باہر ملے گا تو اسے دے دے گا' لیکن وہ اسے نہیں ملا تھا۔ وہ مارکر ہاتھ میں لیے کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گیٹ کے ساتھ دیوار پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا۔

"پاپا! میں نے سنی کو نہیں مارا۔ مشاعل کی ماما جھوٹ بولتی ہیں۔"

اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے پاپا کا انتظار کرنا تھا' لیکن پاپا پتا نہیں کب آتے۔ اسے آس پاس کے اندھیرے سے یکایک خوف محسوس ہونے لگا' اور وہ چلنے لگا۔ بغیر سوچے کہ اسے کہاں جانا ہے وہ چل رہا تھا۔ پگڈنڈی پر سفیدے کے درختوں سے ادھر۔ چونکا تو تب جب وہ گراؤنڈ کے پاس تھا۔ اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا کلب کی عمارت کے گیٹ پر مدھم روشنی کا پیلا بلب جل رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا گراؤنڈ کے باہر۔ زمین بارش کی وجہ سے گیلی تھی' لیکن اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا اور گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ اور میدان بھر گیا تھا۔ اس کے کانوں میں سیٹیوں اور تالیوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ بال کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اس کی رفتار چیتے کی سی تھی۔ اس نے جست لگائی' جھکا' پیر اوپر اٹھایا۔ گیند کو ٹھوکر لگی۔ وہ فضا میں بلند ہوئی۔ مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے سر سے گزرتے ہوئے گیند نے حیران کن موڑ کاٹا اور گیند نیٹ میں پہنچ چکی تھی۔ ساتھی کھلاڑیوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔

یکایک بادل گرجا تو وہ چونکا۔ گراؤنڈ کے کنارے وہ گیلی زمین پر بیٹھا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے تو آسمان پر سینکڑوں تارے چمک رہے تھے اور اب یک دم ہی تاریکی چھا گئی تھی اور پانی کے ننھے ننھے قطرے گرنے لگے۔ وہ بھیگ رہا تھا۔ بجلی چمکی تو اس نے چند میٹر کے فاصلے پر گول پوسٹ کو دیکھا۔ وہ اٹھا۔

اب وہ ہولے ہولے چلتا ہوا گول پوسٹ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پہلی بار گراؤنڈ کے اندر قدم رکھ رہا تھا اور گول پوسٹ کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اس کے الوژن نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بادل چند قطرے برسا کر چلے گئے تھے۔ آسمان پر پھر تارے چمک اٹھے تھے' اور وہ گول پوسٹ کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کب بیٹھا۔ کب وہیں بیٹھے بیٹھے گیلی زمین پر سو گیا۔

محی الدین صاحب نے صبح کمرے کی کھڑکی کھولی۔ مطلع صاف تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا' لیکن فضا میں روشنی تھی۔ کل بھی بارش کی وجہ سے فائنل ملتوی ہو گیا تھا۔ وہ گراؤنڈ کا جائزہ لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل کر نیچے اترے۔ اگر گراؤنڈ کی حالت اچھی ہو تو وہ آج ہی فائنل کروا دیں اور گھر جا سکیں۔

فاطمہ کا فون آیا تھا کہ گڑیا اپنے بابا کے لیے بہت اداس ہے۔ وہ خود بھی اداس ہو رہے تھے۔ جب ایگل کلب کی طرف سے انہیں بلوایا گیا تو وہ انکار نہ کر سکے۔ انہیں اپنے اس چھوٹے سے شہر سے جواب ضلع بن

چکا تھا۔ بہت محبت تھی اور ایگل کلب سے تو ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے اور عبدالهادی نے اس کلب کی طرف سے بہت سے میچ کھیلے تھے اور کلب کے آفس میں آج بھی ان کی جیتی ہوئی ٹرافیاں سجی تھیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گم کلب کے صدر گیٹ سے نکل کر میدان سے گزر کر گراؤنڈ میں پہنچے تو ٹھٹک کر رک گئے۔ گراؤنڈ کے اندر گول پوسٹ کے پاس کوئی تڑا مڑا پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے اور جھک کر اسے سیدھا کیا۔

وہ ہادی تھا..... وہی بچہ۔

وہ کب یہاں آیا اور یہاں کیوں سو رہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتے تھے، لیکن اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا اور پھر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ کیا وہ ساری رات یہاں سوتا رہا ہے۔ رات کو غالباً "اوس بھی پڑی ہوگی اور زمین بھی گیلی تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ماتھا آگ کی طرح تپ رہا تھا۔

"ہادی..... ہادی بیٹے!" لیکن وہ ہوش میں نہیں تھا۔

انہوں نے اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔ دس گیارہ سال کے دبلے پتلے بچے کا وزن ہی کیا تھا۔ وہ اسے دونوں بازوؤں پر اٹھائے کلب کی عمارت کی طرف جارہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ لاؤنج میں اندھیرا کیے کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ کھڑکی کے پردے سمٹے ہوئے تھے اور شیشوں سے اسٹریٹ لائٹ کی مدھم سی روشنی اندر آرہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر شیشے سے ناک چپکائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ سامنے غلام مصطفیٰ کے بیڈ روم کی بالکونی تھی جس کا دروازہ بند تھا، لیکن پھر بھی وہ وقفے وقفے سے ادھر دیکھتی تھی، لیکن نہیں جانتی تھی کیوں..... باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں جن کی خنکی میں برف کے ذرات اڑتے تھے اور بالکونی ویران پڑی تھی، پھر بھی اسے ادھر دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ ادھر اس کھڑکی کی طرف، جہاں مصطفیٰ رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی کھول دیتی تو ایک دم یخ بستہ ہوا اس کے چہرے سے ٹکراتی تو وہ کھڑکی بند کرکے ناک شیشے سے چپکالیتی۔ حالانکہ بالکونی ویران پڑی تھی اور سامنے والے گھر کی لائٹیں بند ہوچکی تھیں سوائے گیٹ پر جلتے مدھم سے بلب کے اور غلام مصطفیٰ سوچکا ہوگا۔ اور یہ والا کمرا جس کی بالکونی میں چند بار اس نے غلام مصطفیٰ کو دیکھا تھا، پتا نہیں مصطفیٰ کا بیڈ روم تھا یا اسٹڈی یا پھر.....

وہ یونہی لایعنی سی باتیں سوچتی رہی اور اٹھ اٹھ کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھتی رہی اور پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی، جب اس نے گاڑی کی اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی اور ساتھ ہی اونچا اونچا بولنے کی آواز۔ یہ یقیناً "مارتھا کی آواز تھی۔ مارتھا جو ایسی پارٹیوں کے بعد گھر آکر یوں ہی چیختی چلاتی تھی کیوں کہ وہ زیادہ پی جاتی تھی اور آج بھی لاؤنج کی ملگجی سی روشنی میں اس نے پال اور مارتھا کو اندر آتے دیکھا۔

پال نے مارتھا کو سہارا دے رکھا تھا جبکہ وہ خود بھی لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ لائٹ جلائے بغیر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

"تم زندگی بھر یوں ہی رہنا احمق بے وقوف۔"

مارتھا جو وہاں ہی رک گئی تھی، چلائی۔

"چلاؤ مت۔ تمہارے چلانے سے جوزی جاگ جائے گی۔"

"جوزی جاگ جائے گی۔" مارتھا پہلے زور سے ہنسی، پھر چیخی۔

"کیا وہ دو تین سال کی ننھی بچی ہے، جو تمہیں اس کے جاگ جانے کی فکر ہے۔"

اس کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی اور وہ جہاں کھڑی تھی، وہاں سے اسے جوزفین بیٹھی نظر نہیں آرہی تھی۔

"اب بس کرو پال..... !بس کرو۔ اس کے منہ میں لقمے بنا بنا کر ڈالنا۔"

وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے اسے گھور رہی تھی۔

"تمہیں غصہ کس بات پر ہے مارتھا! میں ابھی تک

سمجھ نہیں سکا۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ مجھے بتا کر آئی تھی کہ وہ گھر جا رہی ہے۔"

"تمہیں بتا کر۔ کیا تم میزبان تھے۔ اسے ایلین کو بتانا چاہیے تھا۔ اس سے معذرت کرنی چاہیے تھی۔ اگر ایسی ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو حالانکہ اس کی طبیعت ہرگز خراب نہیں تھی۔ اس نے بہانہ کیا ہو گا۔"

"بہانہ!" پال نے سوچا۔ "اس نے کہا تھا وہ گھر جا رہی ہے بس۔"

" اور جانتے ہو' مجھے کتنی شرمندگی ہوئی' جب ایلین نے مجھ سے پوچھا۔ وہ کہاں ہے اور میرے بجائے اس لمبے لڑکے نے جواب دیا کہ وہ اس فٹ بالر غلام مصطفیٰ کے ساتھ چلی گئی۔"

"وہ... وہ اسے کہاں سے مل گیا؟"

پال چونک کر سیدھا ہو گیا۔ اسے غلام مصطفیٰ کا کھیل پسند تھا اور جب وہ اپنے شہر میں رہتا تھا تو وہاں کے ایگل فٹ بال کلب کی طرف سے خود بھی کھیلتا تھا۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں۔

"وہ لمبا لڑکا ہی اسے اپنے ساتھ پارٹی میں لایا تھا۔ اور وہ تمہاری معصوم بیٹی اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں کہہ رہی ہوں پال! تمہاری لڑکی مسلمانوں سے بہت ہمدردی رکھتی ہے۔ سنبھالو اسے... وہ چار سال جو اس نے اپنے سوتیلے باپ کے گھر گزارے۔"

"نہیں۔" پال نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ مجھے خود جوزی نے بتایا تھا کہ وہ اپنی ممی کے ساتھ ہر سنڈے کو سروس کے لیے چرچ جاتی تھی اور اس کے باپ نے کبھی منع نہیں کیا۔" اس کے لہجے میں یقین تھا۔

"وہ بہت نائس آدمی تھا۔"

"تب ہی تمہاری سابقہ بیوی مسلمان ہو گئی تھی۔" مارتھا تمسخر سے ہنسی۔

"وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوئی تھی۔"

"اچھا!" مارتھا کا اچھا خاصا لمبا تھا' پھر وہ تھوڑا سا آگے بڑھی۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی۔

"سنو پال! آج ایلین نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہا۔ وہ جوزی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ بھلے کل ہی وہ اس کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائے۔"

"مارتھا!" پال کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔"

"اچھا! یہاں کون تمہاری بیٹی سے شادی کرے گا؛ تم دیسی عیسائی.... ہونہہ۔" مارتھا نے دائیں طرف منہ کرکے تھوکا۔

"میں پاکستان چلا جاؤں گا اور وہاں دھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔"

مارتھا لحہ بھر آنکھیں میچ کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی پوری آنکھیں کھولیں۔

"تو ایلین بھی کہہ رہا تھا کہ اگر دونوں میں انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تو وہ جلد شادی کرلیں گے' لیکن ابھی نہیں۔"

"ہاں ابھی نہیں' جب تین چار بچے ہو جائیں گے تب اور تب تک اگر انڈراسٹینڈنگ نہ ہوئی تو بچوں سمیت گھر سے باہر... ہے نا... ایسا ہی نا...."

پال کی آواز بلند ہو گئی تھی اور گود میں رکھے جوزفین کے ہاتھ ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ ایک بار پھر اس کی وجہ سے دونوں میں لڑائی ہونے جا رہی تھی۔

"چلاؤ مت۔" مارتھا کی آواز بھی بلند ہوئی۔

"سوچو... سوچو ذرا ایک دیسی عیسائی کی دیسی بیٹی کے انگریز بچے... تم اقلیت سے اکثریت بن جاؤ گے' تمہارے نواسے اور نواسیاں...."

وہ لہرائی اور فضا میں دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر گھومی۔

"انگریز...."

"چپ کرو۔" پال اور بھی بلند آواز میں چیخا اور لہراتے ہوئے مارتھا نے یک دم لائٹ جلادی۔ جوزفین کی آنکھیں یک دم تیز روشنی نے چندھیا دیں۔ اس نے ایک دم آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ مارتھا نے اسے دیکھ لیا۔

"تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" مارتھا اب اس سے مخاطب تھی۔

"میں... میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔" مارتھا نے اوپر سے نیچے تک مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی پارٹی ڈریس میں تھی۔

"تم تب سے اب تک یہاں بیٹھی ہو۔" بایاں ہاتھ کمر پر رکھے مارتھا تمسخر سے ہنسی۔

"اور وہ تمہارا بوائے فرینڈ... کیا وہ تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منا کر چلا گیا۔"

"وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں، میں نے صرف گھر تک لفٹ لی تھی... وہ یہاں ہی رہتا ہے سامنے تو...

اور وہ فٹ بال کا کھلاڑی ہے غلام مصطفیٰ۔" اس نے پال کی طرف دیکھا۔ اس نے اس طرح پال کو مصطفیٰ کے متعلق بتانے کا نہیں سوچا تھا۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ' اپنے کمرے میں جاکر سو جاؤ۔ اور تمہیں ہمارا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی ہنی!" پال کا لہجہ نرم تھا۔ اس نے ممنون نظروں سے پال کی طرف دیکھا اور جانے کے لیے قدم بڑھایا۔

"نہیں...!" مارتھا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے جانے سے روک دیا۔ جوزفین کو اس کی انگلیاں اپنے بازو میں چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔

"بات تمہارے متعلق ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ تم بھی سن لو۔ میں نے ایلی سے کہا ہے کہ تم دو تین روز تک اس کا اپارٹمنٹ ___ شیئر کرو گی اور..."

"نہیں..." اس کے ہونٹوں سے باریک سی آواز نکلی تھی اور پال دھاڑا تھا۔

"نہیں... مارتھا! میں کہہ چکا ہوں کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"تمہارے پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہوتا کیا میں نہیں جانتی؟"

"جو کچھ بھی ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا۔ میری بہنوں کی اور میرے بھائیوں کی اور میرے دوسرے رشتہ داروں کی سب بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ بیٹیاں رخصت ہو کر گھروں سے گئیں... ایسے نہیں۔"

"تو ہم بھی اسے رخصت کر دیں گے میں اور تم۔ دونوں اسے ایلی کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ آئیں گے۔ تمہاری اس چوچی کو۔"

"مارتھا... مارتھا خداوند یسوع مسیح کے لیے۔ یہ خناس دماغ سے نکال دو۔ ہم..."

"باس...!" مارتھا نے ہاتھ بلند کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود صوفے پر دھپ کر کے بیٹھی اور اسے گھورنے لگی۔ وہ پال کے صوفے کے بائیں طرف پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ اسے لگا' جیسے وہ گر جائے گی؛ اگر اس نے صوفے پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا۔

"تم...!" اس نے انگلی اٹھا کر جوزفین کی طرف اشارہ کیا۔

"صبح تک فیصلہ کر لو... نہیں تو صبح میں تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گی... یہاں کے لاء کے مطابق اب تم ہماری ذمہ داری نہیں رہی ہو۔ تمہیں ایلی کے پاس نہیں جانا' مت جاؤ... لیکن یہاں سے دفعہ ہو جاؤ۔ جہاں بھی جانا ہے جاؤ... اٹھارہ سال کے بعد سب خود کماتے ہیں... تم انیس سال کی ہونے والی ہو۔ جاب کرو۔ اپنا اپارٹمنٹ لو۔ کسی کے ساتھ شیئر کر لو یا جو بھی کرو... یہ گھر چھوڑ دو... اچھی طرح سن لیا ہے تم نے۔"

اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا۔ پال پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ ہمیشہ پی کر آؤٹ ہو جاتی ہو۔ منع کر رہا تھا میں زیادہ مت پیو۔ لیکن وہ صحیح ہے نا کہ سال مفت دل بے رحم۔" وہ ہنسا۔

"وانت اندر کرو۔ یہ بکواس نہیں ہے۔"

"اگر یہ بکواس نہیں ہے تو یہ اکیلی کیسے رہے گی۔ نہیں رہ سکتی... نیا سمسٹر شروع ہونے پر میں اسے کالج میں داخل کروانے والا ہوں۔ میں اپنی کمائی خرچ کروں گا اس پر۔"

"پچھلے دو سال سے تم یہی کہہ رہے ہو اور تمہاری کمائی۔" مارتھا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مار کر زور سے

ہنسی۔

"ہم دونوں کی کمائی سے بمشکل گھر کا کرایہ بل اور ٹیکس ادا ہوتے ہیں۔ اور یہ جو ہم کھاتے ہیں نا مہینے میں ایک بار چکن اور انڈے۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگی اتنا کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے پال کی طرف دیکھا۔ "پھر یہ بھی نہیں ملیں گے بلکہ فاقے۔۔۔ سنا تم نے۔"

"میں اوور ٹائم کرلوں گا۔"

"واہ! تم اوور ٹائم کرو گے۔" اس نے تالی بجائی۔

"پادری جیکب کے لاڈلے بیٹے تم۔۔۔ اور اس سے اپنی بیٹی کو پڑھاؤ گے۔"

اس نے پھر تالی بجائی اور دیر تک بجاتی رہی۔

وہ یقیناً "نشے میں تھی۔۔۔ جوزفین کو یقین تھا' لیکن نشے میں بھی وہ ناک کرنشانے لگا رہی تھی۔

"جو بھی کرو۔" اس نے تالی بجانا بند کی۔ "یہ کل سے یہاں نہیں رہے گی۔ اگر رہنا ہے تو اپنے حصے کا خرچ دے اور کمرے کا کرایہ۔"

مارتھا ذرا سی نرم پڑی تھی۔

"مارتھا! چلو پاکستان چلیں۔ وہاں ہم کتنے خوش تھے' اور ہماری کتنی عزت تھی۔ تم اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ گھر میں ماسی کام کرنے آتی تھی۔ تمہیں کام نہیں کرنا پڑتا تھا اور۔۔۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مارتھا کے پاس زمین پر بیٹھ کر اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے۔

"پلیز چلو پاکستان واپس۔ وہاں ہماری جوزی پڑھ کر ڈاکٹر بنے گی۔ یہ جب پیدا ہوئی تھی تو اس کے دادا نے کہا تھا اسے ہم ڈاکٹر بنائیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" مارتھا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اتنے سالوں سے تمہارا بھائی کوشش کررہا تھا اور اب جبکہ ہمیں برٹش پاسپورٹ ملنے والے ہیں ہم یہاں سے چلے جائیں احمق!"

"لیکن میں یہاں ناخوش ہوں مارتھا! بہت ناخوش۔"

"لیکن میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں سب مجھے برٹش ہی سمجھتے ہیں۔ خالص انگریز۔"

"ہاں جب تک تم نہ بولو۔ جب تم بولتی ہو تو بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔"

پال نے قہقہہ لگایا اور اٹھ کر دور کھڑا ہوگیا۔ وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔

"بکومت۔" مارتھا کی انا پر ضرب پڑی تھی کہ اس نے ٹیبل پر پڑا گلدان اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ جو اسے نہیں لگا تو مارتھا کے ہاتھ میں جو چیز لگی وہ اٹھا اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے لگی۔ کشن' لکڑی اور پیتل کے ڈیکوریشن پیسز جو وہ پاکستان سے لائے تھے۔ صوفے کے پیچھے دبکی جوزفین نے سوچا شکر ہے کوئی کرسٹل یا شیشے کی چیز نہیں ہے یہاں۔ پال بندروں کی طرح پورے کمرے میں پھرتا ہوا مارتھا مارتھا کہہ رہا تھا' پھر آخری چیز اس کی طرف پھینک کر مارتھا کھٹ کھٹ کرتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئی تو جوزفین نے صوفے کے پیچھے سے نکل کر دیکھا۔ لاؤنج میں سامان بکھرا پڑا تھا اور پال بیچوں بیچ کھڑا حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ بیٹھ گیا اور یکایک وہ رونے لگا اونچا اونچا بلند آواز میں۔ یقیناً "وہ بھی نشے میں تھا اور مارتھا کی طرح اس نے بھی بہت پی لی ہوگی۔ جوزفین ہولے ہولے چلتی اس کے قریب آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پاپا!" پال نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مارتھا بہت ظالم ہے جوزی۔۔۔ وہ میری بات نہیں سمجھتی۔ آؤ ہم دونوں پاکستان چلتے ہیں!"

"پاکستان ہاں ٹھیک ہے لیکن۔۔۔"

اور یہ لیکن پتا نہیں کیسے اس کے ذہن میں آکر اٹک گیا۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر پال کو دیکھنے لگی۔ وہاں غلام مصطفیٰ تو نہیں ہوگا۔ اگر وہ پاکستان چلی گئی تو پھر کبھی غلام مصطفیٰ کو نہیں دیکھ سکے گی اور کبھی اس سے نہیں مل سکے گی۔

اس کا لاشعور اس سے کہہ رہا تھا، لیکن وہ پال کو دیکھ رہی تھی اگر آج سے پہلے پال نے یہ کہا ہوتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتی۔

اسے پاکستان بہت پسند تھا اور پاکستان میں بھی اپنے باپ کا شہر، جہاں گرجے سے منسلک ان کا گھر تھا۔ گرجے کی طرح ہی سرخ اینٹوں سے بنا انگریزوں کے زمانے کا اور جہاں گرجے کی پیشانی پر سن تعمیر 1942ء لکھا تھا اور گھر سے منسلک چھوٹا سا باغیچہ جس میں دادا سردیوں میں اپنی آرام دہ کرسی پر دراز بائبل پڑھا کرتے تھے اور دادی پاس ہی بیٹھی سوئٹر بنتی تھیں۔ وہ وہاں اس گھر میں جا کر بہت خوش ہوتی، لیکن یہ تو تب ہوتا جب اسے غلام مصطفیٰ نہ ملا ہوتا، لیکن اب تو وہ غلام مصطفیٰ سے ملی تھی اور اسے لگتا تھا، جیسے اس کے پاؤں بندھ گئے ہوں اور وہ اب یہاں سے نہ ہل سکے گی۔ کیوں کہ یہاں غلام مصطفیٰ ہے۔ وہ غلام مصطفیٰ کی وجہ سے یہاں سے کیوں نہیں جانا چاہتی تھی، اس وقت وہ نہیں جانتی تھی، لیکن لاشعور نے شعور میں یہ بات منتقل کر دی تھی اور اب وہ پال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ممی سچ کہتی ہیں۔ مارشل انکل سات سال سے کوشش کر رہے تھے اور اب جبکہ ہمیں پاسپورٹ ملنے والے ہیں تو ہمیں۔۔۔" اس نے پال کے کندھے پر رکھے ہاتھ ذرا سا دبا کر اسے تسلی دی۔

"ایک بار ہمیں برٹش پاسپورٹ مل جائیں تو پھر ہم چلے جائیں گے اور جب کبھی آنا ہوا تو ہم آسکتے ہیں۔"

پال نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "بروٹس تم بھی۔" والی نظر سے، لیکن اس نے نظریں چرالیں۔

"اور میں جاب کرلوں گی پاپا۔۔۔ ممی کے اسٹور پر ایک سیلز گرل کی جگہ ہے یا پھر کہیں بھی۔"

"اور جاب کر کے تم گھر چھوڑ دو گی۔"

"نہیں۔ میں یہیں رہوں گی اور ممی کو کرایہ دوں گی۔"

"ہائے میں یہاں کیوں آیا!" پال نے عورتوں کی طرح سینے پر ہاتھ مارا۔

وہ بہت سنجیدہ اور بردبار سا تھا، لیکن اس وقت نشے میں اسے خود پر اختیار نہیں تھا۔ وہ وہاں پاکستان میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ یہاں کے ماحول کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ بہت سارے لوگ قبول کر لیتے ہیں اور یہاں زیادہ خوش رہتے ہیں، لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ اسے جوزفین کے لیے یہ سب پسند نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک پادری کا بیٹا تھا یا پھر اس کی اپنی کیمسٹری ہی ایسی تھی کہ اسے جوزفین کے لیے یہ قبول نہیں تھا۔

"تم۔۔۔ تمہارا دل چاہتا ہے اپنی ممی کے پاس جانے کو۔" اب اس نے پینترا بدلا تھا۔

"میں تمہیں دھوکے سے لے آیا تھا تمہاری ممی کے پاس سے تو تم۔"

"نہیں۔ مجھے ممی کے پاس نہیں جانا۔"

وہ ممی کے بجائے پال کے ساتھ زیادہ خوش تھی اور مارتھا بھی جب تک پاکستان میں تھی اس کا رویہ ٹھیک تھا۔ ممی کے پاس جانے کا خیال تو اسے کبھی کبھی اس لیے آتا تھا کہ کیا خبر۔ اور پتا نہیں وہ۔ پال پھر رونے لگا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ رہوں گی ہمیشہ۔۔۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اس نے پال کا سر سینے سے لگالیا۔ پال کے سر کو چوما اور ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ بالکل ایسے جیسے پال کی ماں اسے تھپکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح بہت چمکیلی اور روشن تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر سیدھی اس کے بیڈ پر آرہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ کمرا اس کا نہیں تھا۔ یہ تو کسی ہاسپٹل کا کمرا تھا۔

اس نے لوہے کے پایوں والے بیڈ کو دیکھا۔ ایسا ہی ایک اور بیڈ اس کے بیڈ کے بائیں طرف والی دیوار کی طرف لگا تھا، لیکن وہ خالی تھا۔ میں یہاں کیسے۔ اس

نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اسے سب کچھ یاد آتا گیا۔

مشاعل کی ممی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور پھر وہ۔۔۔ ہاں وہ وہاں گول پوسٹ میں بیٹھا تھا پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ تب ہی واش روم کا دروازہ کھول کر تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے محی الدین باہر نکلے۔ اسے بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر مسکرائے۔

"ہیلو ینگ بوائے! کیسے ہو تم؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے اور انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"اگر اس صبح تم مجھے گراؤنڈ میں نہ ملتے تو میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا۔ تم جانتے ہو تمہیں نمونیہ کا شدید اٹیک ہوا تھا اور تمہارے بچنے کی امید نہیں تھی۔ تم تین دن آئی سی یو میں رہے اور پھر دو دن پہلے تمہیں یہاں شفٹ کیا گیا تھا۔ تمہیں آج یہاں چھٹا دن ہے۔"

"کیا خبر بابا آگئے ہوں۔" وہ سوچ رہا تھا۔

"میں نے بہت کوشش کی تمہارے گھر والوں کے متعلق، لیکن پتا نہیں چل سکا۔ چھ دنوں میں کوئی شخص بھی تمہیں ڈھونڈتا ہوا نہیں آیا۔ کسی نے کوئی اعلان نہیں کروایا۔ میں سوچ رہا تھا آج تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو تھانے سے پتا کروں شاید کسی نے کوئی رپورٹ درج کروائی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میرے بابا گھر پر نہیں تھے اور۔" آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ "مشاعل کی ممی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔"

وہ رک رک کر سب کچھ بتاتا چلا گیا اور محی الدین صاحب تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔

"اب تم کیا کرو گے۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں۔"

"لیکن اگر بابا نہ آئے ہوئے تو ممی مجھے گھر میں نہیں گھسنے دیں گی۔"

"ہوں!" وہ سوچنے لگے۔ ان کا دل اس بچے کے لیے گداز ہو رہا تھا، جس کی سیاہ خوب صورت آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس بچے سے انہیں بڑی اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہارے رشتہ دار جن کے ہاں تم اپنے بابا کے آنے تک ٹھہر سکو۔" کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے دادا اور دادی زندہ نہیں ہیں۔ ایک چچا اور پھپھو ہیں، دونوں ناروے میں رہتے ہیں اور صرف ایک ماموں تھے، جو بابا کی ڈیتھ سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ میری ماما کہتی تھیں، وہ مجھے اس لیے ہادی کہہ کر بلاتی ہیں، کیوں کہ میرے ماموں کا نام بھی ہادی تھا۔" یاں اور ماموں کے ذکر پر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"میرے ماموں پلیئر تھے۔ اگر ان کا ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو آج پاکستان میں۔"

"تمہارے ماموں پلیئر تھے اور ان کا نام عبدالہادی تھا۔" محی الدین نے بے قراری سے پوچھا۔ "تب ہی تو۔ تب ہی تو تم اتنے اپنے سے لگ رہے تھے۔ تم کلثوم آپا کے بیٹے ہو نا ہادی! ہاں مجھے پتا ہے آپا نے تمہارا نام ہادی رکھا تھا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ہادی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میرا واحد دوست۔ اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ آپا۔۔۔ آپا کا انتقال ہو گیا۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ "میں بھی تو پہلے پاکستان میں نہیں تھا اور اب آیا تو لاہور ہی سیٹل ہو گیا۔ جب ہادی زندہ تھا تو میں اکثر ہادی کے ساتھ آپا کے گھر جاتا۔ تو وہ کھانا کھلائے بغیر آنے نہ دیتی تھیں۔ آپا کو ہادی سے بہت پیار تھا کیوں کہ ہادی بہت چھوٹا سا تھا، جب ہادی کے والدین کا آگے پیچھے انتقال ہو گیا تھا اور خود ان کی اولاد نہیں تھی۔"

نرس اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

"ناشتا کیا؟" اس نے ہادی سے پوچھا۔
"نہیں بستر ابھی اٹھا ہے۔" انہوں نے نرس کی طرف دیکھا۔
"کیا آج میں اسے گھر لے جاسکتا ہوں۔"
"ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیں ایک بار۔ میرے خیال میں یہ بہت بہتر لگ رہا ہے۔"
اس نے بخار چیک کیا اور ان کی طرف دیکھا۔
"ناشتا کروا کے یہ دوا دے دیں۔" اس نے ٹرے میں سے کچھ گولیاں اٹھا کر انہیں دیں اور فائل اٹھا کر اس میں ٹمپریچر نوٹ کیا۔
"کیا ابھی ٹمپریچر ہے۔" انہوں نے پوچھا۔
"ہاں' لیکن زیادہ نہیں۔ ہنڈرڈ ہے۔" نرس بتا کر چلی گئی تو وہ اس کے لیے ناشتا لینے چلے گئے۔ وہ خاموش لیٹا کھڑکی سے چھن چھن کر آتی دھوپ کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ نہ پاپا کے متعلق' نہ مشاعل کی ممی کے متعلق۔ بس خالی خالی نظروں سے کبھی کھڑکی کی طرف دیکھتا اور کبھی پورے کمرے میں نظر دوڑاتا اور پھر آنکھیں بند کرلیتا۔ کچھ دیر بعد وہ ناشتا لے کر آگئے۔ اس نے صرف آدھا سلائس کھایا تھا وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ انہوں نے اسے دوائیں دیں اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔
"تم پریشان مت ہو بیٹا! میں خود تمہارے پاپا سے بات کروں گا اور انہیں سمجھاؤں گا۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"
"پاپا آپ کی بات مان لیں گے؟" وہ متذبذب سا انہیں دیکھ رہا تھا۔
"کیوں نہیں۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔ جب ہادی زندہ تھا تو کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔" وہ مسکرائے۔
"تم اب لیٹ جاؤ۔" وہ خاموشی سے لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد ہی سو گیا۔ پچھلے دو دن بھی وہ دوا کے زیر اثر سوتا ہی رہا تھا۔ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے' لیکن انہیں جانا تھا۔ پچھلے پانچ دنوں سے وہ اس کے پاس ہی اسپتال میں تھے۔ پہلے تین دن تو اس کی حالت بہت ہی خراب تھی' لیکن آج انہیں ہر صورت حبیب الرحمٰن سے ملنا تھا۔ انہیں لاہور سے آئے بہت دن ہوگئے تھے۔ فاطمہ اور گڑیا بہت پریشان ہوں گی۔ وہ جانتے تھے' لیکن وہ اسے یوں بے یارومددگار چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔
وہ عبدالہادی کا بھانجا تھا' لیکن اگر وہ عبدالہادی کا بھانجا نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اسے یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ ایک وارڈ بوائے کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ اسپتال سے نکلے۔ باہر نکلتے ہی انہیں تانگہ مل گیا تھا اور حبیب الرحمٰن کے گھر تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ سفیدے کے درختوں سے گزر کر وہ وہی گھر تھا جس میں کئی بار وہ ہادی کے ساتھ آپا سے ملنے آئے تھے۔ بیل دینے پر ملازمہ نے گیٹ کھولا اور ان کے استفسار پر بتایا کہ "صاحب گھر نہیں ہیں۔ کراچی گئے ہوئے ہیں۔"
"اچھا!"
وہ سوچ میں پڑ گئے۔ "بیگم صاحبہ تو گھر پر ہیں نا؟"
"جی۔!" ملازمہ نے سر ہلایا۔
"تو بیٹا! پھر ان سے جاکر کہو کوئی ملنے آیا ہے۔"
اور کچھ دیر بعد ہی وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے مشاعل کی ممی سے بات کر رہے تھے۔
"وہ ابھی تک مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا۔ بہت کمزور ہے۔" ہادی کی بیماری اور اس کے ملنے کی تفصیل بتا کر انہوں نے کہا۔
"میں چاہتا ہوں۔ آپ اسے معاف کردیں۔ بچہ ہے یقیناً" کوئی غلطی ہوگئی ہوگی۔ میں آج شام اسے اسپتال سے لے آؤں گا۔"
"ہرگز نہیں۔" وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے بہت اچھی طرح بات کر رہی تھیں۔ یک دم ہی ان کا لہجہ بدل گیا۔
"حبیب نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ ایسے آوارہ لڑکے کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتے۔"
وہ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
"لیکن مجھے علم ہوا تھا کہ حبیب بھائی کافی دنوں سے

کراچی گئے ہوئے ہیں۔ بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بڑے دل بڑا کر لیتے ہیں۔ پلیز آپ بھی اسے معاف کردیں۔ میں مزید اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے لاہور جانا ہے۔ وہ کہاں جائے گا۔"

"میری طرف سے جہنم میں جائے۔" انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ "اس گھر میں تو نہیں آسکتا۔ ٹانگیں توڑ دوں گی اس کی۔ اگر اس نے یہاں قدم رکھا تو بتا دینا اس کو۔"

وہ بہت دل گرفتہ سے وہاں سے واپس آئے تھے۔ ان کی ہزار منتوں کے باوجود بھی وہ اسے گھر رکھنے پر تیار نہیں تھیں۔

یہ عورت اسے جینے نہیں دے گی' میں اگر اسے اس کے گھر چھوڑ بھی جاؤں تو وہ پھر اسے گھر سے نکال دے گی تب یہ کہاں جائے گا۔ کاش حبیب بھائی سے ملاقات ہو جاتی۔ انہوں نے سنا تھا کہ دوسری شادی کے بعد اکثر مردوں کے لیے ان کی اولاد پرائی ہو جاتی ہے اور انہیں یقین نہیں آتا تھا اور اب۔۔۔ حبیب الرحمٰن کے ہاں کافی عرصہ بعد اولاد ہوئی تھی' جب آپا تقریباً" مایوس ہو چکی تھیں' جب وہ وہاں تھے۔ عبدالهادی زندہ تھا تو حبیب الرحمٰن اور وہ اولاد کے لیے منتیں مانتے پھرتے تھے اور حبیب الرحمٰن نے منتوں اور مرادوں سے ملنے والی اولاد کو بھلا دیا تھا۔ وہ حبیب الرحمٰن کے گھر سے اسپتال تک مسلسل ہادی کے متعلق ہی سوچتے رہے تھے۔

عبدالهادی ان کے جان سے زیادہ عزیز دوست کی بہت ساری مشابہت لیے یہ بچہ انہیں چند ہی دنوں میں بہت عزیز ہو گیا تھا۔ وہ اسے یوں دربدر بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

وہ اسپتال واپس آئے تو ہادی جاگ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"فائنل میں کون جیتا تھا؟"

"لیاقت میموریل!" انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم جاگنے کے بعد سے اب تک یہی سوچتے رہے ہو؟" ذرا سا مسکرایا۔

"مجھے پتا تھا۔ وہی جیتیں گے۔ محفوظ خان بہت اچھا گول کیپر ہے اور ان کا کپتان بھی زبردست ہے۔ درحقیقت ان کے سارے ہی کھلاڑی زبردست تھے۔"

"تمہیں فٹ بال سے بہت دلچسپی ہے؟" ان کی آنکھوں میں یک دم چمک پیدا ہوئی تھی۔

"میں تمہیں فٹ بالر بناؤں گا۔" وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

"تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گے؟" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"آپ مجھے اپنے گھر رکھ لیں گے؟" وہ بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں اب اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ مشاعل کی ممی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور پاپا نے بھی کہا تھا کہ وہ میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں ان کے لیے مر گیا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ سنی!" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"اور مجھے ایک بار پاپا کو بتانا ہے کہ میں نے سنی کو نہیں گرایا۔"

"اوکے ریلیکس!" انہوں نے اس کے بازو تھپتھپائے۔

"میں نے پتا کروایا تھا ابھی تمہارے پاپا نہیں آئے۔ کیا تمہیں اپنے پاپا کا کوئی کانٹیکٹ نمبر پتا ہے۔ وہ کراچی میں کہاں ٹھہرتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ وہ زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ وہاں فاطمہ اور گڑیا اکیلی تھیں۔ اور وہ عبدالهادی کے بھانجے کو یوں بے یارومددگار چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔ کیا خبر کن غلط ہاتھوں میں چلا جائے اور روز محشر وہ عبدالهادی کا کیسے سامنا کریں گے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ عورت اسے گھر میں نہیں گھسنے دے گی۔ وہ ہادی کو اسپتال سے لے کر ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ ہادی سے گھر کا نمبر لے کر

انہوں نے کئی بار فون کیا' لیکن ہر بار یہی جواب ملا کہ حبیب الرحمٰن صاحب ابھی کراچی سے نہیں آئے۔

ہوٹل میں آئے بھی انہیں تین دن ہوگئے تھے۔ اب مزید یہاں ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ کیا خبر ان سے جھوٹ بولا جا رہا ہو اور حبیب الرحمٰن واپس آگئے ہوں۔ تب ایک بار پھر وہ ہادی کو بتا کر اس کے گھر گئے اور گیٹ پر آنے والی ملازم لڑکی نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے اور تب انہوں نے اس لڑکی کو اپنا لاہور کا فون نمبر دیا اور کہا کہ "جب تمہارے صاحب آجائیں تو انہیں میرا نمبر دینا اور کہنا کہ وہ مجھے فون کرلیں۔ ہادی میرے پاس ہے۔ ہادی کا ضرور بتانا۔"

انہوں نے اسے تاکید کی تھی اور تب ہادی کو بتا کر کہ اس کے پاپا ابھی تک واپس نہیں آئے اور وہ مزید یہاں رک نہیں سکتے' جب اس کے پاپا آجائیں گے تو وہ اسے لاہور سے لے آئیں گے۔ تاہم اگر وہ یہاں کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں جانا چاہے تو وہ اسے ادھر چھوڑ سکتے ہیں۔

"نہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔" وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔

اور وہ اسے لاہور لے آئے۔

☆ ☆ ☆
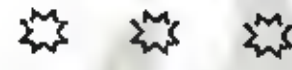
"فاطمہ! یہ عبدالہادی کا بھانجا ہے۔" انہوں نے فاطمہ کو ساری تفصیل بتائی۔ "اسے اپنے ہادی کی جگہ سمجھو۔ جیسے اللہ نے ہمارا ہادی ہمیں واپس کردیا ہے۔"

"لیکن یہ ہمارا ہادی کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کا باپ ایک دن اسے واپس لے جائے گا۔" وہ پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انہیں اپنا بیٹا یاد آگیا تھا' جس کا نام محی الدین نے اپنے مرحوم دوست کے نام پر عبدالہادی رکھا تھا' لیکن جو صرف تیرہ سال کی عمر میں جدا ہوگیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے فاطمہ! کہ اس بچے کو قدرت مجھ تک لائی ہے ورنہ اس رات وہ بھٹک کر کہیں اور بھی جاسکتا تھا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید قدرت مجھ سے اور اس سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ ہمارا ہادی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خواب ایک بار پھر میری آنکھوں میں اتر آیا ہے' جو میں نے اپنے ہادی کے لیے دیکھا تھا۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا بیٹا آگیا تھا۔ وہ کیسے کس طرح اچانک ان کی زندگیوں سے نکل گیا تھا۔

"پھر بھی فاطمہ! میں ایک بار حبیب بھائی سے ضرور ملوں گا' میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی اسے اپنے خاندان سے جدا کرنے کا نہیں سوچا' لیکن اگر انہیں اس کی ضرورت نہیں۔ وہ عورت اسے رکھنے کو تیار نہیں تو میں اسے حبیب بھائی سے مانگ لوں گا۔ تب کیا تم اسے اپنے ہادی کی جگہ دے سکو گی' پیار کرسکو گی؟"

"یہ اتنا معصوم اور پیارا ہے۔ اس سے کون پیار نہیں کرے گا۔ بڑی بدنصیب ہے وہ عورت جس نے اس ہیرے کو ٹھکرا دیا ہے۔"

فاطمہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ مطمئن سے ہوگئے تھے اور لاؤنج میں خاموش بیٹھے ہادی کو گڑیا بہت شوق اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

"تم اب یہاں ہی رہو گے نا ہمارے گھر؟"

"پتا نہیں۔" اس نے اس پیاری سی لڑکی کو دیکھا۔ جو اسے خود سے تھوڑی بڑی لگی تھی اور جس کے بال مشاعل کی طرح کٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس نے دو موٹی موٹی چوٹیاں بنا رکھی تھیں۔

"تم کس کلاس میں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ففتھ میں۔"

"اور میں سکس میں ہوں۔" اس نے بتایا۔

تب ہی محی الدین کمرے سے نکلے۔

"بیٹا! بھائی کو آرام کرنے دو۔ وہ ابھی بیماری سے اٹھا ہے اور کمزور ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔ مجھے ویسے بھی ہوم ورک کرنا ہے۔"

اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے وہ

مشاعل کی طرح لگی مہربان اور ہمدردسی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ اسکول سے آکر اس سے اپنے اسکول کی باتیں کرتی۔ کبھی کبھی اپنے اسکول کی کینٹین سے اس کے لیے چاکلیٹ لے کر آتی۔ اس کے لیے دعا کرتی کہ وہ جلد ٹھیک ہو کر اس کے ساتھ اسکول جانے لگے۔ فاطمہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کا بھائی ہے اور اب ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گا اور پھر کئی دن گزر گئے۔ وہ ہولے ہولے صحت مند ہونے لگا۔ رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی۔

محی الدین اور فاطمہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ فاطمہ تو اسے بہت چاہنے لگی تھیں لیکن وہ پھر بھی بے چین سا رہتا اور دن میں ایک بار گھر ضرور فون کرتا تھا۔ لیکن کبھی مشاعل کی ممی فون اٹھاتیں اور کبھی مینو۔ جب بھی مینو فون اٹھاتی وہ پاپا کے متعلق ضرور پوچھتا۔ لیکن ہر روز یہی جواب ملتا کہ وہ ابھی تک کراچی سے نہیں آئے۔

''وہ اتنے زیادہ دنوں کے لیے کبھی کراچی نہیں گئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرتے تھے وہاں۔''

اس روز فون پر مینو سے بات کرنے کے بعد اس نے محی الدین کو بتایا تھا۔

''مجھے لگتا ہے مینو جھوٹ بول رہی ہے۔ اسے یقینا" مشاعل کی ممی نے منع کر دیا ہو گا۔''

لیکن محی الدین کو پھر بھی ان کے فون کا انتظار تھا۔ جبکہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوس ہوتا جا رہا تھا۔

''لیکن اگر وہ آجاتے تو تمہارا معلوم کرنے کے لیے ایک بار تو فون کرتے۔ میں اپنا فون نمبر دے آیا تھا۔ وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے ہوں گے۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

''نہیں۔ پاپا نے کہا تھا تم میرے لیے مر گئے ہو۔''

اور وہ ان کے لیے مر ہی تو گیا تھا تب ہی تو انہوں نے فون نہیں کیا تھا۔

''بابا! آپ بھائی کو کب اسکول میں داخل کروائیں گے۔ اب تو یہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔'' گڑیا کو اس کی پڑھائی کی بہت فکر تھی۔ ناشتا کرتے ہوئے اس روز اچانک گڑیا نے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے اب اسے اسکول داخل کروادیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے لیکن ایک بار مجھے حبیب بھائی سے بات کرنی ہے۔'' انہوں نے گڑیا کی بات کا جواب دینے کے بجائے فاطمہ کی طرف دیکھا' جو آملیٹ اس کی پلیٹ میں رکھ رہی تھیں۔

''بیٹا! یہ تھوڑا سا کھالو۔ تم تو کچھ بھی نہیں کھا رہے ہو۔'' اور وہ جو گڑیا اور محی الدین کی طرف متوجہ تھا' چونک کر کھانے لگا۔

''فاطمہ! کیا خیال ہے تمہارا۔ کل میں گاؤں نہ چلا جاؤں اور خود جاکر حبیب بھائی کا پتا کروں۔'' انہوں نے فاطمہ سے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ اس کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ گڑیا صحیح کہہ رہی ہے۔ کوئی فیصلہ ہو جائے تو بچہ اطمینان سے پڑھائی کرے۔''

اور دوسرے ہی دن وہ ہادی کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں پہنچ گئے۔ گیٹ مینو نے کھولا تھا اور پوچھنے پر بتایا کہ صاحب تو دبئی چلے گئے ہیں۔

''تو مینو! تم نے پاپا کو میرا نہیں بتایا۔ میں روز فون کرتا تھا۔'' اس نے پوچھا۔

''وہ۔'' تب ہی اندرونی گیٹ کھلا اور مشاعل کی ممی گیٹ سے باہر آئیں۔ مینو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مشاعل کی ممی ادھر ہی آرہی تھیں۔

''ہاں۔ جی بتایا تھا۔ لیکن وہ صاحب نے کہا وہ کسی ہادی کو نہیں جانتے۔'' مشاعل کی ممی قریب آگئی تھیں۔ ''جی وہ کہتے ہیں ہادی نام کا کوئی بیٹا نہیں ہے ان کا۔''

مینو نے ایک معذرت کرتی نظر ہادی پر ڈالی اور پیچھے ہٹ گئی۔ مشاعل کی ممی نے مینو کو اندر جانے کے لیے کہا۔ ان کے چہرے سے جھلکتی مکاری کو محی الدین نے ناگواری سے دیکھا۔ مشاعل کی ممی نے ایک نفرت بھری نظر ہادی پر ڈالی اور پھر محی الدین کی طرف دیکھا۔

''آپ اسے پھر یہاں لے آئے ہیں۔ میں آپ کو

بتا چکی ہوں یہ ہمارے لیے مرچکا ہے۔ ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں چور، اچکا اور پورا بدمعاش ہے یہ۔"
اس کی فرد جرم میں کئی اضافے ہو چکے تھے۔
"لیکن میں اس کے والد سے ملنا چاہتا ہوں۔" محی الدین نے جواباً" کہا۔
"تو دبئی چلے جائیں۔ مل آئیں اس کے والد سے۔" مشاعل کی ممی کا لہجہ طنزیہ تھا۔
"ان کا کوئی رابطہ نمبر تو ہوگا نا۔ پلیز، مجھے دے دیں میں ان سے بات کرلوں گا۔" انہوں نے التجا کی۔
"کوئی نمبر نہیں ہے میرے پاس اور آپ خوامخواہ گارجین نہ بنیں۔ اس کا باپ اسے عاق کر چکا ہے۔ اپنی ہر چیز سے بے دخل کردیا ہے اس نے اسے۔ آپ اسے اپنی مرضی سے لے کر گئے تھے۔ اس سے کوئی مسئلہ ہے آپ کو تو چھوڑ دیں یہاں۔ میں اسے کسی یتیم خانے میں بھجوادیتی ہوں۔ اس سے زیادہ ہمدردی کی مجھ سے توقع نہ رکھیں۔"
انہوں نے ایک غصیلی نظر ہادی پر ڈالی۔
"نہیں۔" انہوں نے ایک دم اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت محسوس کی۔
"یا اللہ! میں نے پوری کوشش کی اس بچے کو اس کے وارثوں تک پہنچانے کی، لیکن یہ لعل اگر تو نے میری ہی جھولی میں ڈال دیا ہے تو اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔"
"بابا! چلیں!" ہادی نے آہستگی سے کہا۔
انہوں نے ایک نظر گیٹ پر ہاتھ رکھے اپنی طرف دیکھتی مشاعل کی ممی کی طرف دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر ہادی پر نظر ڈالی۔ جو اب کھلے گیٹ سے برآمدے میں کھڑی مینو کی طرف دیکھ رہا تھا۔
اس کے پاپا نے اسے عاق کردیا۔ وہ کسی ہادی کو نہیں جانتے تھے۔ مینو کو بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور مینو تو۔۔۔۔
مشاعل کی ممی کھٹ کھٹ کرتی واپس جارہی تھیں۔ اور مینو گیٹ بند کرنے کے لیے سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف آرہی تھی۔ اور سن روم کی کھڑکی کھولے مشاعل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"مینو!" اس نے مینو کے قریب آنے پر گھٹی گھٹی آواز میں پاپا کے متعلق پوچھنا چاہا۔
"ہادی بھائی! تم چلے جاؤ۔ دیکھو تمہاری صحت کتنی اچھی ہوگئی ہے۔ یہاں تو بیگم صاحب تمہیں مار ہی ڈالیں گی۔ صاحب سچ مچ دبئی چلے گئے ہیں۔ اور یہ صاحب اچھے ہیں۔"
تیز تیز بولتے ہوئے اس نے جلدی سے گیٹ بند کردیا۔ اس روز صرف گیٹ ہی بند نہیں ہوا تھا۔ ہادی کی زندگی کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا تھا۔ وہ اس گھر کو آخری بار دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی لیکن اس نے محی الدین کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے دہرایا۔
"چلیں بابا گھر۔" وہ انہیں گڑیا کی طرح بابا ہی کہنے لگا تھا۔
اسے آج کے بعد یہاں کبھی نہیں آنا تھا اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے اب ہمیشہ گڑیا۔ بابا اور فاطمہ کے ساتھ رہنا تھا۔ اس رات مشاعل کی ممی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ خالی ہاتھ اس کی کتابیں، کپڑے کھلونے سب کچھ یہاں ہی رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے کمرے میں جاکر سب کچھ لے آئے، لیکن وہ جانتا تھا مشاعل کی ممی اسے اندر نہیں گھسنے دیں گی۔
"تمہارے پاپا کے کوئی دوست تو ہوں گے یہاں۔ تم جانتے ہو کسی کو۔" انہوں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں مجھے کسی کا گھر معلوم نہیں ہے۔ ان کے ایک دو دوست گھر آیا کرتے تھے لیکن مجھے کسی کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔"
اس نے بتایا تو انہوں نے تسلی دی۔
"تم فکر مت کرو ہادی! میں پھر بھی معلوم کرتا رہوں گا۔ یہاں ایک دو جاننے والے ہیں ان سے کہہ جاؤں گا۔"
"نہیں بابا! اب مجھے یہاں نہیں آنا۔ میں ہمیشہ

آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ کا بیٹا بن کر۔" انہوں نے خوشی بھری حیرت سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے تو چلو تمہارے اسکول چل کر تمہارا سرٹیفکیٹ لے لیں۔"

اور پھر اس کا سرٹیفکیٹ لے کر وہ لاہور واپس آگئے۔ وہ گھر' وہ شہر ہمیشہ کے لیے اس سے چھوٹ گیا۔ اب ایک نئی زندگی تھی' نیا گھر اور نئے لوگ۔ اماں' بابا اور گڑیا اب اس کی زندگی کا محور تھے۔

محی الدین نے اسے گڑیا کے اسکول میں ہی داخل کروادیا تھا۔ ام کلثوم کا ہادی وہاں اسی شہر میں مرگیا تھا۔ اب وہ محی الدین اور فاطمہ کا شہزادہ تھا۔ فاطمہ اسے ہادی کہہ کر نہیں بلاتی تھیں' بلکہ اس نام سے پکارتیں جو اس کی دادی نے رکھا تھا اور جو اس کے اسکول کے سرٹیفکیٹ میں لکھا تھا۔

"اسے ہادی نہ بلایا کریں۔ جب آپ اسے ہادی بلاتے ہیں تو ہمارا ہادی میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ میرا دل تھمنے لگتا ہے۔ مجھے وہم آتا ہے کہ کہیں ہادی ہم سے پھر نہ بچھڑ جائے۔"

ایک روز فاطمہ نے محی الدین سے کہا۔ اور ہولے ہولے ہادی پس منظر میں چلا گیا۔ وہ فاطمہ کا شہزادہ تھا تو گڑیا کا چاند بھیا۔ اور محی الدین کا لاڈلا چاند۔

وہ اور گڑیا اکٹھے اسکول جانے لگے تھے۔ گڑیا اکثر ہوم ورک میں اس کی مدد کردیتی تھی۔ وہ بے حد خاموش رہتا تھا۔ بہت سارے دن محی الدین غور کرتے رہے' پھر ایک روز وہ اسے ماڈل ٹاؤن میں ہی ایک فٹ بال کلب میں لے گئے۔

"یہ آج سے پہلے کبھی نہیں کھیلا لیکن اسے فٹ بال سے عشق ہے۔" انہوں نے کلب کے منیجر سے کہا۔

"ظاہر ہے یہ تمہارا بیٹا ہے اسے فٹ بال سے عشق کیوں نہ ہوگا لیکن تم اسے اب لائے ہو جبکہ ہادی کو تم سات سال کی عمر میں لائے تھے۔"

کلب منیجر محی الدین کا دوست تھا۔

وہ دیر تک عبدالہادی کے متعلق باتیں کرتے رہے اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس رات محی الدین نے تفصیل سے اسے بتایا۔

"تمہارا ماموں عبدالہادی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم دونوں فٹ بال کے عاشق تھے۔ اور یہ عشق ہمیں ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ اپنے زمانے میں ہم دونوں کے والد بھی فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی محلے میں کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور فٹ بال کے بڑے پلیئر بننے کے خواب دیکھتے تھے' جن دنوں ہم فٹ بال کھیل رہے تھے' پاکستان میں فٹ بال ختم ہوتا جارہا تھا۔ مطلب کہ فٹ بال کا کوئی اسکوپ نہ تھا۔ کالج میں آتے ہی ہادی ہاکی کھیلنے لگا تھا۔ لیکن میں فٹ بال سے ہی وابستہ رہا اور ایک فٹ بال کلب کی طرف سے کھیلتا تھا' یہ میچز ضلعی سطح پر ہوتے تھے۔ ہادی کے جانے کے بعد میں لاہور آگیا۔ اس کے بغیر وہ شہر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ پڑھائی مکمل کرکے میں نے بینک میں جاب کرلی۔ اور شام کے وقت ایک فٹ بال کلب میں جانے لگا' جہاں بچوں کو کوچ کرتا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے بیٹا دیا۔ میں نے اس کا نام عبدالہادی رکھا۔

جب ہادی آٹھ سال کا ہوا تو میں انگلینڈ شفٹ ہوگیا کیونکہ میں ہادی کے لیے جو خواب دیکھ رہا تھا' اس کی تکمیل پاکستان میں ممکن نہ تھی۔ ہادی تمہارے ماموں کی طرح پیدائشی اسٹرائیکر تھا۔ بہت جلد اسے کم عمر کھلاڑیوں کے کلب میں لے لیا گیا۔ فوراً" بعد وہ آرسنل کلب میں چلا گیا۔ اور جلد ہی انڈر مکسٹین کا حصہ بن گیا۔ وہ اپنی ٹیم کا سب سے کم عمر کھلاڑی تھا۔ انگلش کلب آرسنل کا منیجر اس سے بہت پرامید تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہتا تھا' تمہارا بیٹا بہت جلد فٹ بال کے آسمان پر چھانے والا ہے لیکن وہ سب کی امیدیں توڑ کر چلا گیا۔ ہمیں تو کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ وہ تو بچپن سے ہی بہت ایکٹو تھا اور اب بھی وہ میرے خوابوں میں ہاتھوں میں بال لیے بھاگ رہا تھا اور مانچسٹر یونائیٹڈ میں شامل ہونے کے لیے ان تھک محنت کررہا تھا۔ اس نے کبھی کسی تکلیف کا

اظہار نہیں کیا تھا ایک کلب مقابلے میں۔"

وہ ذرا سا سانس لینے کے لیے رکے اور پھر چند لمحوں بعد بولے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"وہ ایک حیرت انگیز شاٹ تھا۔ اسے کارنر کک لگانی تھی۔ سب کی نظریں اس پر تھیں۔ میں نے اسے چیتے کی سی رفتار سے دوڑتے جست لگاتے، پیر اٹھاتے گیند کو ٹھوکر لگاتے دیکھا۔ بال فضا میں بلند ہوا۔ مخالف کھلاڑیوں کے سر سے گزرتے ہوئے اس نے حیرت انگیز موڑ کاٹا اور بال نیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ گراؤنڈ تالیوں، شور اور سیٹیوں سے گونج رہا تھا۔ انگلش کلب آرسنل میچ جیت چکا تھا اور وہ زمین پر اوندھا گرا ہوا تھا۔ اس کے کوچ آرنلڈ نے جب دیکھا کہ وہ گرنے کے بعد اٹھا ہی نہیں تو وہ دوڑ کر اس تک گیا لیکن سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کی ٹیم کے کھلاڑی اس کے نام کے نعرے لگا رہے تھے لیکن اس کا دل بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا۔

لیکن ہمیں کبھی پتا ہی نہیں چلا اور وہ سارے خوابوں کو آنکھوں میں لیے چلا گیا۔ ہمیں تنہا اور اکیلا کر گیا۔ وہاں لندن میں میرا دم گھٹنے لگا تو ہم واپس آگئے۔" محی الدین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ہر سال اس کی برسی پر ہم لندن جاتے ہیں اور اس کی قبر پر ڈھیروں پھولوں کے گل دستے پڑے ہوتے ہیں۔ یہ سب پھول اس کے آرسنل کلب کے دوستوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔"

"بابا!" اس نے بے اختیار ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "میں آپ کا خواب پورا کروں گا۔ عبدالہادی اتنی ہی عمر لے کر آیا تھا۔ مجھے اگر اللہ نے زندگی دی تو ایک دن میں مانچسٹر یونائیٹڈ کی جرسی ضرور پہنوں گا۔"

"تم"

انہوں نے آنسو پونچھ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جو اتنا کم گو تھا آج اس نے اتنی لمبی بات کی تھی اور ایسی بات۔۔۔

"ہاں بابا! میں۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں تم۔۔۔" ان کے اندر جیسے کسی یقین کا دیا جلا اور انہوں نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔

"لیکن میں۔۔۔" اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا، اپنی انگلیوں کو دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"میں آپ کے خواب پورے کرنا چاہتا ہوں بابا! وہ سارے خواب جو آپ نے عبدالہادی کے لیے دیکھے، لیکن کیا میں کر سکوں گا بابا! میرے ہاتھ۔۔۔ میرے ہاتھ بہت کمزور ہیں بابا۔" وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

محی الدین نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بہت دیر دیکھتے رہے۔ بظاہر تو ان ہاتھوں میں خرابی نہیں تھی۔

"تمہارے ہاتھوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بیٹا!"

"میرے ہاتھ۔۔۔" وہ کھو سا گیا۔

اس رات بابا گھر پر نہیں تھے اور وہ کچن سے اپنے لیے پانی لینے گیا تھا۔ مشاعل کی ممی بھی کچن میں تھیں اور یہ دو سال پہلے کی بات تھی، اس نے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی تھی اور ابھی مڑا ہی تھا کہ وہ دھاڑی تھیں۔

"ہر وقت فریج میں گھسے رہتے ہو، تمہارے پیٹ کی بھوک ہی ختم نہیں ہوتی۔"

اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور بوتل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ وہ مشاعل کی ممی سے بہت خوف زدہ رہتا تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا گرم کفگیر اس کے ہاتھوں پر مارا تھا۔ اس کی سسکی نکل گئی تھی۔

"وہ۔۔۔ میں تو پانی۔۔۔" اس کے لبوں سے بمشکل نکلا تھا۔

"زبان چلاتا ہے مجھ سے۔" اور پھر وہ اندھا دھند اس کے ہاتھوں، بازوؤں پر کفگیر برسانے لگی تھیں اور جانے کب تک برساتی رہتیں۔ اگر مشاعل آکر انہیں مخاطب نہ کر لیتی۔

"ممی! میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔" وہ رو رہی تھی۔

اور وہ کفگیر سنک میں پھینک کر اسے لے کر باہر چلی گئی تھیں اور پھر اس روز کے بعد اکثر چیزیں اس کے ہاتھ سے گرنے لگی تھیں۔ کبھی گلاس' کبھی پلیٹ۔ وہ کسی بھی چیز پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکتا تھا اور ہر بار جب کوئی چیز ٹوٹتی 'مشاعل کی ممی اسے بے تحاشا مارتی تھیں۔ اس کے ہاتھ اور انگلیاں اکثر سوجی رہتی تھیں۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور وہ اٹک اٹک کر بتا رہا تھا۔

محی الدین نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور مسکرائے وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کے مسائل جسمانی نہیں 'نفسیاتی ہیں۔

''تمہارے ہاتھ ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ اور تم ضرور میرا خواب پورا کرو گے۔ ایک دن آئے گا جب میں اولڈ ٹریفڈ کے گراؤنڈ میں اپنے ہادی کو مانچسٹر یونائیٹڈ کی جرسی میں دیکھوں گا۔''

''بابا....'' اس نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے محی الدین کی طرف دیکھا اور اس کی نظریں محی الدین کے پیچھے کھڑی فاطمہ پر پڑیں' جن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جانے کب وہ وہاں آئی تھیں' اسے پتا نہیں چلا تھا۔

''کیسی ظالم عورت ہے وہ گڑیا کے بابا!''

وہ پیچھے سے ہٹ کر سامنے آگئیں اور اسے اپنے لپٹائے بہت دیر تک اس کے ہاتھ چومتی رہیں۔

''سن لیں گڑیا کے بابا! میں نے اسے اب کبھی نہیں بھیجنا۔ اس ظالم عورت کے پاس۔''

انہوں نے اسے بھینچ لیا اور وہ بھی ان کے ساتھ چمٹ گیا۔ اسے ان کے لمس میں ماما کے لمس کی خوشبو آرہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے ماما نے اسے چمٹا رکھا ہو۔

اس رات محی الدین نے بڑے بڑے فیصلے کیے تھے' لیکن پہلے اس کا علاج ضروری تھا۔ انہوں نے اگلے دن ہی ایک بہت اچھے سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کیا اور پھر اس کے سیشن شروع ہو گئے تھے۔ اس کی اسپیچ تھیوری بھی ہو رہی تھی۔ محی الدین چاہتے تھے کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرے۔ کیونکہ اس کے لیے انہوں نے جو فیصلے کیے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس میں اعتماد ہو۔ پڑھائی میں گڑیا اس کی مدد کرتی۔ شام کو باقاعدگی سے وہ اسے فٹ بال کلب لے کر جاتے۔ وہ خود اس کی کوچنگ کر رہے تھے۔ چیزیں یہاں بھی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی تھیں' لیکن یہاں کوئی اس سے خفا نہیں ہوتا تھا۔ مارنا نہیں تھا۔

اسکول میں اردو' انگلش تقریری مقابلے ہو رہے تھے۔ گڑیا ہر سال حصہ لیتی تھی۔ اس سال اس نے محی الدین سے کہہ کر اس کے لیے بھی تقریر لکھوائی۔

''تمہیں بھی مباحثے میں حصہ لینا ہے' میں نے تمہارے لیے بھی بابا سے تقریر لکھوالی ہے' اسے یاد کرلو۔''

''نہیں بھلا میں کیسے.... نہیں۔'' وہ پریشان سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ ''میں نہیں کر سکتا گڑیا.... میں نے کبھی نہیں کی۔''

''لیکن ہادی بھائی ہمیشہ فرسٹ پرائز لیتے تھے اور تمہیں بھی فرسٹ پرائز لینا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''لیکن میں اتنی لمبی تقریر.... نہیں میں اٹک جاؤں گا۔ لوگ ہنسیں گے۔''

''نہیں.... تم نہیں اٹکو گے۔'' گڑیا کو یقین تھا۔

''تمہیں خود ـــــ اندازہ نہیں ہے کہ اب تم بات کرتے ہوئے نہیں اٹکتے۔ کبھی کبھار بس.... میں تمہیں خود تیاری کرواؤں گی۔ میں نے تمہارا نام ٹیچر کو دے دیا تھا اور اگر اب تم نے حصہ نہ لیا تو مجھے شرمندگی ہو گی۔''

اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گڑیا کو اس کی وجہ سے شرمندگی ہو۔ سو وہ تیاری کرنے لگا۔ گڑیا خود اسے تیاری کروا رہی تھی۔ ایک ایک لفظ کی ادائیگی' ایکشن' اسٹائل سب ہی کچھ بتاتی' لیکن پھر بھی وہ گھبرایا ہوا تھا۔

''تمہارے سامنے میں تقریر کر لیتا ہوں گڑیا! لیکن وہاں پورے اسکول کے سامنے نہیں بول پاؤں گا۔''

"تم بول پاؤ گے اور فرسٹ پرائز تمہیں ہی جیتنا ہے۔"

اور اب یہ گڑیا کا یقین تھا' اس کی محنت تھی یا اللہ کا کرم کہ وہ فرسٹ آگیا تھا۔

جب وہ روسٹرم کے سامنے کھڑا ہوا تو اسے لگا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکے گا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور ہاتھوں میں پسینہ آرہا تھا۔ ٹانگوں میں ہلکی لرزش تھی' لیکن پھر گڑیا کا مایوس چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اگر میں تقریر نہ کرسکا تو وہ کتنی ہرٹ ہوگی۔ کتنا دکھ ہوگا اسے۔ اس کا یقین ٹوٹ جائے گا۔

اور اس کا یقین نہیں ٹوٹا تھا۔ جب وہ اسٹیج سے اتر کر اپنی نشست کی طرف بڑھا تھا تو سب سے پہلے گڑیا نے اسے مبارک باد دی تھی۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔

اس روز سب بہت خوش تھے اور محی الدین انہیں باہر کھانا کھلانے لے گئے تھے۔ محی الدین اس روز بہت مطمئن تھے۔ ڈاکٹر احمر نے بھی آج صبح ہی بتایا تھا کہ اب اسے مزید سٹنگ کی ضرورت نہیں ہے اور کلب کے مینیجر اور کوچ نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔

"آپ کا یہ بیٹا بھی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مجھے یقین ہے' ایک روز یہ فٹ بال کی دنیا میں نام پیدا کرے گا۔"

اس روز وہ بھی بہت خوش تھا' لیکن رات کو جب وہ بیڈ پر لیٹا تو اسے پاپا بہت یاد آئے' اپنا گھر یاد آیا۔ اس روز اس نے مشاغل کو بھی یاد کیا اور وہ چپکے چپکے بہت دیر تک روتا رہا۔ اس رات اس نے گھر فون بھی کیا تھا' کیا خبر پاپا دبئی سے آگئے ہوں اور کیا پتا وہ بھی مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ لیکن کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔

اس نے دو' تین بار کوشش کی' لیکن لاحاصل۔

محی الدین اس کے کھیل کی طرف بہت توجہ دے رہے تھے۔ وہ خود بھی کھیلتے ہوئے بہت پرجوش ہو جاتا تھا۔ اسے لاہور آئے آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔ اس روز وہ کلب گئے تو وہاں کے کوچ نے ان سے کہا۔

"یہاں میرے اس کلب میں آنے والے زیادہ بچوں کا ایم کھلاڑی بننا اور فٹ بال میں نام پیدا کرنا نہیں ہے۔ یہ بچے محض تفریح کے لیے اور فٹنس کے لیے آتے ہیں' جبکہ آپ کے بیٹے کے سامنے ایک مقصد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب آپ اسے کوئی پروفیشنل کلب جوائن کروادیں۔ دوسری ٹیموں کے ساتھ مقابلے میں اس کی صلاحیتیں ابھریں گی۔"

"آپ کی بات صحیح ہے' لیکن میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔ میرا ارادہ انگلینڈ جانے کا ہے اور اس کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں۔" محی الدین نے جواب دیا۔

"یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہے' یہ ہیرا وہاں ہی چمکے گا۔"

وہ برٹش نیشن تھے' لیکن ہادی ان کا بیٹا نہیں تھا۔ اڈاپٹڈ بچوں کے لیے قوانین بہت سخت تھے۔ انہوں نے انگلینڈ فٹ بال کلب کے ایک مینیجر سے بھی جو ان کے دوست تھے' رابطہ کیا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی مثبت صورت حال دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تاہم وہ نا امید نہیں تھے۔ اس روز وہ کلب سے نکلے تو گیٹ پر ایک بوڑھے نے انہیں روک لیا۔

"تم نے میرا بیٹا دیکھا؟" اس کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں اور جسم پر ملگجا سا پھٹا پرانا لباس تھا۔ داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی۔ آج اسے انہوں نے کئی مہینوں بعد دیکھا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ اکثر ماڈل ٹاؤن کے مختلف بلاکوں میں پھرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ کسی گھر کا دروازہ بھی بجا دیتا اور اپنے بیٹے کے متعلق پوچھتا۔ دس' بارہ سال پہلے اس کا اکلوتا بیٹا گم ہوگیا تھا۔ یا اغوا ہوگیا تھا۔ جب تک بیوی زندہ رہی' دونوں ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے رہے' لیکن بیوی کی وفات کے بعد وہ ہولے ہولے ہوش و حواس کھوتا گیا۔ اسے صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ اسے اپنے بیٹے کو ڈھونڈنا ہے' جو کھو گیا ہے۔

"نہیں۔۔۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پتا نہیں کہاں چلا گیا۔" بوڑھا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو ان کے دل پر بوجھ سا آپڑا۔ اس روز انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ایک دو لقمے کھا کر اٹھ گئے۔

''آپ کچھ پریشان ہیں؟'' فاطمہ کمرے میں آئیں تو پوچھا۔

''ہاں۔ میں سوچ رہا ہوں فاطمہ۔۔۔ ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے۔ ایک پرائے بچے پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے ہیں کہیں بددیانتی کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' فاطمہ حیران ہوئی۔

''ہم نے پھر حبیب بھائی سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' ''آپ نے کئی بار کوشش تو کی ہے۔ خود گئے۔ وہ عورت اسے رکھنا ہی نہیں چاہتی اور باپ کو اس کی فکر ہی نہیں۔''

''کیا پتا فاطمہ! کیا پتا اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد حبیب بھائی اسے یاد کرتے ہوں۔ آخر بیٹا ہے ان کا۔ تڑپتے ہوں اس کے لیے۔ مجھے ایک بار پھر وہاں جانا چاہیے۔ میں کبھی کبھی بے سکون ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ اپنی خوشی سے اسے میرے حوالے کر دیں تو میری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ عورت کہیں جھوٹ نہ بولتی ہو۔''

''اور اگر انہوں نے اسے لے لیا تو۔۔۔'' فاطمہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔

''تو۔۔۔'' وہ افسردگی سے مسکرائے۔ ''ہم نے ہادی کی جدائی بھی تو برداشت کی ہے۔ اس کی بھی کر لیں گے۔ بہرحال ہمارا اس پر ایسا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ لینا چاہیں تو ہم اسے زبردستی رکھ لیں۔''

''لیکن۔۔۔'' فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ انہیں بالکل اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔ اس کے وجود میں جیسے ان کا عبدالہادی سما گیا تھا۔

انہوں نے فاطمہ کے آنسوؤں سے نظریں چرالیں۔ کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں ہادی کو اس کے باپ کے پاس لے کر جانا ہے۔ سارا دن اس بوڑھے باپ کی خالی خالی آنکھیں ان کے تصور میں آتی رہی تھیں۔

''فاطمہ! میں صبح اسے لے کر جاؤں گا۔ تم میرا بیگ تیار کر دینا اور ایک اس کا بھی سوٹ رکھ دینا۔'' انہوں نے سونے سے پہلے فاطمہ کو بتایا۔

اگر فاطمہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی تھی تو وہ بھی سو نہیں سکے تھے۔ اتنا ہی پیارا ہو گیا وہ انہیں اور صبح ناشتا کرتے ہی وہ ہادی کا ہاتھ پکڑ کر اور بیگ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں بابا؟'' ہادی حیران تھا۔

''تمہارے گھر۔۔۔'' انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں تمہارے بابا سے ملوانے لے جا رہا ہوں کیا تمہارا دل نہیں چاہتا اپنے بابا سے ملنے کو۔''

''دل تو چاہتا ہے لیکن وہ مشاعل کی ممی۔۔۔ وہ نہیں ملنے دیں گی بابا سے۔'' اس نے فاطمہ کی ڈبڈبائی آنکھوں اور گڑیا کے اداس چہرے کو دیکھا۔

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے بیٹا۔'' محی الدین نے نرمی سے کہا۔

''لیکن میں وہاں نہیں رکوں گا۔ میں بابا سے مل کر واپس آجاؤں گا۔''

''لیکن اگر تمہارے بابا نے تمہیں روک لیا تو۔۔۔'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ ان کی انگلی چھڑا کر دوڑ کر دروازے میں کھڑی فاطمہ سے لپٹ گیا۔

''نہیں مجھے نہیں جانا وہاں' میں یہاں رہوں گا' آپ کے پاس' بابا کے پاس۔''

فاطمہ نے بھی دونوں بازوؤں میں اسے بھینچ لیا۔ محی الدین ہولے ہولے چلتے ہوئے واپس پلٹے۔

''فاطمہ پلیز۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''جذباتی مت بنو' ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کا ایک خونی رشتہ موجود ہے۔''

''بابا پلیز۔'' اس نے سہمی سہمی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں میری جان! میں تمہارے بابا سے بات کروں گا۔ انہیں ساری صورت حال سمجھاؤں گا۔ عبدالہادی مرحوم کا حوالہ دوں گا اور مجھے یقین ہے' تمہاری بہتری کے لیے وہ تمہیں میرے ساتھ آنے دیں گے۔''

''آپ مجھے وہاں چھوڑنے تو نہیں جا رہے نا۔'' وہ

ابھی تک فاطمہ سے لگا کھڑا تھا اور اب وہ پہلے جیسا ہادی نہیں تھا جو اپنے دل کی بات نہ کر سکتا تھا۔

"اگر بابا نے تمہیں وہاں چھوڑنا ہوتا تو وہ تمہارے کپڑے' کتابیں سب ساتھ لے کر جاتے' لیکن تمہارا سب سامان تو اندر کمرے میں پڑا ہے نا۔" گڑیا نے سمجھایا۔

"ہاں بیٹا! ابھی تو ہم صرف تمہارے پاپا سے ملنے جارہے ہیں۔"

انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو وہ فاطمہ کے پاس سے ہٹ کر ان کے پاس آیا۔

"فاطمہ پلیز... اپنے آپ کو سنبھالو۔"

انہوں نے فاطمہ کو تسلی دی' لیکن خود ان کا دل جیسے ڈوب رہا تھا۔ وہ ان کا کوئی نہیں تھا' پھر بھی اس سے بچھڑنے کا خیال سوہان روح بنا ہوا تھا' لیکن نہیں وہ ان کے عزیز از جان دوست عبدالہادی کا بھانجا اور ان کی بہت پیاری' بہت عزیز آپا کا بیٹا تھا۔ ام کلثوم نے ہمیشہ انہیں چھوٹے بھائیوں کا سا مان دیا تھا۔

اسے محی الدین کی بات کا یقین تھا' لیکن پھر بھی اس نے کئی بار ان سے یقین دہانی چاہی۔

"آپ مجھے واپس لے آئیں گے نا بابا!"

اور ہر بار اسے یقین دلاتے ہوئے ان کا دل ڈوب جاتا۔ راستہ بھر وہ خود کو وضاحتیں دیتے رہے۔ کیا یہ میری خود غرضی تھی کہ میں نے آٹھ ماہ میں پھر حبیب الرحمٰن سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا میں نے بھی اس کی شکل میں اپنا ہادی پالیا تھا' یا میری کوتاہی ہے کہ میں غافل ہو گیا' مصروف ہو گیا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی' جب وہ شہر پہنچے تھے اور پھر ہوٹل میں اپنا بیگ رکھ کر انہوں نے اسے کھانا کھلایا تھا۔ ان کا اپنا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر وہ رکشا لے کر گاؤں آئے تھے اور حبیب الرحمٰن کے گھر کے باہر کھڑے جب وہ بیل دے رہے تھے تو ایک بار پھر وہ ان سے یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا بابا! آپ پاپا سے ملوانے کے بعد مجھے واپس لے جائیں گے نا۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"اور اگر آپ نے مجھے یہاں چھوڑ دیا تو اماں اور گڑیا بہت روئیں گی۔"

وہ بہت تیز ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کی اس بات پر مسکرا کر اسے دیکھا اور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوجوان لڑکا باہر آیا۔ یہ لڑکا کون تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ شاید حبیب الرحمٰن کا کوئی سسرالی عزیز ہو۔ لڑکا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے حبیب الرحمٰن صاحب سے ملنا ہے۔"

"لیکن یہاں تو حبیب الرحمٰن صاحب نہیں رہتے۔ دراصل ہم نے پندرہ دن پہلے ہی یہ گھر کرائے پر لیا ہے۔ ایکچوئیلی میرے پپا کی یہاں ٹرانسفر ہوئی ہے۔ دو ماہ پہلے' لیکن گھر ہمیں اب ملا ہے پندرہ دن پہلے تو ہم یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔"

"آپ سے پہلے جو لوگ یہاں رہتے تھے۔ وہ کہاں گئے۔ آپ کو کچھ علم ہے۔"

"جی میرے پپا نے بتایا تھا کہ یہاں جو صاحب رہتے تھے' ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی بیگم اپنے بچوں کے ساتھ میکے جا رہی تھیں۔ پپا کو کسی نے بتایا تھا اور چونکہ وہ مکان کے سلسلے میں پریشان تھے۔ انہوں نے فوراً" ہی یہ گھر کرائے پر لے لیا۔"

لڑکا تفصیل سے بات کرنے کا عادی تھا اور خاصا خوش مزاج بھی۔

"آپ پلیز آئیں' بیٹھیں' کچھ چائے' پانی..."

"نہیں شکریہ بیٹا! آپ کو ان صاحب کا نام پتا ہے۔" ایک موہوم سی امید کے سہارے انہوں نے پوچھا۔

لڑکے نے لمحہ بھر سوچا۔

"ہاں پپا! ایک دن ان کا ذکر کر تو رہے تھے کہ رحمٰن صاحب کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ رحمٰن ہی نام لیا تھا انہوں نے۔"

وہ بے حد دکھی دل سے مڑے' انہوں نے ساکت کھڑے ہادی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ مضبوطی سے

اس کا ہاتھ تھامے وہ ہوٹل واپس آگئے۔ رات انہوں نے ہوٹل میں ہی گزاری تھی۔ ساری رات دونوں نہیں سو سکے تھے۔ اسے پاپا بہت یاد آرہے تھے۔ آج آخری بار وہ یہاں آیا تھا۔ آج کے بعد اس نے یہاں نہیں آنا تھا۔

گیٹ پر کھڑے کھڑے اس کا جی چاہا تھا وہ بھاگتا ہوا اندر جائے۔ پاپا کا کمرا دیکھے' ہر وہ جگہ دیکھے' جہاں پاپا بیٹھتے تھے۔ چلتے پھرتے تھے' لیکن وہ خاموشی سے محی الدین کے ساتھ ہوٹل آگیا تھا اور چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ وہ جانتے تھے وہ رو رہا ہے' لیکن انہوں نے اسے رونے دیا۔ بہت دیر تک وہ دیوار کی طرف رخ کیے روتا رہا اور اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ بہت دیر بعد انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہادی بیٹا!" بہت دنوں بعد آج کسی نے اسے ہادی کہہ کر بلایا تھا۔

"پاپا!" وہ پلٹا تو انہوں نے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔

"پاپا چلے گئے۔ میری بات سنے بغیر۔ مجھے انہیں بتانا تھا کہ میں نے سنی کو نہیں گرایا۔ میں نے کبھی مشاعل کی ممی سے بدتمیزی نہیں کی۔۔۔ پاپا مجھ سے خفا تھے' ناراض تھے۔ پاپا اور میں۔۔۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگا اور وہ ہولے ہولے اسے تھپکتے رہے۔ دلاسا دیتے رہے اور خود اندر ہی اندر نادم ہوتے رہے۔ کاش انہوں نے اتنی تاخیر نہ کی ہوتی' وہ بہت پہلے اسے لے کر آجاتے تو وہ اپنے باپ سے مل لیتا۔۔۔ لیکن شاید یہی تقدیر میں لکھا تھا۔ انہوں نے صحیح کہا تھا کہ قدرت نے خود اس ہیرے کو ان کی جھولی میں ڈالا ہے اور انہیں اب اس ہیرے کو تراشنا تھا۔

فاطمہ اور گڑیا نے اس کا بہت خیال رکھا۔ ان دنوں اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آجاتے تھے۔ ایک بار چیزیں پھر اس کے ہاتھوں سے گرنے لگی تھیں۔ یہ بہت مشکل وقت تھا لیکن محی الدین فاطمہ اور گڑیا تینوں ہی اس کے کیئر ٹیکر بن گئے تھے۔ وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی اپنا نہیں تھا۔ سوائے سنی کے جو سوتیلا ہی سہی' لیکن اس کا بھائی تھا۔ دونوں کی رگوں میں ایک ہی شخص کا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن سنی' وہ جب بڑا ہوگا تو اسے شاید علم بھی نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں کہیں کوئی اس کا بھائی بھی ہے یا شاید کبھی مشاعل اسے بتائے کہ وہ ہے اس کا بھائی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا۔

ہوسکتا ہے زندگی کے کسی موڑ پر وہ اپنے بھائی سے مل سکے۔

محی الدین اس کی تربیت کے ساتھ ساتھ باہر جانے کی بھی کوشش کررہے تھے اور بالآخر وہ کامیاب ہوگئے۔ اس کے لیے وہ فرگوسن کے بھی شکر گزار تھے۔ جو آج بھی عبدالهادی کو یاد کرکے دکھی ہوجاتا تھا۔

"ارے وہ تو میرے اس کلب کے آسمان پر چمکتا چاند تھا۔ کراؤن تھا اس کا۔"

جب بھی فون پر بات ہوتی' وہ یہ جملہ ضرور دہراتا تھا۔ اور یہ فرگوسن کا خلوص ہی تھا کہ اس نے ان کی مدد کی تھی اور 2001ء کی ایک صبح جب ہیتھرو ایئرپورٹ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ گڑیا' ہادی اور فاطمہ کے ساتھ وہاں اترے۔ چار سال پہلے وہ تیرہ سالہ ہادی کو اس سرزمین کی مٹی کے سپرد کرکے چلے گئے تھے اور آج تیرہ سالہ ہادی کے ساتھ انہوں نے پھر یہاں قدم رکھا تھا۔

ان کا بے حد عزیز دوست سیف اللہ جو لندن کے قیام کے دوران انہیں ملا تھا۔ انہیں لینے آیا ہوا تھا۔ سیف اللہ کے پاس چند دن ٹھہر کر انہوں نے اپنا الگ گھر لے لیا تھا۔ انہیں یہاں طویل قیام کرنا تھا۔ سو یہاں آکر انہوں نے آرام بالکل نہیں کیا تھا۔ اپنے گھر منتقل ہونے کے بعد دوسرا کام جاب تلاش کرنا تھا۔ یہاں فرگوسن نے ان کی مدد کی تھی اور جلد ہی انہیں جاب مل گئی تھی۔ تیسرا کام بچوں کے ایڈمیشن کا تھا اور ایڈمیشن کے بعد وہ اسے آرسنل کلب میں لے گئے

تھے' جہاں فرگوسن ان کا منتظر تھا۔ اس نے ٹرائل لینے کے بعد تبصرہ کیا۔

"اس کی تکنیک متاثر کن ہے تمہارے بڑے بیٹے ہادی کی طرح۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔"

فرگوسن کے تبصرے نے انہیں مطمئن کردیا تھا۔ بڑے دنوں بعد وہ پُرسکون نیند سوئے تھے۔

ہادی کی زندگی کا اب ایک اور دور شروع ہوگیا تھا۔ وہ پڑھ رہا تھا۔ کھیل رہا تھا۔ اس کا کوچ اس سے مطمئن تھا اور گزرتے دن کے ساتھ فٹ بال سے اس کا لگاؤ' محبت' بلکہ عشق میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ وہ فارغ ہوتا تو پہلے' میرا ڈونا' ڈیوڈ بیکھم' وین وغیرہ کے میچز کی سی ڈیز دیکھتا۔ اس کی نگاہ ان کی ہر ہر حرکت پر ہوتی تھی۔ اس نے ان کا ہر میچ سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ ان دنوں کم عمر کھلاڑیوں میں رونالڈو کا نام سنا جارہا تھا' جو مانچسٹر کلب کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ لوگ اس کم عمر کھلاڑی کے عاشق تھے۔

ہادی بھی اپنے کلب کی طرف سے ٹوٹنہم سوسٹر پریمیر لیگ کے درمیان ہونے والے مقابلوں میں حصہ لے رہا تھا اور جب 2004۔2003ء کا انگلش سیزن شروع ہوا تو لوگ اس کا نام جاننے لگے تھے۔ اخبارات میں اس کے متعلق لکھا بھی جانے لگا تھا۔ تاہم کچھ تعصب بھی پایا جاتا تھا' جس کی وجہ سے اس کی صلاحیتوں کا کھل کر اعتراف نہیں کیا جارہا تھا تاہم محی الدین نے اسے تسلی دی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کریں گے۔

ان دنوں اس نے اولڈ ٹریفڈ تک سینکڑوں بار سفر کیا تھا اور میچ دیکھتے ہوئے وہ گردوپیش سے یوں ہی بے خبر ہوجاتا تھا جیسے ایگل کلب کے گراؤنڈ کے باہر بیٹھے بیٹھے۔

وہ اولڈ ٹریفڈ کے اسٹیڈیم میں بیٹھ کر صرف خواب ہی نہیں دیکھتا تھا بلکہ ان تھک محنت بھی کررہا تھا۔ اسے یقین تھا' ایک دن آئے گا جب لوگ اسے بھی ڈیوڈ بیکھم' جارج بریان اور روبنسن کی طرح جاننے لگیں گے۔ محی الدین اور فاطمہ جہاں ہر لحہ اس کی حوصلہ افزائی کررہے تھے' وہاں گڑیا بھی ایک اچھے دوست کی طرح ہر قدم اس کے ساتھ تھی۔

ہر گزرتا دن اس کے لیے کامیابیوں کے دروازے وا کرتا جارہا تھا اور ہر رات سونے سے پہلے وہ خود سے عہد کرتا تھا کہ اسے محی الدین کا خواب پورا کرنا ہے اور ہر رات وہ حبیب الرحمن کو یاد کرتا' اس کے تصور میں ام کلثوم کا سراپا آتا اور چند آنسو آنکھوں کے کونوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہوجاتے۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تنیر کاشف

"ثنا! کتنی دیر سے باورچی خانے میں گھسی ہوئی ہو' تھک گئی ہوگی۔ حال تو دیکھو اپنا۔" امی نے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے بہت پیار بھرے لہجے میں میٹھی سی ڈانٹ پلائی۔ "بس کرو اب باہر نکلو تم۔ باقی کام صبا یا سمیعہ دیکھ لیں گی۔"

"نہیں امی! کوئی اتنا کام نہیں ہے۔ بس تھوڑی دیر اور۔" میں نے پیاز کاٹتے ہوئے سر اٹھا کر امی کو دیکھا اور دوبارہ مصروف ہو گئی۔ "صبا کو تو بالکل نہ اٹھایئے گا' کل ٹیسٹ ہے اس کا اور سمیعہ بھابھی کو رات بھر کتنا ستایا ہے عروہ نے' ساری رات جاگتی رہیں اب ذرا آنکھ لگی ہے ان کی بھی۔"

اپنی بات ختم کر کے میں کٹی ہوئی پیاز پتیلی میں ڈال کر ٹماٹر کاٹنے لگی۔

"تم بھی نا ثنا!" امی محبت سے میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور گلاس میں دودھ ڈال کر دادی اماں کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"ارے بھئی! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی ضرورت نہیں میرے پیر دبانے کی۔" دادی اماں نے اپنی ٹانگیں بستر پر کھینچ لیں تو میں کارپٹ سے اٹھ کر ان کے برابر میں آبیٹھی۔

"دبا لینے دیں نا دادی ماں! مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ضرورت نہیں ہے' لیکن مجھے اچھا لگتا ہے نا!" میں جانتی تھی کہ آج کل دادی اماں کے پیروں میں کس قدر تکلیف رہنے لگی تھی۔ میں نے پیار سے ان کے پیر اپنی گود میں رکھے اور نرمی سے دبانے لگی۔

"اے ثنا! تیرے بال کتنے خشک ہو رہے ہیں بٹیا! لا میں اچھی طرح تیل ڈال دوں۔"

دادی کے نرم نرم ہاتھوں سے تیل کا مساج.... خیال تو بڑا خوش کن تھا' لیکن سارا دن اسکول میں بچوں کے ساتھ اور اس کے بعد گھر کے کاموں میں مصروفیت نے اس قدر تھکا دیا تھا کہ اس وقت صرف اپنے بستر پر لیٹنے کا شدت سے دل چاہ رہا تھا۔ سو دادی ماں کو چادر اوڑھا کر ان کے کمرے کی لائٹ بند کرتے ہوئے میں باہر نکلی تو امی فروٹ ٹرائفل کا پیالا لے کر میری طرف ہی آرہی تھیں۔

"یہ لو ثنا! تم نے تو کھایا نہیں' میں نے تمہارا حصہ نکال کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ اب کھا کر سونا۔" امی نے زبردستی پیالا میرے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش کی۔

"امی پلیز! ابھی نہیں۔ کل اسکول سے آؤں گی' تب کھالوں گی ٹھنڈا ٹھنڈا ٹرائفل' مزا تو اسی وقت آئے گا۔" میں نے امی کے ہاتھوں سے پیالا لے کر فریج میں رکھ دیا۔

"اچھا سنو! کل جب اسکول سے گھر آؤ تو دروازے اچھی طرح بند کر لینا۔ کیوں کہ صبا تو یونیورسٹی سے لیٹ آئے گی۔ سمیعہ کا میکے جانے کا پروگرام ہے اور میں تمہاری دادی کے ساتھ ذرا نسیمہ خالہ کی طرف جاؤں گی اور ہاں یاد سے چابی لے جانا گھر کی۔" امی کی تفصیلی ہدایات کو میں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو

کھولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بمشکل سنا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔

"صبا لائٹ بند کردو۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔"

میری آواز پر صبا نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں ایک دم سے پریشان ہوگئی۔

"کیا ہوا تمہیں۔ آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی ہیں؟" میں تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

"کچھ نہیں بس سارا دن پڑھتی رہی نا اب سر میں درد ہو رہا ہے۔"

صبا نے بے چارگی سے جواب دیا۔ اس کے بعد صبا کے لیے چائے بنانے اس کو اصرار کر کے دوا کھلانے اور اس کے سر میں تیل کا مساج کرنے میں کب رات کے ڈیڑھ بج گئے۔ پتا ہی نہیں چلا۔

"ثنا! تم بہت بہت اچھی ہو۔ آئی لو یو سوچ۔"

اپنے بستر پر لیٹے ہوئے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ صبا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں طمانیت سے مسکرادی۔

✲ ✲ ✲

"افوہ! یہ کیا ہوگیا؟" اسٹاف روم میں یہ گھبرائی گھبرائی سی آواز نئی ٹیچر روبینہ کی تھی۔

"کیا ہوگیا مس روبینہ!" میں نے کاپیاں چیک کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

"یہ میں نے حاضری رجسٹر میں غلط تاریخ پر تعطیل کی لکیریں کھینچ دی ہیں۔ اب کیا کروں؟" وہ تقریباً رو دینے کو تھی۔

"ارے بھئی! یہ کون سا مشکل کام ہے۔"

میں نے روبینہ کے ہاتھ سے رجسٹر لیا اور آخری

صفحے سے لمبائی میں ایک ہی کاٹ کر لکیروں پر چپکادی۔
"بہت بہت شکریہ! ورنہ میرے تو اوسان خطا ہورہے تھے۔" روبینہ نے تشکر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"شا! اس مرتبہ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ میری کلاس کی رپورٹ کارڈز پر آپ ریمارکس لکھیں گی۔" مس احمد اسٹاف روم میں داخل ہوئیں اور رپورٹ کارڈز کا بنڈل میرے سامنے دھر دیا۔
"جی مس احمد! بالکل یاد ہے۔ لائیے ناموں کی فہرست اور ریمارکس۔" میں نے مسکراتے ہوئے قلم رکھا اور رپورٹ کارڈز کی تہیں کھولنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"اف! اس قدر شدید گرمی ہے۔"
آج تو گویا راستہ ہی نہیں کٹ رہا۔ اوپر سے وین میں حد سے زیادہ رش۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاپی سے خود کو جھلنا شروع کیا تو اچانک ہی مجھے ٹرائفل کا ٹھنڈا ٹھار پیالا یاد آیا، تپتی گرمی میں ٹھنڈے ٹھنڈے ٹرائفل کا تصور نہایت خوش کن تھا۔
"گھر جاتے ہی سب سے پہلے ٹھنڈے پانی سے خوب دیر تک منہ ہاتھ دھوؤں گی۔ پھر ٹرائفل کھاؤں گی اس کے بعد کھانا کھا کر خوب ٹھنڈی کولڈ ڈرنک بھی پیوں گی۔"
میں بچوں کی طرح سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی کہ وین کو اپنے گھر کے دروازے پر رکتا پا کر اترنے لگی۔
"ارے یہ کیا۔ دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے۔"
تالے پر نظر پڑتے ہی رات سنی ہوئی امی کی ہدایات یاد آنے لگیں۔
"اف اللہ! میں نے تو چابی رکھی ہی نہیں۔" میں بے بسی سے دروازے کو گھور رہی تھی۔ اندر میرا پسندیدہ ٹرائفل، ٹھنڈا پانی سب کچھ موجود تھا۔ میرا نرم نرم بستر تھا، جس پر لمبی نیند سونے کی شدید خواہش تھی، لیکن میرے پاس دروازے کی "چابی" نہیں تھی۔
"چابی۔" میں نے زیرلب دہرایا اور دھک سے رہ گئی۔ چابی تو واقعی میرے پاس نہیں تھی ہاں! اس کا اہتمام ہی کب کیا تھا میں نے؟
بہت ساری چھوٹی بڑی نیکیاں اور ڈھیر سارا حسن اخلاق، میرے لیے میری جنت میں بہت کچھ تھا، لیکن چابی؟ مجھے ایک دم سے اپنی دن بھر کی مصروفیات یاد آنے لگیں جن میں نماز کہیں بھی نہیں تھی۔
مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں جنت کے دروازے پر کھڑی ہوں جو "میری جنت" ہے، لیکن میں اس کے اندر نہیں جاسکتی، ایک عجیب سی محرومی کا احساس میرے اندر جاگا اور ساتھ ہی کہیں جذبہ شکر بھی کہ اگر آج میں گھر کی چابی نہ بھولتی تو جنت کی چابی کی اہمیت کا احساس پھر نہ جانے کب ہوتا۔۔۔

صائمہ اکرم چوہدری

# سیاہ حاشیہ

"ٹھہرو لڑکی، رک جاؤ، آگے مت جاؤ...." ایک خوف زدہ سی آواز اس کی سماعتوں میں گونجی۔

وہ جو زندگی کے پُرفریب میدان میں اپنی بے لگام خواہشوں کی گٹھڑی اٹھائے اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ اس کی سماعتوں نے من و عن ان الفاظ کو سنا تھا، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کوئی بھی بات سن کر نہ سننے کی قسم کھا رکھی ہو۔

"دیکھو، وہ جو سیاہ حاشیہ ہے۔ اسے پار مت کرنا۔" پریشان آواز نے ایک دفعہ پھر اس کا تعاقب کیا۔

ایک لمحے کو وہ ساکت ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی خوب صورت ستواں ناک کے نتھنے تنفر کے گہرے احساس سے پھڑپھڑائے۔ اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا اور ایک دفعہ پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

ناولٹ

"رک جاؤ لڑکی۔۔۔ دنیا کی زندگی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔۔۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔

"ہرگز نہیں۔۔۔" وہ بولی نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں یہ تحریر صاف پڑھی جارہی تھی۔

"میری بات مانو، واپس لوٹ آؤ۔۔۔" التجائیہ آواز میں درد کا ایک جہاں آباد ہوا۔

اس فرمائش پر لڑکی کی تیوری پر موجود بلوں میں اضافہ ہوا اور اب اس نے اور زیادہ قوت سے بھاگنا شروع کردیا۔ سنگلاخ پتھریلی زمین اس کے خوب صورت پیروں کو زخمی کررہی تھی، لیکن ایسا لگتا تھا، جیسے وہ اب گونگی اور بہری بن چکی ہو۔

"وہ حاشیہ پار مت کرو، میں تم سے کہہ رہا ہوں، رک جاؤ۔۔۔" اس نے چیخ کر غصے سے کہا۔ اس کا ساتھ دینے کو ناراض سورج نے اپنی شعاؤں کا ایک طوفان زمین پر بھیج دیا اور زمین تپتا ہوا تندور بن گئی۔

"بہت پچھتاؤ گی۔۔۔" اس آواز میں دھمکی کا عنصر شامل ہوا۔ ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ اس لڑکی کے چہرے پر نمودار ہوئی، ایسا لگتا تھا جیسے اس پر کسی التجا، کسی دھمکی اور کسی بھی بات کا کوئی اثر نہ ہورہا ہو۔

"بھاڑ میں جاؤ، دیکھنا جہنم کی آگ میں جلو گی۔۔۔" وہ لڑکی بھاگتے بھاگتے رکی، مسکرائی اور سیاہ حاشیہ عبور کر گئی۔

وہ سیاہ حاشیہ جو اسے اندھا دھند بھاگتے ہوئے نظر نہیں آیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک لمحے کے ہزار ویں پل میں اسے احساس ہوا، وہ واقعی ایک جہنم میں داخل ہوچکی ہے۔ جس کا ٹکٹ اس نے خود اپنے لیے خریدا تھا، دوزخ کی آگ اب اس پر ہنس رہی تھی، کیوں کہ ان گنت گناہ گار لوگوں کی طرح اس کا وجود بھی جہنم کا ایندھن بننے جارہا تھا۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی، تو نہ ہی ان کی تجارت نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوئے۔ ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کردیں تو خدا نے ان کی روشنی زائل کردی۔ ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔"

☼ ☼ ☼

"آں۔۔۔ چھی۔۔۔" مونا نے ہاتھ منہ پر رکھ کر زوردار چھینک ماری۔ اس کی آنکھیں اردگرد پھیلی گرد کے ذرات کی وجہ سے سرخ ہورہی تھیں۔ وہ اس وقت آپا صالحہ کے اسٹور میں بنی پرچھتی پر مجبوراً" بیٹھی فالتو سامان نیچے اتار رہی تھی، پاس ہی لکڑی کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی جس کے ذریعے وہ اوپر چڑھی تھی اور اسی سیڑھی کے پاس انیس سالہ عدینہ کھڑی تھی۔

"مونا جلدی کرو ناں۔۔۔" اسٹور میں کھڑی عدینہ نے گرد سے بچنے کے لیے اپنا دوپٹہ اچھی طرح منہ اور ناک کے گرد لپیٹا۔

"باجی! یہ لیں آخری بیگ۔۔۔" مونا نے بازو گھما کر نیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا بوسیدہ بیگ فرش پر پھینکا۔ مٹی کا ایک اور طوفان اس کے ہمراہ آیا تو عدینہ کو تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود چھینکیں آنا شروع ہوگئیں۔ اسے تو ویسے بھی ڈسٹ الرجی تھی۔

"اللہ پوچھے تمہیں۔۔۔" عدینہ نے اپنا ناک مسلتے ہوئے سولہ سالہ مونا کو گھورا، جو اس کی فرمائش پر ہی اوپر چڑھی تھی۔

"ایک تو میں جان ہتھیلی پر رکھ کر بیٹھی ہوں، آپا صالحہ کو پتا چل گیا تو ٹانگیں توڑ دیں گی میری۔" وہ بمشکل سیڑھی پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے اب نیچے اتر رہی تھی، ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ "اوپر سے آپ بھی مجھے ہی باتیں سنا رہی ہیں۔" مونا کا مزاج برہم ہوا۔

"اچھا اچھا۔۔۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔۔۔" عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں ڈھونڈ رہی تھی، جو آپا صالحہ نے اس کے ہوسٹل جانے کے بعد اسٹور کی پرچھتی پر پھنکوادی تھیں۔ اب اسے اچانک ہی ان کی ضرورت

پڑ گئی تھی۔

"باجی! مل گئی ڈائریاں...؟" مونا نے بے تابی سے پوچھا تو اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ دو بیگ، ایک بڑا کارٹن اور ایک پرانا اٹیچی وہ چیک کر چکی تھی۔ ابھی تک مطلوبہ چیز اس کے ہاتھ نہیں لگی تھی۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔

"جاؤ بھاگ کر دیکھ کر آؤ، آپا کیا کر رہی ہیں۔" عدینہ کے لہجے میں چھپا خوف محسوس کرتے ہی مونا دبے قدموں اسٹور سے نکل گئی۔ عدینہ، آپا صالحہ کی اکلوتی بیٹی تھی، جبکہ مونا، عدینہ کے والد کے کزن کی بیٹی تھی۔ یہاں دینی تعلیم کے سلسلے میں آئی تھی۔

عدینہ نے بچپن ہی سے سب کی دیکھا دیکھی اپنی والدہ کو "آپا" کہنا شروع کر دیا تھا اور باوجود کوشش کے اس کے منہ سے ان کے لیے امی کا لفظ نہیں نکلتا تھا۔ آپا نے بھی اب اسے اس بات پر ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔

"یہ کیا...؟" نیلے بوسیدہ سے بیگ میں بہت سی چیزوں کے ساتھ چھپا ہوا ایک سنگ مرمر کا چوکور ٹکڑا اس کے ہاتھ لگا۔ وہ کسی قبر پر لگانے کے لیے ایک بالکل تیار کتبہ تھا۔ سفید رنگ کا یہ کتبہ خاصا بوسیدہ اور میلا ہو چکا تھا، لیکن اس پر لکھے سیاہ روشنائی والے حروف صاف پڑھے جا رہے تھے۔

"آخری آرام گاہ محترمہ صالحہ رفیق، زوجہ محمد رفیق احمد، تاریخ پیدائش 21 فروری 1970ء، تاریخ وفات 22 دسمبر 1992ء" کتبے پر لکھی تاریخ وفات پڑھتے ہی عدینہ کو دھچکا سا لگا وہ سخت بے یقینی سے اس ______ تختی کو دیکھ رہی تھی۔ دماغ میں ایک بھونچال سا برپا ہوا۔

صالحہ رفیق تو اس کی جیتی جاگتی والدہ کا نام تھا اور محمد رفیق اس کے مرحوم والد کا نام، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا۔ جب صالحہ بیگم زندہ تھیں تو پھر ______ اس تختی پر تحریر عبارت کس کے لیے تھی؟! اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔

"یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے؟" وہ سخت پریشان ہوئی۔

"باجی... باجی، آپا صالحہ ادھر آ رہی ہیں۔" مونا حواس باختہ سی اسٹور میں داخل ہوئی تو عدینہ نے بوکھلا کر ہاتھ میں پکڑا کتبہ بیگ میں پھینکا اور جلدی سے زپ لگا کر بیگ بند کیا۔ ایک لمحے میں اس کی توجہ دوسری جانب مبذول ہو گئی تھی۔ وہ اب بے مقصد چیزیں سمیٹنے لگی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" آپا صالحہ نے ناک چڑھا کر اندر کا منظر دیکھا اور مٹی سے بچنے کے لیے فوراً اپنا دوپٹہ ناک پر رکھ لیا۔

"آپا، میں اپنی پرانی ڈائریاں ڈھونڈ رہی تھی۔" عدینہ کے منہ سے بے اختیار پھسلا جسے سنتے ہی آپا کی تیوری چڑھ گئی۔

"وہ تو میں نے پچھلے سال ردی والے کو دے دی تھیں۔" آپا صالحہ کی بات پر اسے شاک لگا۔ سخت بے یقینی سے اس نے آپا کو دیکھا اور چپ رہی۔ دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ آنکھوں میں آئے نمکین پانی کو چھپانے کے لیے اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اب دل ہی دل میں ان سے خفا ہو چکی تھی۔

"ان میں تھا ہی کیا، فضول سی شاعری، کچھ بے تکے سے اشعار۔" ان کی اگلی بات نے عدینہ کے زخموں پر مزید نمک چھڑکا۔

اس نے ایک ناراض سی نگاہ ان پر ڈالی اور آہستگی سے اسٹور روم سے نکل گئی۔ جب کہ آپا صالحہ اب مونا پر برس رہی تھیں۔ جس نے یہ مخبری کی تھی، ورنہ عدینہ کو گھریلو معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا صرف اپنی نصاب کی کتابیں تھیں۔ میٹرک اس نے حسن ابدال کے اور ایف ایس سی پنڈی کے ایک کالج کے ہاسٹل میں رہ کر کیا تھا۔ ویسے بھی وہ کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ گھر کے معاملات میں نہ تو اس نے خود اور نہ ہی آپا نے کبھی اسے دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔ عدینہ نے کبھی بھی ان سے عام بچوں کی طرح لاڈ نہیں اٹھوائے

تھے اور نہ آپا نے ایسی کوئی شعوری کوشش کی تھی۔ اسی لیے اب عدینہ باوجود کوشش کہ اپنی ماں سے کھل کر بات نہیں کر سکتی تھی۔

اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹتے ہی عدینہ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وہ ڈائریاں اس کی بچپن کی سہیلیاں اور غم گسار تھیں۔ جن کے صفحات پر اس نے اپنے بے شمار دکھ شاعری کی زبان میں لکھے تھے۔ وہ لفظ جن سے اسے بہت پیار تھا۔ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے دور جا چکے تھے۔

"آپا ہمیشہ میرے ساتھ زیادتی کرتی ہیں۔" بے آواز روتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ اچانک اس کا ذہن ——— اس تختی کی طرف چلا گیا۔

"وہ کتبہ کس کا تھا؟" روتے روتے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول ہوئی۔

"نام اور تاریخ پیدائش تو آپا صالحہ کی تھی، لیکن تاریخ وفات؟" اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔ وہ فوراً اٹھی اور اپنے بیگ میں رکھی آپا صالحہ کے شناختی کارڈ کی کاپی اٹھا کر تاریخ پیدائش دیکھی تو وہی تھی۔

"آپا نے اپنی قبر پر لگانے کے لیے یہ کتبہ پہلے سے کیوں تیار کر رکھا ہے۔" اس کا ذہن اس پہیلی کو بوجھنے سے قاصر تھا۔

"لیکن تاریخ وفات...؟" اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

"کس سے پوچھوں؟ عبداللہ سے...؟" اس کی سوچ کی حدیں اپنے منگیتر کے نام پر آ کر ختم ہو جاتی تھیں۔

"کتنے دن ہو گئے، عبداللہ نے آپا کو حساب کتاب دینے کے لیے گھر کا چکر نہیں لگایا۔" اس کی ذہنی رو بھٹک گئی۔

کچھ سال پہلے ہی اس کے دل نے عبداللہ کے نام پر جب دھڑکنا سیکھا تو زندگی اسے خود بخود خوب صورت لگنے لگی تھی۔ عبداللہ نے عربی میں ایم فل کر رکھا تھا۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے علاوہ حدیث اور تفسیر کے کورسز بھی کر رکھے تھے۔ اس کی آواز بہت خوب صورت اور بے اختیار دل کو چھونے والی تھی۔ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے پانچ وقت اس کی آواز میں ہونے والی اذان عدینہ بڑے عقیدت بھرے انداز سے سنتی تھی۔ مدرسے کی بچیاں بھی اکثر آتے جاتے اسے عبداللہ کے نام سے چھیڑتی تھیں۔ وہ اپنی بوڑھی والدہ کے ساتھ مدرسے کے بالکل سامنے بنے گھر میں رہتا تھا۔ دراز قد، صاف رنگت، بڑی بڑی کشادہ آنکھوں والا عبداللہ خاصی متاثر کن شخصیت کا حامل تھا۔ ان دونوں کا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا تھا، لیکن بے تکلفی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی وہ عمر میں عدینہ سے آٹھ سال بڑا تھا۔ ان دونوں کی منگنی دونوں گھرانوں کی مکمل رضامندی سے ہوئی تھی۔

"پتا نہیں عبداللہ کو مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟"

وہ اب کتبے کو بھول کر اپنے منگیتر کی یادوں میں ایسی گم ہوئی کہ پتا ہی نہیں چلا، کب نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔ آج تو عصر کی اذان کا بھی اسے پتا نہیں چلا۔ ورنہ عبداللہ کی آواز سنتے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

پچھم سے ایک زوردار سرخ آندھی نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اجلی فضا میں گرد، ریت اور مٹی کا ایک طوفان امڈ آیا۔ گھر کے کھلے دروازے پوری قوت سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائے اور فضا میں گویا بھونچال برپا ہو گیا۔ عدینہ ہڑبڑا کر اٹھی، اور ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے سے برآمدے کی طرف نکل آئی۔ ساری فضا گرد آلود تھی۔ مٹی کے جھکڑ فضا میں رقص کر رہے تھے۔

"استغفراللہ... استغفراللہ..." بے بے صحن میں دھلے ہوئے کپڑوں کو پکڑنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ صبح ہی تو آپا صالحہ کے مدرسے کی کچھ بچیوں نے واشنگ مشین لگا کر کپڑوں کا ایک ڈھیر دھویا تھا، جو اس اچانک آنے والی آندھی کی وجہ سے مشرق د مغرب میں اڑتا پھر رہا تھا۔

آپا نے بھی لگتا ہے سال بھر کے کپڑے آج ہی دھلوا لیے ہیں۔" عدینہ نے ناگواری سے سوچا۔

"توبہ... توبہ..." بے بے کا استغفار جاری تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کپڑے بھی سمیٹ رہی تھیں۔

"بے بے آپ جائیں اندر' میں اکٹھے کر لیتی ہوں۔" عدینہ کے منہ میں ریت کے چند ذرے اڑ کر چلے گئے تھے وہ ___ واش بیسن کے سامنے کھڑی کلیاں کر رہی تھی۔

"لگتا ہے آج کسی کا ناحق خون ہوا ہے۔" عدینہ جیسے ہی کپڑوں کا بھاری بھرکم گٹھڑ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی' بے بے کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے بے زاری سے کپڑے بیڈ پر پھینکے اور خود بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"بے بے آپ کی تھیوری کو اگر درست مان بھی لیا جائے تو آج کل جس رفتار سے قتل و غارت ہو رہی ہے' بس صبح و شام آندھیاں ہی چلتی رہیں۔" عدینہ کا سانس بحال ہوا تو اس نے بے تکلفی سے لگے ہاتھوں تبصرہ بھی کر ڈالا۔

"تم نے عصر کی نماز پڑھی؟" آپا صالحہ کی آواز پر وہ اچھل کر کھڑی ہوئی۔ لوڈ شیڈنگ کے کمالات کی وجہ سے وہ کمرے کے کونے میں تسبیح کرتی آپا صالحہ کو نہیں دیکھ پائی تھی' ورنہ اس طرح بے لاگ تبصرہ نہ کرتی۔ ویسے بھی یہ وقت تو ان کا گھر کی پچھلی طرف پر بنے مدرسے میں گزرتا تھا' آج خلاف توقع وہ یہاں موجود تھیں۔

"نہیں آپا۔ سو گئی تھی۔" عدینہ نے شرمندہ سی آواز میں ان کی بات کا جواب دیا۔

"غافل کرنے والی نیند سے پناہ مانگا کرو اللہ سے۔" آپا صالحہ کی آواز میں اس قدر برہمی تھی کہ عدینہ اندھیرے میں صرف سرہلا کر رہ گئی۔ ویسے بھی آج تو وہ آپا سے خوب دل ہی دل میں ناراض تھی۔ اس لیے چپ رہی۔

"ہوسٹل کب جانا ہے تم نے؟" ان کا سپاٹ لہجہ ایک دفعہ پھر اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"کل..." وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"ٹھیک ہے' اگلے جمعے گھر کا چکر لگا لینا' کچھ بچیوں کے ختم قرآن کی تقریب ہے۔" انہوں نے سنجیدہ انداز سے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے آپا..." ان کی کسی بات سے انکار کرنا تو عدینہ نے سیکھا ہی نہ تھا۔

"عدینہ پتر! ایک پیالی چائے کی تو بنا دے۔" بے بے کی فرمائش پر اس نے سکون کا سانس لیا اور فوراً" اٹھ کر کچن کی طرف چلی آئی۔ اسی لمحے بجلی بھی آگئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ عدینہ کچن کے فرش پر بیٹھی بہت خاموشی سے عبداللہ کی آواز کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

چائے دم پر رکھ کر اس نے مغرب کی نماز پڑھی۔ اسی لمحے چند بچیاں چاول لیے چلی آئیں۔ جو اس نے لے کر کچن میں رکھ دیے۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے ایک ڈونگے میں گاجر کی کھیر نکالی اور اسے اچھی طرح ڈھک دیا۔

"سنو۔ اپنے بھائی سے کہو' یہ کھیر مسجد میں دے آئے۔" عدینہ نے بارہ سالہ بچی کو آہستگی سے کہا۔

"باجی' عبداللہ بھائی کو کھیر بہت پسند ہے نا۔" اس بچی نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں تو عدینہ بے اختیار شرمندہ ہو گئی۔

"ہاں... ہاں اب بھاگو یہاں سے..." عدینہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ اکثر آپا سے نظریں بچا کر اسے کچھ نہ کچھ بھجواتی رہتی تھی' لیکن عبداللہ کی طرف مکمل سکوت رہتا۔ دونوں کے درمیان لفظوں کا کوئی تعلق نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود وہ دونوں محبت کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ عبداللہ کا ان کے گھر میں بے تکلفی سے آنا جانا تھا۔ گھر میں کوئی اور مرد نہ ہونے کی وجہ سے آپا اسے کسی نہ کسی کام کے لیے بلواتیں اور فرماں برداری اس پر ختم تھی۔ وہ سر جھکائے سیدھا آپا کے پاس آتا اور وہیں سے واپس چلا جاتا۔ آتے جاتے اکثر اس کا عدینہ سے سامنا ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی ان

ملاقاتوں نے عدینہ کی زندگی میں بڑے خوب صورت رنگ بھر رکھے تھے۔ وہ دونوں بہت کم ایک دوسرے کو مخاطب کرتے 'لیکن ایک سرسری سی نگاہ ہی دونوں کو کئی دن خوش رکھنے کے لیے کافی ہوتی۔

عبداللہ کی والدہ کو عدینہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ جب بھی ہوسٹل سے گھر آتی تو اس کی والدہ اس سے ملنے ضرور آتیں 'ان کو اپنی اس مستقبل کی ڈاکٹر بہو سے بہت پیار تھا۔ جس کا اظہار ان کے ہر انداز سے بے اختیار چھلکتا تھا۔

مولوی رفیق اپنی بیوی صالحہ 'اکلوتی بیٹی اور والدہ کے ساتھ حسن ابدال کے ایک گاؤں میں بہت سالوں سے مقیم تھے۔ ان کا گھر خاصا بڑا تھا۔ سامنے والے حصے میں ان کی اپنی رہائش اور پچھلی طرف کا بڑا صحن اور کمرے مدرسے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ساتھ ہی چھوٹی سی مسجد تھی۔

عدینہ کی پیدائش بھی اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے آپا صالحہ کے پانچ بچے پیدائش کے فوراً" بعد ———— وفات پا گئے تھے۔ جس کا دونوں میاں بیوی کو بہت رنج تھا۔ اس موقعے پر مولوی صاحب نے اپنی بیوی کا بھرپور ساتھ دیا۔

مولوی رفیق اور آپا صالحہ کے درمیان بہت ذہنی ہم آہنگی تھی۔ جبکہ عدینہ اپنی دادی کے زیادہ قریب تھی۔ ان ہی سے لاڈ اٹھوائے جاتے اور فرمائشیں بھی بے بے کے ذریعے ہی پوری ہوتیں۔ جب کہ مولوی صاحب اور آپا کا زیادہ وقت مدرسے میں گزرتا

عدینہ کی پرورش میں زیادہ ہاتھ بے بے کا تھا۔ آپا صالحہ کا اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ تعلق جتنا پر تکلف تھا۔ اپنی ساس کے ساتھ اتنا ہی بے تکلفانہ اور مثالی تھا۔ دونوں ساس بہو میں خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ جو مولوی صاحب کی وفات کے بعد مزید بڑھ گئی تھی۔

مولوی رفیق کی وفات کے بعد آپا صالحہ کے کہنے پر مدرسے کی ذمے داریاں عبداللہ نے سنبھال لی تھیں ' جو مولوی صاحب کے بہترین دوست عبدالرشید کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دونوں دوستوں میں بے تحاشا محبت تھی۔ اور دونوں کی وفات بھی اکٹھے روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوئی 'جب وہ شہر سے گاؤں واپس آرہے تھے۔ اس اچانک موت کا آپا صالحہ کو شدید صدمہ پہنچا 'لیکن اس موقعے پر عبداللہ اور اس کی ماں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ عبداللہ اپنے والد صاحب کی وفات پر شہر چھوڑ کر گاؤں میں شفٹ ہو گیا اور دوبارہ کبھی شہر جانے کا نام نہیں لیا۔ مولوی رفیق صاحب کی شہر میں کچھ دکانیں تھیں جن کا کرایہ ہر ماہ عبداللہ لا کر انہیں دے دیتا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں کسی بھی قسم کے معاشی مسائل کا سامنا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی انہوں نے اپنی بیٹی کی خواہش پر اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ کروا دیا 'جس پر عبداللہ اور اس کی والدہ بہت خوش تھے۔ خود آپا صالحہ اپنے مدرسے میں بچیوں کو دینی تعلیم دیتی تھیں۔

اپنی وفات سے ایک سال پہلے دونوں دوستوں نے اپنے بچوں کی نسبت آپس میں طے کر دی تھی 'جس پر کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ مدرسے کی بچیاں جب اسے عبداللہ کے نام سے چھیڑتیں تو اس لمحے عدینہ کے چہرے پر بکھرنے والے رنگ بہت خوب صورت ہوتے۔

✲ ✲ ✲

**الصلوۃ خیر من النوم۔۔۔ (نماز نیند سے بہتر ہے)**

**الصلوۃ خیر من النوم۔۔۔ (نماز نیند سے بہتر ہے)**

عبداللہ کی آواز جیسے ہی اس کی سماعتوں میں پڑی ' عدینہ نے جلدی سے بستر چھوڑ دیا۔ وضو کر کے وہ صحن میں نکلی ' سامنے صالحہ آپا وضو کر کے آرہی تھیں۔ نماز پڑھ کر وہ چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیتی اور خود قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتی۔

گھر کے صحن میں جامن ' لیموں اور امرود کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں بے بے نے ضد کر کے چھوٹا سا تندور بنا رکھا تھا۔ جس پر وہ کبھی کبھار اپنے لیے اور مدرسے کی ختم قرآن کی تقریب کے لیے بڑے اہتمام سے روٹیاں لگاتی تھیں۔ آپا

صالحہ کو اپنی بوڑھی ساس کا یہ مشغلہ سخت ناپسند تھا، لیکن اس معاملے میں بے بے کسی کی بھی نہیں سنتی تھی۔

اس صبح عدینہ اٹھ کر صحن میں آئی تو جامن کے درخت سے کچھ فاصلے پر بے بے کا مٹی اور گارے سے بنا تندور دہک رہا تھا۔ تندور کے اندر سے آگ کے لمبے لمبے شعلے سے باہر نکل رہے تھے، ان شعلوں کے پس منظر میں بے بے کا چہرہ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

ساٹھ سالہ بے بے جسمانی لحاظ سے ماشاء اللہ خاصی صحت مند تھیں۔ ایک تو خوراک اچھی لیتیں، اور دوسرے وہ خود کو گھر کے کام کاج میں مصروف رکھتی تھیں جب کہ آپا صالحہ زیادہ تر اپنے مدرسے میں مصروف رہتیں یا پھر قرآن پاک کی تفسیر پڑھا کرتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں نہ صرف اپنی بچیوں کو دینی تعلیم کے لیے ان کے پاس بھجواتیں، بلکہ وہ اپنے ذاتی نوعیت کے معاملات میں بھی اکثر آپا سے ہی مشورہ لینے آتی تھیں۔ آپا صالحہ ایک ایسا کنواں بن چکی تھیں، جہاں بے شمار لوگوں کے راز دفن تھے۔ وہ خود خاصی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں۔

"بے بے آپ کو آگ سے ڈر نہیں لگتا....." عدینہ اکثر ہی یہ سوال کرتی۔

"نہیں....." بے بے نے سوکھا بالن تندور کے پیٹ میں جھونکتے ہوئے ہمیشہ کی طرح وہ ہی جواب دیا۔

"پھر بھی بے بے، آگ سے کیسے ڈر نہیں لگتا....؟" عدینہ کے سوال کا جواب آپا کی طرف سے آیا جو قرآن پاک پر غلاف چڑھا رہی تھیں۔

"جہنم کی آگ سے ڈرو بیٹا، اس کے مقابلے میں یہ تو کچھ بھی نہیں۔" آپا صالحہ کے تنبیہی انداز پر عدینہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ گھبرا کر بے بے کو دیکھنے لگی جو اس کی روٹی پر تازہ مکھن بڑے اہتمام سے لگا رہی تھیں۔

"بے بے! مجھے مکھن اچھا نہیں لگتا....." اس نے منہ بنایا۔

"وہ پہلی لڑکی ہے جسے مکھن اچھا نہیں لگتا۔" بے بے نے مسکرا کر اپنی پوتی کو مزید چھیڑا۔ "انسان تو بہت خوش ہوتا ہے مکھن والی باتوں سے....."

"میں ایسی نہیں ہوں....." عدینہ منہ بناتے ہوئے پلاسٹک کی چنگیر میں روٹی اور اوپر آلو قیمے کا سالن ڈال کر صحن کی طرف نکل آئی۔ وہ اب بان کی چارپائی پر بیٹھی چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے آپا صالحہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ جو آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم لیٹی ہوئی تھیں۔

عدینہ نے انہیں کبھی ننگے سر نہیں دیکھا تھا۔ وہ رات کو سوتے وقت بھی اچھی طرح سر ڈھانپ کر رکھتی تھیں۔ سوائے عبداللہ کے وہ گاؤں کے سب ہی مردوں سے پردہ کرتی تھیں۔ اسے کبھی کبھی آپا صالحہ کسی پراسرار سی کہانی کا ایک اچھوتا سا کردار لگتیں۔ جو ساری سحر کہانی میں عام سا لگتا ہے، لیکن کلائمکس پر پہنچ کر وہی کردار سب کرداروں پر حاوی ہو جاتا ہے اور سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتا ہے۔

اس نے آپا صالحہ کو کبھی بھی زیادہ بولتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کا لہجہ کرخت، بارعب اور گفتگو خاصی متاثر کن ہوتی۔ بعض دفعہ تو وہ صرف آنکھ کے اشاروں سے ہی کام چلا لیتیں۔ مدرسے کی بچیوں پر ان کا بہت رعب تھا۔ وہ خود بھی سب سے کیے دیے انداز میں رہتی تھیں۔

مونا کے آنے کے بعد ان میں کچھ تبدیلی ضرور آئی تھی۔ نٹ کھٹ شرارتی سی مونا، جو کہ ان کے میاں کے فرسٹ کزن کی بیٹی تھی اور حویلیاں شہر سے ان کے پاس قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے آئی تھی۔ وہ اکثر بے بے اور آپا کو باتوں میں لگا لیتی اور فرمائشیں کر کر کے کھانے بنواتی۔ مونا کی اپنے سے دو تین سال بڑی عدینہ سے خوب دوستی تھی۔ جس کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تھا۔

"عدینہ باجی کب آئیں گی واپس....؟" وہ جو بے دلی

سے اپنے کپڑے بیگ میں ڈال رہی تھی' مونا کی بات پر چونک گئی۔
"تم ہر ہفتے ایک ہی سوال کر کے تھکتی نہیں ہو مونا۔" عدینہ نے مونا کا افسردہ چہرہ دیکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔
"آپ کو اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہنا پڑے تو پتا چلے۔" مونا جل کر بولی۔
"تنہائی اکیلے گھروں میں تھوڑا ہوتی ہے' یہ تو انسان کے اپنے اندر کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے بیٹھی ہوتی ہے' موقع دیکھتے ہی سر اٹھا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور انسان کو ڈرانے لگتی ہے۔" عدینہ کی بات اس کے سر کے پورے چار فٹ اوپر سے گزر گئی۔
"آپ نے بھی آپا کی طرح مشکل باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ میرے تو پلے ہی نہیں پڑتیں۔" مونا نے میز سے عدینہ کی کتابیں اٹھاتے ہوئے منہ بنایا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
"اتنی ساری لڑکیاں تو آتی ہیں آپا کے پاس۔ دوستی کر لو ان سے۔" عدینہ نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔
"دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔" مونا ناک چڑھا کر بولی۔
"ہاتھ نہ سہی دل ملا لو کسی کے ساتھ۔" عدینہ نے شرارتی لہجے میں ایک اور مشورہ دیا۔
"دل کا ٹانکا ہر کسی کے ساتھ تھوڑا فٹ ہوتا ہے۔ اس کی وائرنگ میں کرنٹ تو بس ایک خاص نام سے ہی آتا ہے۔" مونا کی بات پر عدینہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مونا کی بات پر تبصرہ کرتی' مونا نے اس کا سکون درہم برہم کیا۔

"عبداللہ بھائی آئے ہیں۔ برآمدے میں بیٹھے ہیں۔" مونا کی بات پر اس کا دل بے اختیار دھڑکا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا سوٹ بیگ میں ڈالا اور بے ساختہ کمرے کی کھڑکی کی طرف آ گئی' ہلکا سا پردہ ہٹا کر ڈرتے ڈرتے برآمدے کی طرف دیکھا۔ مونا بھی لپک کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ دونوں اب کھڑکی سے جھانک رہی تھیں۔
سفید کرتا شلوار کے ساتھ سیاہ پشاوری چپل پہنے وہ بڑے مودبانہ انداز سے بے بے کے پاس بیٹھا اس کے دل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل سی مچا گیا۔
"آپ دونوں کی جوڑی شاندار ہے۔" مونا نے شوخ انداز سے سرگوشی کی تو عدینہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ جو شرارت کے موڈ میں تھی۔
"کبھی تو ایک دوسرے سے بات کر لیا کریں۔"
"جی نہیں۔" عدینہ نے صاف انکار کیا۔
"کیا فائدہ ایسی خاموش محبت کا۔؟" مونا خاصی بےباک اور پُراعتماد لڑکی تھی۔
"خاموش محبت اپنے اندر بے پناہ شدت لیے ہوتی ہے۔ جب دل کی دھڑکنیں ایک ہی نام کا ورد کریں' نگاہیں ایک ہی چہرے کا طواف کر کے خوش ہوں اور محبت کی نمازوں میں ایک ہی شخص کو مانگا جائے تو دنیا کے سارے لفظ بے کار ہو جاتے ہیں۔ محبت گونگی بھی ہو تو ہر انداز سے چھلکتی ہے۔ اپنا آپ منوا کر ہی دم لیتی ہے۔" عدینہ کی بات نے مونا کو لاجواب کیا۔
"عدینہ۔ تانگہ آ گیا ہے' جلدی کرو۔" باہر سے آنے والی آپا صالحہ کی آواز پر دونوں ہی گھبرا کر کھڑکی سے ہٹیں اور پلنگ پر رکھا سامان سمیٹنے لگیں۔ مونا نے باقی چیزیں اس کے بیگ میں باقاعدہ ٹھونسی تھیں۔ زپ بند کر کے مونا نے اس کا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی' تاکہ تانگے میں رکھ سکے۔
عدینہ نے کھونٹی سے لٹکا سیاہ رنگ کا عبایا اتارا اور عجلت میں پہن کر سفید اور کالے رنگ کے پھولوں والا اسکارف اپنے سر کے اردگرد لپیٹا' اتنے میں آپا صالحہ کمرے میں داخل ہوئیں' وہ اب لوہے کے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے بچھائے اخبار سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر عدینہ کے پاس پہنچ گئیں۔
"یہ رکھ لو۔" آپا صالحہ نے پیسے عدینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے سرسری سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی

جہاں ملاحت کا ایک جہان آباد تھا۔ عدینہ کے ریشمی بالوں کی ایک لٹ دائیں کان کی طرف سے نکل کر اس کے گال کو چھو رہی تھی۔ عدینہ کی رنگت صاف اور نقوش بہت پُرکشش تھے۔ جب کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے دراز قد تھی۔ سیاہ آنکھوں میں کاجل لگانے کی اجازت اسے آپا نے کبھی نہیں دی تھی۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے، عورت کو اپنے بال نامحرموں سے چھپانے کا حکم ہے' اسکارف اچھی طرح لیا کرو۔" آپا صالحہ کے لہجے میں چھپی خفگی کو محسوس کرکے عدینہ گھبرا کر اسکارف کی پنیں کھول کر دوبارہ کسنے لگی۔

"عدینہ باجی! چاچا جیدا' ناراض ہو رہا ہے' بس نکل جائے گی۔" مونا دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

"آ رہی ہوں۔" اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ جلدی سے باہر نکلی۔ برآمدے میں بے بے کے تخت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے عبداللہ کو دیکھ کر اس کا دل پوری قوت سے دھڑکا۔ چلتے چلتے بے بے کے تخت سے اس کا پاؤں ٹکرایا۔ مونا شرارت سے ہنسی۔

"یہ عبداللہ بھائی کو دیکھ کر آپ دیواروں اور ستونوں سے کیوں ٹکرانے لگتی ہیں۔" ایک دفعہ مونا نے یونہی اسے چھیڑنے کو پوچھا تھا۔

"عورت جس مرد سے محبت کرتی ہو' اسے دیکھ کر ویسے ہی حواس باختہ ہو جاتی ہے۔ نہ قدموں پر اپنا اختیار رہتا ہے اور نہ نظروں پر۔" عدینہ نے بھی اس وقت اسے ہنستے ہوئے اندر کی بات بتائی تھی۔

"دھیان سے جانا۔" بے بے نے اپنی عزیز از جان پوتی کو محبت بھرے لہجے میں کہا' لیکن اس کے دھیان کی ساری کھڑکیاں تو اس دشمن جاں کی طرف کھلی ہوئی تھیں' جو نظریں جھکائے ہوئے اس کے دل کا سکون' بڑی دیدہ دلیری سے کسی بے رحم ڈاکو کی طرح لوٹ چکا تھا۔

"خدا حافظ بے بے۔" اس نے مخاطب دادی کو کیا تھا' لیکن سنایا اسے تھا جو سر جھکائے اپنی پشاوری چپلوں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس لمحے اسے اس پشاوری چپل کی قسمت پر رشک بھی آیا اور غصہ بھی۔

"جلدی کرو ناں۔" مونا دروازے میں کھڑی چیخی۔ وہ جو دادی سے سر پر پیار لینے کے بہانے اس ظالم شخص کو کن اکھیوں سے دیکھنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ بوکھلا کر چلی اور عجلت بھرے انداز سے صحن عبور کر گئی۔

چلتے چلتے اسے اپنی پشت پر دو آنکھیں محسوس ہوئیں۔ اس کے دل کی بے ربط دھڑکنوں نے بالکل ٹھیک وقت پر مخبری کی تھی۔ وہ پلٹی۔ عبداللہ آنکھوں میں محبت کا ایک جہاں سموئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور بے بے اپنی دوائیوں میں مگن تھیں۔ عدینہ ایک دم بوکھلا کر پلٹی۔ اس کا سر دروازے کے پٹ سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کو زمین گول گول گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے بے نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ عبداللہ زیر لب مسکرایا۔

"پتر دھیان سے۔" بے بے کی فکر مند آواز اور مونا کی کھی کھی نے اکٹھے ہی اس کا تعاقب کیا۔

"اللہ حافظ۔" عدینہ نے بغیر پلٹے جواب دیا اور جلدی سے تانگے پر بیٹھ گئی۔ واپسی کا سارا سفر گویا خوشبوؤں میں اڑتے ہوئے گزرا تھا۔ وہ روشن اور چمک دار آنکھیں اس کے ساتھ ہی سفر کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بغیر پروں کے ہی فضاؤں میں اڑ رہی ہو۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کب وہ حسن ابدال سے پنڈی اور پھر اپنے ہوسٹل پہنچی۔ عبداللہ کی ایک نگاہ نے اس کا آج کا سفر آسان کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں روشنیوں' رنگوں اور خوشبوؤں کا ایک جہان آباد تھا۔ شوبز' فیشن' صحافت سے تعلق رکھنے والے اہم لوگ اس فیشن ویک کی افتتاحی تقریب میں شامل تھے۔ برائیڈل ویک کے حوالے سے ہونے والی اس فیشن شو کی اخبارات

اور سوشل میڈیا میں بہت دن پہلے ہی ایڈورٹائزنگ شروع کردی گئی تھی، جس کی وجہ سے اس تقریب کے پاس دس دن پہلے ہی ختم ہوچکے تھے۔

"یار آئی ایم گیٹنگ کنفیوژ..." میک اپ روم میں کوئی بیسیویں دفعہ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے شانزے نے اپنی ساتھی ماڈل سونیا سے پریشانی سے کہا۔ سونیا جو کہ اپنے ہونٹوں پر لپ گلوس لگا رہی تھی' اس نے ناک چڑھا کر شانزے کو دیکھا۔ جو کیٹ واک میں حصہ لینے سے پہلے ہی سخت گھبرا رہی تھی۔

"ڈونٹ بی سلی شانزے..." نک چڑھی سونیا نے منہ بنا کر کہا اور ایک دفعہ پھر آئینے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

اس وقت میک اپ روم میں ٹاپ کلاس ماڈلز کے ساتھ ساتھ دو تین بالکل فریش ماڈلز بھی موجود تھیں۔ جن کا انتخاب کئی کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد کیا گیا تھا۔ سب ہی ماڈلز خود کو آئینے میں' ہر زاویے سے دیکھنے میں مگن تھیں۔

ساتھ کی دہائی کی دلہن کے روپ میں شانزے غضب ڈھا رہی تھی' ایک تو وہ ویسے ہی دراز قد تھی' اوپر سے اللہ نے اسے حسن سے بے دریغ نوازا تھا۔ ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ڈریسنگ روم سے آنے والی کئی سینئر ماڈلز نے حسد بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ سب ہی کو اپنی اپنی پوزیشن خطرے میں لگ رہی تھی۔ اس فیشن شو میں ہونے والی کیٹ واک بہت سے چہروں کو شہرت کے آسمان پر پہنچانے کے لیے بے تاب تھی' جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' نئی ماڈلز کے چہروں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے دمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے' بظاہر خود کو پُر اعتماد شو کروانے والی کئی لڑکیوں کے دل اس وقت بری طرح دھڑک رہے تھے۔

"شانزے' رباب' سونیا... آپ لوگ کانفیڈنٹ ہیں نا..." فیشن شو کے آرگنائزر مہیش نے اپنی تینوں نئی ماڈلز کو ایک دم ہی مخاطب کیا۔ وہ ابھی ابھی وہاں پہنچا تھا۔ اب تنقیدی نگاہوں سے سب کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یس سر' آف کورس..." نک چڑھی سونیا نے بے ساختہ جواب دیا۔

"اور شانزے آپ..." مہیش جیسے ہی شانزے کی طرف پلٹا' اس کے ملکوتی حسن سے ایک لمحے کو مرعوب ہوکر... بات کرنا ہی بھول گیا۔

"لو یہ تو گیا کام سے..." علیزہ نے کہنی مار کر سونیا کو ایک فضول سا اشارہ کیا۔

"ج جی سر..." شانزے نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

"او کے آپ سب کے پاس جسٹ فائیو منٹس ہیں۔ ہری اپ..." مہیش خود کو سنبھال چکا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ کے بعد شانزے کی ریمپ پر انٹری ہوئی۔ روشنیوں کے ایک گولے کے درمیان میں وہ ہائی ہیل کی سینڈل پہنے بڑی نزاکت کے ساتھ اپنا لہنگا سنبھالے جیسے ہی حاضرین کے سامنے آئی' تالیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا طوفان اس کی پذیرائی کرنے کو موجود تھا۔ دلکش میوزک' رنگ برنگی روشنیوں میں شانزے کا جسم ایک سانچے میں ڈھلا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی موم کی گڑیا ریمپ پر چل رہی ہو۔

تالیوں' سیٹیوں اور بلند آواز میں سراہے جانے والے جملے بھی شانزے کی تسلی کے لیے کافی نہ تھے۔ اس کا دل بے ربط انداز سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے کیریئر کی پہلی کیٹ واک پر حاضرین کے سامنے حد درجہ نروس تھی' لیکن خود کو پر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔

ریمپ کی آخری حد پر پہنچ کر اس نے اپنی کمر کو ایک خاص ادا سے جھٹکا دیا اور واپسی کے لیے پلٹی۔ اس کی نظر سامنے بیٹھے ایک بے زار سے نوجوان جرنلسٹ پر پڑی جو شانزے کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اسی لمحے جب وہ واپسی کے لیے مڑ رہی تھی، لمبی ہیل میں اس کا پاؤں زمین پر توازن کھو بیٹھا اور وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی، لیکن قسمت نے ہمیشہ کی طرح اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اپنی پروفیشنل لائف کی پہلی کیٹ واک میں نہ صرف زمین پر بلکہ میڈیا کے بہت سے آرگنائزرز کی نظروں سے بھی گر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد کے ایف سیکٹر میں بنی ڈیڑھ کینال کی نیلی کوٹھی دیکھنے والوں پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتی تھی۔ پرانے طرز پر بنی ہوئی اس کوٹھی کے اگلے اور پچھلے، دونوں ہی طرف بڑے بڑے لان تھے۔ لان میں سرو کے بلند درختوں پر ایک عجیب سی اداسی اور وحشت چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ کوٹھی باہر سے ہی دو بڑے پورشن میں تقسیم ہوئی نظر آتی تھی، لیکن لان دونوں کا مشترکہ تھا۔ اس کوٹھی کے دائیں والے پورشن میں ڈاکٹر بینش، اپنے سولہ سالہ بیٹے ارصم اور اپنے والد ڈاکٹر حماد کے ساتھ مقیم تھیں۔ وہ ایک شہید کرنل کی بیوہ تھیں اور ان کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے پورشن میں ڈاکٹر بینش کے تایا ڈاکٹر جلال، اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں شادی شدہ اور اکلوتا بیٹا تیمور انگلینڈ میں مقیم ہے، جبکہ تیمور کی بیٹی اوریدا کو پاکستان آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر بینش کی سیاہ ہنڈا سوک نیلی کوٹھی کے گیٹ نمبر دو سے اندر داخل ہو چکی تھی۔ انہوں نے جیسے ہی گاڑی سے اتر کر پورچ میں قدم رکھا سامنے ستون کے پاس ٹوٹے ہوئے گملے کو دیکھ کر ان کا بی پی ہائی ہوا۔

"رشید، فضل دین کہاں ہو تم لوگ۔۔۔" ڈاکٹر بینش کی ناراض آواز سنتے ہی ملازم دوڑتے ہوئے پورچ میں پہنچے، ویسے بھی بینش کے غصے سے سب ہی کی جان جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ٹوٹے ہوئے گملے کو دیکھ کر سارا قصہ سمجھ گئے۔

"یہ گملا کس نے توڑا ہے؟" ان کا لہجہ سرد اور آنکھوں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

"وہ بڑی بیگم صاحبہ میرے ہاتھ سے ٹوٹا تھا۔" فضل دین نے سچ بولنے میں ہی عافیت جانی۔

"ٹوٹ گیا تھا تو اٹھا کر باہر پھینکو، یہاں کیوں اس کو نمائش کے لیے سجا رکھا ہے۔" وہ ایک ناراض نگاہ دونوں ملازموں پر ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گئیں، دونوں ہی کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔ انہوں نے باقاعدہ منہ پر ہاتھ پھیر کر شکر ادا کیا۔

ڈاکٹر بینش نے جیسے ہی اپنے پورشن کے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا۔ ان کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا۔ اشتعال کی لہر کسی برقی رو کی طرح ان کے پورے وجود میں دوڑی۔ ان کے چہرے کے زاویے بری طرح سے بگڑے۔

انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے سامنے نیلے کارپٹ پر لاپروائی سے لیٹی اپنے کزن کی بیٹی اوریدا کو دیکھا۔ جس کے گمان کی آخری سرحدوں پر بھی کہیں نہیں تھا کہ ڈاکٹر بیا آج اس طرح کامیاب چھاپہ ماریں گی۔ ورنہ وہ ان کے پورشن کا کبھی بھی رخ نہ کرتی، اور اگر کر بھی لیتی تو اس طرح کارپٹ پر بے تکلفی سے نیم دراز ٹی وی نہ دیکھ رہی ہوتی۔ اس کی آنٹی بینش سے جان جاتی تھی۔

"میرے بیٹے کو کبھی عقل نہیں آسکتی، یہ بھی ماں کی طرح ساری زندگی بدھو اور پاگل ہی رہے گا۔" وہ حد درجہ کوفت اور جھنجلاہٹ کا شکار ہوئیں۔ اپنی ماں کی موجودگی سے بے خبر ارصم، اپنے سامنے اوریدا کی میتھس کی کتاب کھولے شاید نہیں یقیناً" اس کا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی انگلیاں کیلکولیٹر پر تیزی سے چل رہی تھیں۔ اس کے ماتھے پر پڑی شکن اس کی گہری مصروفیت کی غمازی کر رہی تھی۔

بینش نے ایک نظر میں ٹی وی لاؤنج میں پھیلی بے

ترتیبی کو دیکھا۔ جس سے ان کی طبیعت جی بھر کر مکدر ہوئی۔ نیلے کارپٹ پر کتابیں' جرنلز' اخبارات اور ساتھ ہی پھلوں کی ٹوکری پڑی تھی۔ جس میں اب کیلے کے چھلکوں کا ڈھیر تھا۔ پاس ہی ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں چائے کے خالی کپ اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ نمکو کی پلیٹ میں ــــ بسکٹس تھے اور ڈرائے فروٹس والی پلیٹ بھی الٹی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اوریدا کا پرانا سا بھالو والا ہیر بینڈ گرا ہوا تھا جو اکثر ہی اس کے بالوں کے بجائے اِدھر اُدھر لڑھکتا رہتا۔

ان تمام چیزوں کے درمیان اوریدا صاحبہ فلور کشن سر کے نیچے رکھے بے تکلفی سے نیم دراز تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ قریبی صوفے پر جب کہ ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا جس سے اس نے آواز کا والیوم مزید بڑھا دیا تھا۔ کمرے کا یہ منظر دیکھ کر ڈاکٹر بینش کے لیے زیادہ دیر تک خود پر قابو پانا محال ہو گیا۔

"یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔؟"

ان کی تلخ آواز پر اوریدا ایک دم ہراساں ہوئی اور اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہوئی۔ چونکا تو ارصم بھی تھا لیکن اسے اپنے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ اس نے بس ایک سرسری نگاہ اپنی ماں پر ڈالی اور دوبارہ نوٹ بک پر جھک گیا۔ اس کا یہ انداز ڈاکٹر بیا کو آگ لگا گیا۔

"یہ گھر ہے یا کباڑ خانہ۔؟" انہوں نے انتہائی سرد نظروں سے اوریدا کو دیکھا۔ جو اس وقت سخت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"تم پھر اوریدا کا ہوم ورک کر رہے ہو۔؟" انہوں نے خفگی آمیز انداز میں ارصم کی طرف دیکھا۔ جب کہ اوریدا پریشان نظروں سے ٹی وی لاؤنج کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے بالکل سامنے آنٹی بینش ڈٹ کر کھڑی تھیں۔ وہ کمرے سے آسانی سے نہیں نکل سکتی تھی۔

"تو۔؟" ارصم نے انتہائی پُرسکون مگر نڈر انداز سے اپنی ماں کا غصے سے لبریز سرخ چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے فوجی باپ کی طرح دلیر تھا اور نیلی کوٹھی میں ان کے سامنے اس طرح بولنے کی جرات وہ ہی کر سکتا تھا۔

"تم ابھی تک اکیڈمی کیوں نہیں گئے۔؟" انہیں آخر کار ایک مضبوط جواز مل ہی گیا تھا ارصم پر خفا ہونے کے لیے۔

ارصم نے پہلے وال کلاک کی طرف اور پھر جتاتی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا' وہ ایک لمحے میں سمجھ گئیں' اکیڈمی کے جانے میں ابھی کافی وقت تھا' اس سوچ نے انہیں اور بھی جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا۔

"میرا اکیڈمی ٹائم ساڑھے پانچ بجے کا ہے اور ابھی صرف چار بجے ہیں۔" ارصم کے جتاتے ہوئے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سٹپٹا سی گئیں' لیکن بڑی سرعت کے ساتھ انہوں نے خود پر قابو پایا۔

"خدمت خلق چھوڑ کر انٹری ٹیسٹ پر دھیان دو تو بہتر ہے۔" انہوں نے ناپسندیدہ نظروں سے اوریدا کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تو اوریدا کی رنگت فق ہو گئی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے چکرا کر گر پڑے گی۔

ارصم نے ایک سیکنڈ میں اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا تب ہی وہ ماں کو نظر انداز کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا اور بڑے تحمل سے گویا ہوا۔

"اوریدا ایک سوال رہ گیا ہے وہ تم خود کر لینا۔ اب جاؤ۔" ارصم کی بات پر اس کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔ اس نے فوراً" سے بیشتر اپنی چیزیں عجلت بھرے انداز میں اٹھائیں۔ دل کی حالت سخت بری ہو رہی تھی۔ آنٹی بینش کی ایکسرے جیسی نظروں کا سامنا کرنا کون سا آسان کام تھا۔ وہ اس وقت کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

سیاہ رنگ کے سوٹ میں اوریدا کی شہابی رنگت خوب دمک رہی تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں ہلکا ہلکا سا خوف کا تاثر اس کی خوب صورتی کو مزید اجاگر کر رہا تھا۔ وہ جھنجلا سی گئیں۔ اس کے ہاتھوں کا ارتعاش اس کے اندرونی جذبات کی واضح عکاسی کر رہا تھا۔ اپنی چیزیں سمیٹتے ہی وہ گولی کی طرح اڑتی ہوئی کمرے سے نکلی اور باہر نکلتے ہی ایک لمبا سانس لیا۔ آج بڑی

مشکل سے وہ آنٹی بینش کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچی تھی۔ اس لیے ابھی بھی حواس باختہ تھی۔
اوریدا کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر بینش نے صوفے پر نیم دراز اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ جس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ان کو نظر انداز کیے اب بڑے پر اعتماد انداز سے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔ اس کا یہ انداز ڈاکٹر بینش کو سلگا گیا' لیکن مسئلہ یہ تھا' سامنے ان کے کزن کی بیٹی نہیں' ان کا ذہین و فطین' سنجیدہ مزاج کا حامل اکلوتا بیٹا ارصم جاوید تھا۔ شوہر کی شہادت کے بعد ارصم میں ان کی جان تھی اور یہی جان اوریدا کے آنے کے بعد اکثر سولی پر لٹکی رہتی' کوئی بھی ان کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔
"تم نے لنچ کیا۔؟" انہوں نے بیٹے کا موڈ جانچنے کے لیے یونہی پوچھا۔ ارصم نے جواباً" انہیں جن نگاہوں سے دیکھا' وہ ہلکا سا گڑبڑا گئیں' اور جلدی جلدی کارپٹ پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں۔
"ہاں کر چکا ہوں۔" ارصم کا لاتعلق سا انداز انہیں سلگا گیا۔ وہ اب اپنے سیل فون پر کوئی گیم کھیل رہا تھا۔
"آغا جی کہاں ہیں۔؟" ڈاکٹر بینش نے بمشکل خود پر قابو پا کر تحمل سے پوچھا۔ ان کے سوال پر ارصم نے کچھ ایسی جتاتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ کو نہیں پتا' وہ اس وقت کہاں ہوتے ہیں۔؟
"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔" وہ جھنجلا گئیں۔
"اپنی اسٹڈی میں۔" اس نے سپاٹ انداز میں مختصر جواب دیا۔
"ایک پیشنٹ کی رپورٹس گھر بھول گئی تھی' وہی لینے آنا پڑا۔" انہوں نے ہی بات بڑھانے کی غرض سے غیر ضروری سی وضاحت دی جس کی آج بالکل بھی ضرورت نہیں تھی۔ ارصم نے ان کی بات پر بھی "نولفٹ" کا بورڈ نہیں ہٹایا۔
"پورے کمرے میں گندگی ہے۔ میں شریفاں کو صفائی کے لیے بھیج رہی ہوں' تم اگر چاہو تو کچھ دیر کے لیے اپنے بیڈروم میں چلے جاؤ۔" اپنی بات کہہ کر وہ رکیں نہیں اور فوراً" کمرے سے نکل گئیں۔
ڈاکٹر بینش کے کمرے سے نکلتے ہی ارصم کا تناؤ کا شکار چہرہ کچھ ڈھیلا ہوا' لیکن غصہ ابھی بھی باقی تھا۔ جس کا اظہار اس نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کو سامنے والی دیوار پر مار کر کیا۔ ریموٹ کا پیچھے والا حصہ ٹوٹ گیا اور سیل دور جا گرے۔

"وہ بے وقوف ضرور رو رہی ہوگی۔" اس سوچ نے ارصم کو مضطرب کیا۔
وہ جلدی سے اٹھا اس کے قدم بڑے ابا کے پورشن کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ لش گرین آسٹریلین گھاس پر مشتمل وسیع و عریض لان کو عبور کرتا ہوا بڑی عجلت میں ان کے پورشن میں داخل ہوا۔ جدید انداز میں بنا ہوا ٹی وی لاؤنج اس وقت بالکل سنسان تھا۔
بڑی اماں اور بڑے ابا اس وقت آرام کر رہے تھے۔ وہ ٹی وی لاؤنج سے اوپر کے فلور کو جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اوپر جاتے ہی کوریڈور میں دائیں جانب اوریدا کا کمرہ تھا۔
اس نے دروازہ ہلکے سے بجایا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ دروازہ دوبارہ بجانے کے بعد بھی نہیں کھلا تو اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔
اس نے اندازے سے دیوار ٹٹول کر سوئچ بورڈ کے سارے ہی بٹن ایک جھٹکے سے آن کر دیے۔ کمرے میں ایک دم ہی روشنیوں کا ایک طوفان سا آ گیا۔ ہلکے گلابی رنگ کی کلر اسکیم والا کمرہ اوریدا نے اپنی پسند سے ڈیکوریٹ کروایا تھا۔ سامنے ہی آف وائٹ رنگ کے جہازی سائز بیڈ پر وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ اس کے منہ پر تھا اور دوسرا سر کے نیچے۔ یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا۔
"اوریدا۔ کیا ہوا۔؟" اس نے بے چینی سے تکیہ اس کے منہ سے ہٹایا۔ اسے یہ دیکھ کر قطعاً" حیرت نہیں ہوئی' وہ بے آواز رو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"ہوں تو آپ ہیں عدینہ احمد! جنہوں نے پنڈی بورڈ میں پہلی پوزیشن لی۔؟" میڈیکل کی پہلی کلاس میں پروفیسر شفیق نے غور سے اپنے سامنے سیاہ گاؤن اور اسکارف میں موجود لڑکی کو دیکھا۔ وہ کلاس کی واحد لڑکی تھی جس کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے مبرا تھا۔ جس کی آنکھوں میں کاجل کی جگہ ذہانت کی چمک اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی جگہ پُر اعتماد مسکراہٹ تھی۔

"میں نے میٹرک بورڈ میں بھی ٹاپ کیا تھا۔" عدینہ کے پُر اعتماد انداز پر پروفیسر شفیق کے ساتھ پوری کلاس نے توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ کے والد کہیں پنڈی بورڈ کے چیئرمین تو نہیں۔" کلاس کی آخری بینچ پر بیٹھے جبران نے شرارتی انداز سے لقمہ دیا تو پوری کلاس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ عدینہ نے پلٹ کر کلاس کے آخری بینچ پر بیٹھے لڑکے کو لاپروائی سے دیکھا۔

"نہیں وہ گاؤں کی مسجد کے امام تھے۔" عدینہ کی وضاحت پر کلاس میں موجود اسٹوڈنٹس میں سے کسی کے چہرے پر خوشگوار حیرت اور کسی چہرے پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ جب کہ دوچار آنکھوں میں تحقیر کے رنگ بھی صاف پڑھے جارہے تھے۔

"ہوں۔ گڈ۔ مجھے امید ہے آپ یہاں بھی اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھیں گی۔" پروفیسر شفیق نے مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ان شاء اللہ سر۔" وہ اپنی سیٹ پر دوبارہ بیٹھ چکی تھی۔

پروفیسر شفیق اب باقی اسٹوڈنٹس کی طرف متوجہ ہوئے' جبکہ عدینہ کو اپنے علاوہ کسی بھی کلاس فیلو کے تعارف سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی' اس لیے وہ لاپروائی سے اپنے ساتھ بیٹھی سائرہ کی طرف متوجہ ہوگئی' جو کالج میں بھی اس کی کلاس فیلو تھی' اور اب وہ دونوں ہوسٹل میں روم میٹس تھیں۔

"تمہارے فادر امام مسجد تھے' کیا ضرورت تھی یہ بتانے کی۔" سائرہ نے کیمپس کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہی ناگواری سے عدینہ سے کہا۔

"اس میں چھپانے والی کیا بات ہے۔؟" اس نے بھنویں اچکا کر سائرہ کو دیکھا۔ جس کا موڈ خاصا خراب تھا۔

"تم نے دیکھا' وہ نتاشا کیسے تضحیک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی تمہیں۔" سائرہ نے منہ بنایا۔

"سواٹ۔" عدینہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ "مجھے اس بات پر فخر ہے۔"

"لیکن دنیا کے فخر کرنے کے اسٹینڈرڈ مختلف ہیں یار۔" سائرہ جھنجلا کر گویا ہوئی۔

"شکر کرو ابھی تو میں نے ایک اور بات نہیں بتائی۔" عدینہ نے اپنے بیگ سے مالٹا نکالتے ہوئے اسے مزید حیران کیا۔

"وہ کیا۔؟" سائرہ پریشان ہوئی۔

"یہی کہ میری والدہ گاؤں میں مدرسہ چلاتی ہیں اور میرے منگیتر بھی امام مسجد ہیں۔" عدینہ کی بات پر سائرہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

"کیا چیز ہو تم یار۔" وہ تعجب سے اپنے سامنے بیٹھی سادہ اور پُراعتماد سی عدینہ کو دیکھتی رہ گئی' جو ہاتھ میں پکڑا مالٹا چھیل کر اب باقاعدہ نمک لگا کر مزے سے کھارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو ہوں ہی بد قسمت۔" شانزے اپنی واحد دوست رباب کے کندھے پر سر رکھے مسلسل ایک گھنٹے سے رو رہی تھی۔

"بد قسمتی میرا پیچھا کرتی ہوئی ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ کسی بھی موقعے پر مجھے تنہا نہیں چھوڑتی۔" شانزے کے گلے شکووں میں اس تقریب میں ناکام پرفارمنس کے بعد اور زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔

"حوصلہ کرو یار۔" رباب اس کے اس طرح بکھرنے پر پریشان ہو رہی تھی۔

"میرا تو شوبز میں کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔" شانزے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"بس بھی کرو' کل سے رو رو کر تم نے اپنا برا حال کر رکھا ہے۔" رباب نے پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے نرمی سے دلاسا دیا۔

"میری تو ازل سے قسمت خراب ہے' لگتا ہے ابد تک ہی خراب رہے گی۔" شانزے کا دکھ کسی صورت بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم نے میش سر سے بات کی۔" رباب نے فیشن شو کے آرگنائزر کا نام لے کر پوچھا تو شانزے کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"وہ بھی میرا فون نہیں اٹھا رہے' سخت ناراض ہیں مجھ سے۔" شانزے نے رباب کا بڑھایا ہوا ٹشو تھاما۔

"تو دنیا میش سر پر ختم تو نہیں ہو جاتی۔" رباب نے دانستہ اپنے لہجے کو لاپروا بنا دیا۔

"میری تو شروع ہی ان کے ذریعے ہوئی تھی۔" شانزے نے ٹشو استعمال کر کے بے دردی سے ڈسٹ بن کی طرف اچھالا۔

"اللہ کوئی اور سبب بنا دے گا۔ انشاء اللہ۔" رباب کے پاس ہمیشہ ہی اس کے لیے تسلیوں اور دلاسوں کی فراوانی ہوتی تھی۔

"میرے لیے اللہ کے پاس کوئی سبب نہیں۔" اسے ساری دنیا کے ساتھ ساتھ اللہ سے بھی گلے شکوے تھے۔

"بے وقوفوں والی باتیں نہیں کرتے۔" رباب نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

"جن لوگوں کو زندگی بن مانگے سب کچھ دے دیتی ہے' انہیں دوسروں کی باتیں بے وقوفانہ لگتی ہیں۔" اس نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور ناراض سے انداز سے کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" رباب پریشان ہوئی۔

"خودکشی کرنے۔" شانزے کی بات پر اس کا ——— دماغ بھک سے اڑا۔ جب کہ وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

"فضول لڑکی' میری بات تو سنو۔" رباب ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے لپکی' اسے اس دفعہ بھی شانزے کو اس کے ارادے سے باز رکھنا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ فوٹو اسٹیٹ شاپ پر جانے کے لیے یونہی بڑے ابا کے پورشن کی طرف آ گیا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ اس نے داخلی سیڑھیوں پر اداس اور خاموش سی اوریدا کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ایک پڑا سا تنکا اٹھائے فرش پر بے معنی سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس نے اپنا بھالو والا ہیئر بینڈ اب بریسلٹ کے طور پر ہاتھ میں پہنا ہوا تھا۔

"ہیلو لڑکی' کیا ہوا؟" بلیک ٹراوزر پر سفید ٹی شرٹ پہنے وہ خاصے گھریلو سے حلیے میں کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"کوئی تو بات ہے' جس کی وجہ سے چہرے پر ساڑھے بارہ بجے ہوئے ہیں۔" وہ شوخ ہوا۔

"آج ماہیر کی سالگرہ ہے۔" افسردہ سے انداز میں اس نے بتایا۔ ماہیر اس کا بڑا بھائی تھا' جو اس کے پاپا کے ساتھ ہی انگلینڈ میں مقیم تھا' جبکہ اسے اپنی ماما کی اچانک ڈیتھ کے بعد پاکستان آنا پڑا' وہ دو ہی بہن بھائی تھے۔

"ماہیر کی سالگرہ ہے تو اس میں اتنا اداس ہونے کی کیا بات ہے۔؟" وہ اس سے ایک قدم نیچے والی سیڑھی پر بیٹھ کر بڑے خوشگوار انداز سے گویا ہوا۔ اس نے ناگواری سے انداز سے اوریدا کے ہاتھ سے تنکا لے کر زمین پر پھینک دیا۔

"ہوں۔ ہے تو خوشی کی بات' لیکن کاش کہ میں بھی وہاں ہوتی' تو ہم کتنا انجوائے کرتے' کتنی زیادہ آئس کریم کھاتے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔ ارحم کو ایک لمحے میں محسوس ہو گیا' وہ اپنے پاپا اور بڑے بھائی کو مس کر رہی ہے۔

"لو یہاں تو آئس کریم کا دکھ منایا جا رہا ہے' جب کہ میں سمجھا تم اپنی فیملی کو مس کر رہی ہو۔" اس نے شرارتی انداز سے اسے چھیڑا اور وہ چھڑ بھی گئی۔ "میں

"نے کب کہا مجھے آئس کریم کی یاد آرہی ہے۔؟"

وہ اپنی بڑی بڑی بلوائی رنگ آنکھوں میں خفگی بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔ ارصم نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چھپایا اور غور سے اسے دیکھا۔ بلیک جینز پر اس نے پنک پل اوور پہن رکھا تھا۔ جس پر بڑی ساری باربی بنی ہوئی تھی۔ جب کہ براؤن سلکی بال فرنچ ٹیل کی صورت میں بندھے ہوئے تھے' جو شاید نہیں یقیناً" رحمت بوا کی نواسی کا کارنامہ تھے جو سرونٹ کوارٹر میں اپنی نانی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔

"سوری مجھے سمجھنے میں غلطی ہوگئی۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ "ویسے ماہیر تو اس وقت آنہیں سکتا ہاں آئس کریم کھائی جاسکتی ہے۔" اس کی بات پر اوریدا نے اپنی تیکھی سی ناک چڑھا کر اسے دیکھا اور خاموش رہی۔

"میں اس وقت مارکیٹ جارہا ہوں فوٹو اسٹیٹ شاپ تک۔ چلوگی۔؟" ارصم کی بات پر وہ تذبذب کا شکار ہوئی۔

"ٹھہر جاؤ' تمہاری پسندیدہ جگہ "آئس لینڈ" سے کھائیں گے آئس کریم۔" ارصم نے اسے لالچ دیا تھا اور وہ اس لالچ میں آبھی گئی۔ اس لیے فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوئے۔

"بڑی اماں کو بتا کر آتی ہوں' تم دو منٹ رکو۔" وہ پرجوش انداز میں بھاگی' ارصم کو یقین تھا کہ وہ کچھ ہی منٹوں کے بعد جب واپس آئے گی تو اس کا منہ خوب پھولا ہوا ہوگا اور وہی ہوا۔ ارصم اس کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنسا تو اس نے گلہ آمیز نظروں سے اپنے کزن کو دیکھا۔

"کیا ہوا' بڑی اماں سے ڈانٹ پڑی ہے ناں۔؟" اس کے سوفیصد درست اندازے پر اوریدا نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"بڑی اماں نے کہا ہوگا کہ لوتھا کی لوتھا ہوگئی ہو اور انسانوں کی طرح چلنا نہیں آتا جو لونٹوں کی طرح بھاگتی آرہی ہو۔" وہ مزید مسکرایا جب کہ اوریدا کی خوبصورت آنکھوں میں سخت حیرانی در آئی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا تم تو یہاں کھڑے تھے۔؟" اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "جس رفتار سے تم بھاگتی ہوئی اندر گئی تھیں' مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا تمہیں جاتے ہی جھاڑ پڑے گی۔"

"کیوں' بڑی اماں کو اس طرح بھاگنا ناپسند ہے کیا۔؟" اس کے معصوم انداز پر ارصم نے اپنے ایک اور بے ساختہ قہقہے کا گلا بمشکل گھونٹا' ورنہ اوریدا کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

"ہاں' تم سے پہلے رحمت بوا کی نواسی کی شامت آئی رہتی تھی' وہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی۔ "اکبری" کی طرح تھی' لیکن بڑی اماں نے اسے "اصغری" بنا کر ہی دم لیا تھا۔" وہ باتیں کرتے کرتے گیٹ عبور کر آئے۔

"یہ ڈپٹی نذیر کون ہیں اور اکبری اصغری کہاں رہتی ہیں۔؟" اوریدا نے چلتے چلتے حیرت سے پوچھا اس کی بات پر ارصم نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر لمبا سانس لیا۔ اوریدا کی اردو زبان سے دوری کبھی کبھی اسے سخت امتحان میں ڈال دیتی تھی۔

"یا اللہ۔ کون سی نالائق کزن مل گئی ہے مجھے۔" اس کی بات پر اوریدا نے برا سا منہ بنایا۔ "مجھے آپ لوگوں کے رشتے داروں کا کیا پتا' ابھی کچھ عرصہ پہلے تو میں پاکستان آئی ہوں اور پھر بڑی اماں مجھے کہاں' کسی اور کے گھر لے کر جاتی ہیں۔" اوریدا کو ایک اور دکھ یاد آگیا۔

"او مائی گاڈ۔! رشتے دار۔؟" ارصم اب سڑک پر کھڑا بے تحاشا ہنس رہا تھا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو' اس نے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں گلہ کیا۔

"نو مائی ڈیئر۔ مجھے تو انکل تیمور پر غصہ آرہا ہے' انہوں نے تمہیں اتنا لیٹ پاکستان بھجوا کر بہت زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ۔" ارصم نے فوراً" بات بنائی۔

"تم پہلے یہاں آجاتیں تو کچھ نہ کچھ ــــ اردو لٹریچر بھی پڑھ لیتیں۔ خیر ڈپٹی نذیر احمد اردو رائٹر ہیں اور اکبری اصغری ان کے مشہور کریکٹرز ہیں بے وقوف لڑکی۔" ارصم کی وضاحت پر اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اوہ سوری۔ میں بھی شاید تم کسی ریلیشنشپ کی بات کر رہے ہو۔" اوریدا ایک دم خفت کا شکار ہوئی۔
"ویسے مجھے اردو لٹریچر سے کوئی دلچسپی نہیں بہت مشکل لینگویج ہے یہ اس لیے تو میرے اردو میں کم مارکس آتے ہیں۔" اس نے وضاحت دی۔
"اردو میں تمہارے مارکس، زبان کے مشکل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہارے دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے آتے ہیں۔" ارصم صاف گوئی سے بولا۔
"حقیقت میں تمہیں پاکستان آنا ہی سخت ناپسند تھا۔ تیمور انکل نے زبردستی تمہیں بھجوایا اس لیے تم نے ابھی تک چیزوں کو ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کیا۔" ارصم نے چلتے چلتے سڑک پر پڑے پتھر کو زور سے ٹھوکر لگائی۔
"مجھے پاکستان آنا نہیں، بلکہ پاپا اور ماہیر بھائی کے بغیر آنا ناپسند تھا۔ انہوں نے مجھے خود سے الگ کر کے بہت زیادتی کی ہے۔" اس نے رنجیدہ لہجے میں فوراً اپنی صفائی دی۔
"انہوں نے زیادتی نہیں کی، تمہاری ماما کی ڈیتھ کے بعد وہاں تمہارا رہنا مناسب نہیں تھا۔ پھر تیمور انکل تو ویسے بھی ٹور پر رہتے ہیں، ایسے میں تم وہاں اکیلی کیسے رہتیں۔؟" ارصم چلتے چلتے رکا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔
"کیوں، ماہیر بھی تو رہ رہا ہے ناں۔؟" اس نے احتجاجی نظروں سے اپنے کزن کو دیکھا جس کے ساتھ پاکستان آتے ہی اس کی دوستی ہو گئی تھی۔
"وہ لڑکا ہے وہ رہ سکتا ہے۔" ارصم نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔
"یورپ میں لڑکا لڑکی کی کوئی تقسیم نہیں ہوتی۔" اوریدا نے جواباً اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"لیکن تمہاری روٹس تو مشرقی معاشرے کی ہیں، انکل تیمور جتنے بھی لبرل ہو جائیں، وہ اپنی بیٹی کو یورپی سوسائٹی میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔" ارصم ایک دفعہ پھر چلنے لگا۔ اوریدا کو اس کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔

"تو یہاں کون سا کسی کو میری آمد سے خوشی ہوئی ہے۔" اوریدا نے سڑک پر پڑے ایک پتھر کو ٹھوکر لگائی۔
"تمہیں کس نے کہا....؟" ارصم نے نظریں چرا کر آہستگی سے پوچھا اس حقیقت سے تو وہ بھی باخبر تھا۔
"لو بڑے ابا کا مجھے دیکھتے ہی بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔" اوریدا نے منہ بنایا۔
"وہ تو ہائی بلڈ پریشر کے پیشنٹ ہیں۔" ارصم نے اسے ناکام سی دلیل دینے کی کوشش کی۔
"اور بیا آنٹی کا تو بس نہیں چلتا، مجھے گولی سے اڑا دیں۔" اوریدا کی معصومیت اور صاف گوئی بعض دفعہ اگلے بندے کو اچھا خاصا شرمندہ کر دیتی تھی۔ یہی حال ارصم کا ہوا تھا اس وقت۔
"ماما تو ویسے بھی مزاج کی تیز ہیں پاپا کی ڈیتھ کے بعد وہ ویسے بھی شارٹ ٹیمپر ہو گئی ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ کرنے لگتی ہیں۔" ارصم نے اپنی طرف سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی جسے اوریدا نے ایک چٹکی میں اڑا دیا۔
"اچھا مجھے تو لگتا ہے، وہ مجھے سخت ناپسند کرتی ہیں اور انہیں میرا پاکستان آنا بھی پسند نہیں آیا۔" اوریدا کی بات پر ارصم جھنجلا سا گیا۔
"تم بعض دفعہ اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں کیوں کرنے لگتی ہو اوریدا....؟"
"جن بچیوں کی مائیں بچپن میں انہیں تنہا چھوڑ جاتی ہیں، زندگی کی تلخ حقیقتیں انہیں وقت سے پہلے بڑا کر دیتی ہیں۔" اوریدا کی بات پر ارصم کو شاک سا لگا۔ وہ پریشانی سے اپنی پندرہ سالہ کزن کا سنجیدہ سا چہرہ دیکھنے لگا جسے پاکستان آئے ہوئے بمشکل چھ ماہ ہوئے تھے اور وہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو ضرورت کیا تھی تیمور کی بیٹی کو پاکستان لانے کی۔" بینش نے چائنیز رائس اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے ڈاکٹر حماد آغا سے گلہ کیا۔ جنہیں نیلی

کوٹھی میں سب آغا جی کہتے تھے' وہ بینش کے والد اور ارصم کے نانا تھے۔

"وہ بے چارا اپنی مسز کی ڈیتھ کے بعد اتنا اپ سیٹ تھا' مجھ سے رہا نہیں گیا۔" آغا جی نے رشین سلاد کھاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا' ویسے بھی وہ اپنی بیٹی کے مقابلے میں خاصے نرم دل اور شفیق واقع ہوئے تھے۔

"ہاں تو وہ خود بڑے ابا سے بات کرتا' دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی عادت تو اسے ہمیشہ سے ہے۔" بینش کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر نمایاں تھا۔ آغا جی نے بڑے غور سے اپنی بیٹی کا جھنجلایا ہوا چہرہ دیکھا۔

"تمہیں تیمور کی بیٹی سے پرابلم کیا ہے بینش....؟" بات اتنی سادہ نہیں تھی' جتنا سادہ آغا جی کا لہجہ تھا۔

"آپ کو نہیں پتا۔" وہ ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں پٹخ کر غصے سے کھڑی ہو گئیں۔

"بیٹھ جاؤ اور آرام سے بات کرو۔" آغا جی نے نرمی سے کہا اور وہ کچھ سوچ کر بیٹھ گئیں' لیکن مزاج ہنوز برہم تھا۔

"اس کی وجہ سے ارصم کی اسٹڈی سخت ڈسٹرب ہو رہی ہے۔" انہوں نے سوچ کر ایک بات نکال ہی لی۔

"میرے خیال میں تو ارصم کے پیپرز زبردست ہوئے ہیں اور مجھے امید ہے وہ اس دفعہ بھی ٹاپ کرے گا۔" آغا جی نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے اپنی بیٹی کو دلاسا دیا۔

"آغا جی! انٹری ٹیسٹ ابھی باقی ہے اور میں اسے کنگ ایڈورڈ سے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔" ڈاکٹر بینش کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے والد کو سمجھائیں۔ ارصم ان کا لاڈلا تھا اور اس کے دفاع کے لیے وہ کہیں نہ کہیں سے جواز ڈھونڈ ہی لاتے تھے۔

"ارصم' ماشاء اللہ جتنا لائق ہے' آرام سے فرسٹ لسٹ میں اس کا نام آجائے گا۔" وہ اب ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

"تیمور کی دنیا جہان کی نالائق بیٹی اس کا پیچھا چھوڑے گی تو وہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرے گا۔" ڈاکٹر بینش کا مسئلہ کچھ اور تھا۔

"تیمور کی بیٹی کا نام اوریدا ہے...." آغا جی نے سنجیدگی سے یاد دلایا تو وہ بری طرح تپ گئیں۔

"آغا جی! میں جتنی سیریس ہوں' آپ اتنا ہی اس مسئلے کو لائٹ لے رہے ہیں۔"

"تم نے خوامخواہ اس بات کو اپنے سر پر سوار کر لیا ہے' اس فضول سی بات کو جواز بنا کر تم ارصم سے بھی اپنی ریلیشن شپ خراب کر لو گی۔" ان کی بات پر وہ بری طرح چونکیں۔ انہوں نے غور سے آغا جی کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

"آپ سے کچھ کہا ہے اس نے....؟" انہیں معلوم تھا ان کا بیٹا ان سے زیادہ اپنے نانا اور بڑے ابا کے قریب ہے۔

"ہاں...." آغا جی نے سنجیدگی سے بینش کا پریشان چہرہ دیکھا اور صاف گوئی سے کہا۔ "اسے لگتا ہے تم اوریدا کے ساتھ اوور ری ایکٹ کرتی ہو۔"

"تو اسے کیا پرابلم ہے...." وہ بھڑکیں۔

"وہ دونوں اچھے دوست ہیں...." آغا جی کی اطلاع نے انہیں ایک دفعہ پھر بے سکون کیا۔

"اس دوستی ہی سے تو میں خار کھاتی ہوں' زہر لگتی ہے تیمور کی بیٹی' میرا بس نہیں چلتا۔" بے تحاشا غصے کی زیادتی کی وجہ سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چپ کر گئیں۔ آغا جی نے ملامتی نگاہوں سے اپنی اکلوتی بیٹی کو دیکھا اور خاموشی سے ڈائننگ روم سے نکل گئے۔ ڈاکٹر بینش کا پارہ ایک دم ہی ہائی ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج کی رات بھی ان کی خاصی ٹینشن میں گزرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! لگتا ہے آپ نے مجھے بڑے ابا کے گھر میں نہیں کسی ہاسٹل میں بھجوا دیا ہے...." اوریدا اپنا سیل فون کان کے ساتھ لگائے بڑے سکون سے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف تیمور اپنی بیٹی کی بات سن کر مسکرائے۔

"وہ کیوں بھئی...؟"

"دیکھیں ناں، بڑے ابا فزیشن، آغا جی آرتھوپیڈک سرجن، آنٹی بیا، گائنا کولوجسٹ اور اب ارصم بھی اس لسٹ میں شامل ہونے جا رہا ہے۔" اس نے انگلیوں پر گن کر میڈیکل پروفیشن سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے نام بتائے جو نیلی کوٹھی میں موجود تھے۔

"ہاں... اس کے بعد اس لسٹ میں شامل ہوں گی ڈاکٹر اوریدا تیمور..." بابا کی بات پر اوریدا کو کرنٹ لگا۔

"نو نیور بابا... ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔" اوریدا کے جواب سے تیمور صاحب کو جھٹکا سا لگا۔

"سخت برا لگتا ہے مجھے یہ پروفیشن، میں تو فائن آرٹس میں ماسٹرز کروں گی۔" اوریدا کے مستقبل کے ارادے کو سن کر تیمور صاحب کو ایک دم ہی غصہ آیا۔

"رہیں ناں ماں کی طرح جاہل کی جاہل..." وہ بولے نہیں بلکہ پھنکارے تھے۔

"بابا...!" اوریدا کو سخت صدمہ پہنچا۔

"دوبارہ فائن آرٹس کا نام تمہاری زبان پر آیا تو زبان کھینچ لوں گا، میں نے تمہیں اس لیے پاکستان نہیں بھجوایا کہ تم یہ فضول سبجیکٹ پڑھو، سمجھیں۔" تیمور کے غصے نے اوریدا کی آدھی جان نکال دی۔

"جی بابا..." وہ بمشکل بولی۔

"تم ایف ایس سی کر کے ڈاکٹر بنو گی، بس..." تیمور صاحب کے اگلے حکم سے اس کی روح فنا ہوئی۔

"لیکن بابا..." اس نے احتجاج کی خاطر منہ کھولا ہی تھا کہ دوسری جانب تیمور نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں، ایف ایس سی کے بعد سیدھا سیدھا میڈیکل میں جاؤ، ورنہ میں تمہاری شادی کر دوں گا۔" تیمور کی اگلی دھمکی سن کر تو اوریدا کی ایسی زبان گنگ ہوئی جو شام میں ارصم کے سامنے جا کر کھلی۔

"تو اس میں رونے والی کیا بات ہے۔" ارصم اس کے بے تحاشا رونے پر پریشان ہوا۔

"سخت برا لگتا ہے مجھے میڈیکل۔" اس نے اپنا مسئلہ بتایا۔

"اتنا بھی برا نہیں ہے، جتنا برا تم منہ بنا رہی ہو..." ارصم نے ٹشو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز سے کہا۔

"میرا ایف ایس سی میں کبھی میرٹ نہیں بنے گا۔" اس نے روتے ہوئے اصل مسئلہ بتایا۔

"محنت سے ہر کام ہو جاتا ہے۔" اس کے پاس بھی ہر مسئلے کے لیے محنت اور کوشش کی چابی موجود تھی۔

"مر مر کر تو میرا نائنتھ میں بی گریڈ آیا تھا..." اوریدا نے ٹشو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے یاد دلایا۔

"ان شاء اللہ اب اے گریڈ آجائے گا۔" ارصم نے حوصلہ افزائی کی۔

"لیکن میں ڈاکٹر ہرگز، ہرگز نہیں بنوں گی..." وہ اپنے ارادے پر ابھی تک ڈٹی ہوئی تھی۔

"تو چلو پھر شادی کر لینا..." ارصم نے اسے چھیڑا، اوریدا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے۔ جسے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

"افوہ یار! مذاق کر رہا تھا میں..." ارصم نے بازو سے پکڑ کر اسے بٹھایا، وہ جو خفا ہو کر اندر جانے کے لیے اٹھی تھی۔ ایک دفعہ پھر دھم سے لان کی گھاس پر بیٹھ گئی۔ ایک دفعہ پھر وہ دھواں دھار انداز سے رونا شروع کر چکی تھی۔ ارصم کو اگلے دو گھنٹے لگ گئے اسے منانا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ میری بک کے اوپر چائے کا کپ کس نے رکھا تھا۔" بڑے ابا جو ہسپتال سے سیدھا لاؤنج میں آئے تھے اور شیلف میں رکھی اپنی میڈیکل کی کسی کتاب پر رکھا خالی چائے کا کپ انہیں بری طرح تپا گیا۔

اس وقت اوریدا، بڑی اماں اور لوا رحمت کے ساتھ بیٹھی پی ٹی وی کا کوئی ڈرامہ بڑے ذوق و شوق سے دیکھنے میں مگن تھی۔ بڑے ابا سے تو اس کی جان جاتی تھی اور اس وقت انہیں بالکل اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ سخت گھبرا گئی۔

"کون سا کپ۔۔۔؟" بوا رحمت نے پریشانی سے بڑے ابا کے ہاتھ میں موجود کتاب کو دیکھا' جس پر کپ کا گول سا نشان خاصا واضح تھا۔

"یہ۔۔۔" بڑے ابا نے خالی کپ ان کے سامنے لہرایا۔

"یہ تو اوریدا نے رکھا تھا۔۔۔" بوا رحمت کی زبان پھسلی۔

"ایک جاہل ماں کی جاہل بیٹی کو اتنی تمیز کہاں۔۔۔" ان کے تلخ لہجے میں کہے جملے پر اوریدا کا رنگ فق ہوا' یہ اس دن ماں کے حوالے سے ملنے والا دوسرا طعنہ تھا۔ جسے سن کر اس کا دل بھر آیا۔ بڑے ابا اپنے کمرے کی طرف جا چکے تھے۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے' احتیاط کیا کرو' اب بڑ گئی ناں ڈانٹ۔" بڑی اماں کی جھنجلاہٹ پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے' جسے دیکھ کر بڑی اماں کا دل موم ہوا۔ ویسے بھی نیلی کوٹھی میں ایک بڑی اماں' ارحم کے علاوہ بوا رحمت ہی تھیں جن کی محبت پر اسے کبھی شک نہیں ہوا تھا' لیکن اب وہ ان کی طرف سے بھی بدگمان ہو چکی تھی۔

"ہائے ہائے' اس میں بے چاری بیٹا کا کیا قصور' میری ہی سستی تھی جو اٹھانا بھول گئی۔" بوا رحمت اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہوئیں۔

"تو یہ کون سا چھوٹی ہے' میٹرک کا رزلٹ آنے والا ہے اس کا۔" بڑی اماں آج اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"اچھا اچھا' اب آپ کچھ مت کہیے گا بیٹا کو۔" بوا رحمت گھر کی خاندانی ملازمہ تھیں' اس لیے بے تکلفی سے ہر بات کہہ جاتیں۔

"میں تو اس کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی تھی' جتنا چاہتی ہوں دادا اور پوتی کے درمیان فاصلے کم ہوں اتنے ہی۔" بڑی اماں نے سنجیدہ سے انداز سے بات ادھوری چھوڑی۔

"آج کا تو دن ہی برا ہے۔" اوریدا نے بازو کی پشت سے بے دردی سے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا' اسی لمحے ڈاکٹر بینش عجلت بھرے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوئیں اور اندر کا ماحول دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹک کر رک گئیں۔ سامنے اوریدا کا متورم چہرہ اور بڑی اماں کی سنجیدگی نے انہیں معاملے کی سنگینی کا احساس دلایا۔ انہوں نے عجلت بھرے انداز سے سلام کیا' بڑی اماں کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کا تاثر اوریدا نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔

"تائی اماں! بڑے ابا کہاں ہیں؟" بینش نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔" بڑی اماں نے مختصراً جواب دیا' ڈاکٹر بینش فوراً ہی بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"اس کی موجودگی میں کہاں کسی کے تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں۔" بڑی اماں نے ناگوار انداز سے بوا رحمت کو مخاطب کیا۔ جو نظریں چرا کر رہ گئی تھیں۔

اوریدا کو ان کا انداز خاصا عجیب لگا۔ اتنا تو اسے بھی احساس تھا کہ بڑی اماں اور آنٹی بینش کی ایک دوسرے کے ساتھ بنتی نہیں تھی لیکن ان کا بیٹا ارحم بڑی اماں اور بڑے ابا کا خاصا چہیتا تھا۔ وہ اس پہیلی کو بوجھنے سے قاصر تھی۔ اوریدا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی اور پھر اگلے دن ہی شام کو باہر نکلی۔ نیلی کوٹھی کے پچھلے صحن میں بنے برآمدے میں بڑی اماں کا بڑا سا لکڑی کا ایک تخت اور کچھ فاصلے پر ایک جھولا تھا۔

"کیا بات ہے اوریدا' چپ چپ کیوں ہو؟" شام کو بڑی اماں نے اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بڑی اماں۔" وہ ان کے تخت پر بیزاری سے لیٹ گئی۔

"اوں ہوں۔ مغرب کا ٹائم ہے' ایسے نہیں لیٹتے۔" انہوں نے فوراً ٹوکا۔

"بڑی اماں' میں آپ کی سگی پوتی ہوں ناں۔" اوریدا کے اوٹ پٹانگ سے سوال پر بڑی اماں کا کروشیہ چلاتا ہوا ہاتھ رکا۔

"تو پوتی بھی بھلا کوئی سوتیلی ہوتی ہے۔" بڑی اماں

کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی' وہ اپنے سفید جارجٹ کے دوپٹے پر کروشیے سے ایک نفیس سی بیل بنا رہی تھیں۔

"کیوں' اگر میں اپنے پاپا کی سوتیلی بیٹی ہوں تو آپ کی سوتیلی پوتی ہی ہوئی ناں۔" اس نے منہ بنا کر وضاحت کی۔

"لیکن تم تو تیمور کی سگی اولاد ہو۔" بڑی اماں کا موڈ خاصا خوشگوار تھا' ورنہ عموماً" وہ اس کے سوال و جواب کے دو دھاریے سے خاصا گھبراتی تھیں۔

"سگی اولاد ہوتی تو اتنی دور پھینکتے مجھے۔" اس کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

"کیوں' کیا ہوا۔؟" بڑی اماں نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔

"میں نے ڈاکٹر بننے سے انکار کیا تو خفا ہو گئے' اس کے بعد سے میرا فون ہی اٹینڈ نہیں کر رہے۔" اس نے اصل بات بتائی۔

"کوئی بات نہیں' اس کا باپ بھی ایسے ہی خفا ہوا تھا' جب اس نے بھی ڈاکٹر بننے سے انکار کیا تھا۔" بڑی اماں کی زبان پھسلی' وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اسی وجہ سے بڑے ابا' پاپا سے خفا ہیں۔؟" اوریدا کے سوال پر بڑی اماں سٹپٹا سی گئیں۔

"تو وہ کیوں ہونے لگے اپنے اکلوتے بیٹے سے خفا۔؟" انہوں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"پھر پاپا پچھلے تیرہ سال سے پاکستان کیوں نہیں آئے۔" اوریدا کا دماغ آج ٹھیک کام کر رہا تھا۔

"اس کا بزنس جو ہے انگلینڈ میں۔" بڑی اماں نے کمزور سی دلیل دی۔

"اچھا۔ بڑے ابا اور پاپا آپس میں بات کیوں نہیں کرتے۔؟" اس کی بات پر بڑی اماں جھنجلا سی گئیں۔

"میرا سر مت کھاؤ' پہلے ہی تمہارے بڑے ابا کا کل سے سخت موڈ خراب ہے' تم نے ان کی کتاب کا کور جو خراب کر دیا تھا۔"

"ہونہہ۔ میرے اور آپ کے ساتھ ہی موڈ خراب ہوتا ہے' آنٹی پیا سے تو بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے کل لان میں' اور رات ارصم سے شطرنج کی بازی بھی لگائی تھی' سارا غصہ اور ساری ناراضی تو بس میرے لیے ہے۔"

وہ عام حالات میں تو سچ بولتی تھی' لیکن غصے میں اس کی دوسروں کو آئینہ دکھانے والی صلاحیت کو چار چاند لگ جاتے تھے تب ہی وہ اپنی بات کر کے پاؤں پٹختی ہوئی کمرے کی طرف بڑھ گئی اور بڑی اماں کے سر کا درد اچانک ہی بڑھ گیا' رات تک بلڈ پریشر بھی خطرناک حد کو چھونے لگا' جس کے نتیجے میں بڑے ابا کے اچھے خاصے چھکے چھوٹ گئے۔

☆ ☆ ☆

"کیا مصیبت ہے مونا' تمہیں یہ ایکسر سائز سمجھ کیوں نہیں آ رہی۔؟"

عدینہ جو کہ ویک اینڈ پر گھر آئی ہوئی تھی' اس وقت مونا کو میتھس سمجھا رہی تھی جس نے فرسٹ ایئر کا امتحان دینا تھا۔ مونا کا سارا دھیان بے بے کے چرخے کی طرف تھا' جس پر وہ بڑی مہارت سے سوت کات رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھی آپا صالحہ ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانے پوری توجہ سے پرو رہی تھیں۔

"بہت مشکل ہے ساری مشق۔" مونا نے منہ بنایا۔

"دھیان تو تمہارا سارا چرخے کی طرف ہے' سوال کیا خاک سمجھ میں آئیں گے۔" عدینہ نے چڑ کر کہا تو آپا صالحہ نے چونک کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"کوئی آسان فارمولا لگا کر سمجھاؤ ناں اسے۔" آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کو جھٹکا سا لگا۔

"آپا' آپ کو کیسے پتا' اس سوال میں ایک اور فارمولا بھی لگ سکتا ہے۔" عدینہ کے بے ساختہ سوال پر آپا بری طرح گڑبڑا گئیں۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

"ہر مشکل نظر آنے والی چیز کا ایک بڑا سادہ ساحل بھی ہوتا ہے' جو انسان کو پہلی نگاہ میں سجھائی نہیں دیتا' تھوڑا غور کرے تو مشکلوں میں ہی آسانیاں بھی مل جاتی

ہیں۔" آپا صالحہ نے تسبیح کے دھاگے کو گانٹھ لگاتے ہوئے عدینہ کو حیران کیا۔

"ادھر آؤ اور سکون سے یہاں بیٹھو' میں دوبارہ سمجھاتی ہوں۔" عدینہ نے مونا کی پشت چرخے کی طرف کی تو بے بے کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"جتنا مرضی زور لگالے پتر! اس کے دھیان کی کھڑکیاں تو میرے چرخے کی طرف ہی کھلی رہیں گی۔ جب یہ حساب سمجھنے پر راضی ہوگی تو تب سمجھانا۔" بے بے نے مونا کی طرف داری کرتے ہوئے عدینہ کو کہا تو اس نے منہ بناتے ہوئے کتاب بند کردی۔

"جاؤ بھاگو یہاں سے' رات کو سمجھاؤں گی یہ مشق۔" مونا کو جیسے ہی آزادی ملی وہ اچھلتی ہوئی بے بے کے چرخے کے سامنے جا بیٹھی۔ اب وہ بہت دلچسپی سے بے بے کو اپنا کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب کہ عدینہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف آگئی۔

"عدینہ باجی۔ عدینہ باجی۔" تھوڑی ہی دیر بعد مونا بڑے مشکوک سے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی' اور دائیں بائیں دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

"عدینہ باجی! عبداللہ بھائی آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" مونا کی آنکھوں کی شوخی پر عدینہ کا دل ایک انوکھی لے پر دھڑکا۔

"کب۔؟"

"تھوڑی دیر پہلے بے بے اور آپا نے بلایا تھا انہیں' ابھی بھی کمرے میں ہیں۔" مونا کی بات پر وہ کچھ حیران ہوئی۔

"تو میں کیا کروں۔؟" اس نے منہ بنایا۔

"آپ چائے والی ٹرے لے کر جائیں ناں اندر۔" مونا نے بڑی عجیب سی فرمائش کی۔

"میں۔؟" عدینہ جھجک سی گئی۔

"ہاں ناں' جلدی کریں' مجھے لگتا ہے اندر کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔" مونا کی بات پر وہ فوراً" اٹھی اور کچن سے جا کر وہ ٹرے اٹھائی' جس میں مونا نے چائے بنا کر پہلے سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی

بے بے کے کمرے کے پاس پہنچی' دروازہ کھلا اور دراز قد عبداللہ کو دیکھتے ہی اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔

"عدینہ' مجھے تم سے ایک خاص بات کرنی ہے؟"
اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔ عدینہ کا دل انوکھی لے پر دھڑکا۔

"جی۔" وہ پلکیں جھکائے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عبداللہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کی دو انگلیاں عدینہ کے ہاتھ سے ٹکرائیں۔ عدینہ کو کرنٹ سا لگا اس نے گھبرا کر ٹرے چھوڑ دی۔ جو اس نے مسکراتے ہوئے پکڑ کر برآمدے میں ــــ میز پر رکھ دی۔

"جی۔" عدینہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"گھبراؤ مت۔" وہ مسکرا کر مزید گویا ہوا۔
"یہ میرا سیل نمبر ہے۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے پہلے سے ایک چٹ پر لکھا نمبر عدینہ کی طرف بڑھایا جو اس نے جھجکتے ہوئے پکڑ لیا۔

"میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں کی حدت سے پگھل رہی تھی۔ اسی لمحے بے بے کے کمرے کا دروازہ کھلا' آپا صالحہ کا ناراض چہرہ اندر سے برآمد ہوا۔ عبداللہ گھبرا کر فوراً" باہر کی طرف چل پڑا۔ آپا صالحہ نے جانچتی ہوئی نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔ عدینہ کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کاغذ کے چھوٹے سے پرزے کو اپنی مٹھی میں بند کیا جس میں عبداللہ کا نمبر تحریر تھا۔

"یہ کیا ہے۔؟" آپا کی عقابی نظروں نے عدینہ کی اس حرکت کو تاڑ لیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔
"دکھاؤ مجھے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر زبردستی اس کی مٹھی کھولی' عدینہ مزاحمت نہیں کر سکی۔
"حافظ عبداللہ" چٹ پر لکھا نام اور اس کے آگے لکھا نمبر پڑھ کر آپا کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ انہیں سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔

"اس نے دیا ہے تمہیں۔؟" آپا کا سرد لہجہ عدینہ کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"جی۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے بات کرنے کی۔ کوئی تعلق نہیں ہے تمہارا اس سے۔" آپا نے اس کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔

"آپا۔" لفظ اس کے لبوں میں ہی دم توڑ گئے۔
"سب کچھ ختم کر دیا ہے میں نے۔" آپا صالحہ نے اس کے جسم پر بلڈوزر چلایا۔

وہ گھبرا کر خوف زدہ نگاہوں سے آپا کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس پر عبداللہ کے لیے سوائے نفرت' بے زاری اور کوفت کے کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے غصے سے اس پرچی کے پرزے کرکے برآمدے کے کونے میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی عدینہ احمد کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے ــــ کرکے اسی ٹوکری میں ڈال دیے ہوں۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ جو بڑے پرسکون انداز سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"دیکھیں آپ مجھے ایک چانس دے کر تو دیکھیں' میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔" سرمد بے زاری سے اپنے دوست ارسل کے پروڈکشن ہاؤس میں دھرنا دیے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا' جواب باقاعدہ منتوں پر اتر آئی تھی' اسے ایسی لڑکیوں سے سخت چڑ ہوتی تھی۔

وہ جو کسی کام سے ارسل کے پاس آیا تھا اور اب کوفت بھرے انداز سے پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔ اسے ارسل کے آفس میں آئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے' جب شانزے نام کی یہ لڑکی وہاں چلی آئی اور اب

وہ خوامخواہ ارسل کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔
"دیکھیں مس شانزے! جس پروجیکٹ کی آپ بات کررہی ہیں اس کے لیے ہمیں تجربے کار ایکٹریس کی ضرورت ہے' بلکہ اسٹار کاسٹ چاہیے۔" ارسل کی قوت برداشت پر سرمد کو بے ساختہ رشک آیا۔
"لیکن سر' جب تک آپ لوگ نیو ٹیلنٹ کو چانس نہیں دیں گے تب تک ہمیں کوئی ایکسپیرینس کیسے ہوگا۔" اس لڑکی نے بھی ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ وہ ارسل کے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھی تھی اور اس کا اگلے دو گھنٹے تک اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔
"لیکن میں اپنا اتنا بڑا پروجیکٹ کسی تجربے کی نظر نہیں کرسکتا۔" ارسل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی سر۔" وہ بھی اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔
"چلیں اس دفعہ تو نہیں لیکن نیکسٹ پروجیکٹ پر میں آپ کو ضرور چانس دوں گا۔" ارسل نے اسے بہلانے کے لیے چارہ پھینکا' لیکن وہ بھی شاید ان گھاگ پروڈکشن ہاؤس والوں کے مزاج کے سارے رنگوں کو سمجھنے لگی تھی۔
"سب یہی کہتے ہیں اور اس کے بعد کوئی کال تک اٹینڈ کرنا گوارا نہیں کرتا۔" اس کی صاف گوئی بھی آج عروج پر تھی۔
"میں ایسا نہیں ہوں' آپ مارکیٹ میں کسی سے بھی میرے بارے میں پوچھ سکتی ہیں۔" ارسل اب ہلکا سا جھنجلا گیا۔
"اسی لیے تو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔" اس کا اطمینان دیدنی تھا۔
"آپ کی کوالیفیکیشن کیا ہے؟" خاموش بیٹھا سرمد اچانک ہی بولا۔
"بی ایس میڈیا سائنسز۔" اس نے بے زاری سے سرمد کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے سرمد کو بھی محسوس ہوا کہ وہ یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔
"ایکسکیوزمی' آپ نے مہش کے برائیڈل ویک میں ماڈلنگ کی تھی نا؟" سرمد کو اچانک یاد آیا۔
"جی نہیں۔۔۔" شانزے اس دن کی ذلت کو کیسے بھول سکتی تھی۔ لیکن اس لمحے اس قصے کو یہاں دہرانا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ شانزے کے جواب نے سرمد کو ہلکا سا حیران کیا۔ لیکن اس نے اس پر تبصرہ کرنے سے دانستہ گریز کیا۔ سرمد کے اس سوال نے شانزے کو اب پریشان کردیا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کم از کم ارسل کے سامنے یہ شخص اس حوالے سے کوئی اور سوال کرے تب ہی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ٹھیک ہے سر! میں آپ کی آفر کا ویٹ کروں گی۔" اس نے پھیکے انداز سے مسکراتے ہوئے اپنا کلچ اٹھایا اور آفس کے دروازے کی طرف بڑھی' ارسل کے منہ سے ایک پرسکون سانس خارج ہوا۔
"یہ لڑکی جھوٹ بول رہی تھی' اس نے مہش کے برائیڈل ویک میں حصہ لیا تھا۔"
کمرے سے نکلتے ہوئے شانزے نے سرمد کا جملہ سنا اور اس کے ساتھ ہی اس کا سارا سکون بھی غارت ہوگیا۔ آفس کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر خود کو بدقسمت لوگوں کی لسٹ میں سرفہرست دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)
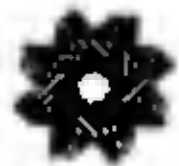
سلونے سیاں سوتے ہو کیا؟ جاگو
نندیا مانگے پھولوں جڑی رے
حرافہ مانگے پھولوں جڑی رے
منے کے ابا سوتے ہو کیا جاگو
سب زیوروں میں جھومر پڑا ہے
وہی نند کو دو رے
البیلے سیاں وہی نند کو دو رے
حرافہ جھومر لیتی نہیں رے۔"

خود سوال۔ خود جواب۔ باریک رسیلی کپکپاتی لہریں لیتی بوڑھی آواز میں سر کا جادو جگاتی ہوئی اماں جان کوئی اپنی ہی عمر کا پرانا گیت گا رہی تھیں۔ بہت شوقین تھیں پرانے سب گانے ان کو ازبر تھے۔ نواسی

## مکمل ناول

ناگواری سے منہ بنا رہی تھی۔ افوہ ان بڑی بی کے شوق' دل بہلانے کے لیے خوب فرصت ملتی تھی۔ اپنی خوشی میں مست۔۔۔ ارے کبھی مجھ غریب پر بھی نظر کرم فرما لیتیں کہ مجھے کیا چاہیے؟ مگر بھلا بتاؤ۔ سات سمندر پار پوتے کی پیدائش کی خبر ملتے ہی گانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"اماں جان! کون سا گانا شروع کیا ہے۔ زور سے گائیں تو کچھ سمجھ میں بھی آئے۔"

طنزاً کہا تھا ورنہ سب سمجھ میں آ رہا تھا۔ نانی نے نواسی کو گھور کر دیکھا۔ کھجور کا پنکھا تکیے پر رکھا۔ یہ پنکھا ان کا ٹریڈ مارک نہ تھا۔ صرف شوق تھا۔ جو لوڈشیڈنگ کی ایجاد کے طور پر ان کے ہاتھ میں رہتا۔ اس سے کئی کام لیے جاتے۔ نواسی کی ٹھکائی کے لیے بھی بہترین۔

"زچہ گیری گا رہی ہوں۔ اور کتنی زور سے گاؤں۔ حلق اور پھیپھڑوں میں دم ہی کہاں ہے؟" ہائے مجبوریاں۔

"تو۔۔۔ حلق اور پھیپھڑوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"اوئی۔ اپنی خوشی کے لیے گاؤں بھی نہیں؟ چار پوتیوں کے بعد پوتے کی خوشخبری آئی ہے۔ جی تو چاہ رہا ہے۔ ناچوں۔ مگر ڈرتی ہوں۔ گر گرا گئی۔ تو بے موت نواسی اٹھانے بھی نہیں آئے گی۔"

"میں بے موت؟ اچھا پھر آپ کا ہی اثر آیا ہو گا مجھ میں۔ خون کا آخر اثر ہوتا ہے۔"

"ددھیال سے ہوتا ہے خون کا تعلق۔ ننھیال کو بدنام نہ کرنا اور مجھے ٹوکا نہ کرو۔ بندہ اپنی خوشی منانے' ناچتا بھی ہے گاتا بھی ہے۔ دوسروں کو دکھانے سنانے نہیں' آئی سمجھ؟"

"اگلے کو خوشی میں شریک کر لیں تو خوشی دو آتشہ ہو جائے۔ کہیے تو آپ کی خوشی کے لیے طائفہ بلا دوں۔"

"اے ہے۔ توبہ کر۔ میں خود گا سکتی ہوں۔ شریک تو جب کروں کہ تم میرا ساتھ دو گانے میں۔"

"چلیں پھر۔ میرے ساتھ آواز ملائیں۔" سر میں گانا شروع کیا۔

"باجرے دی راکھی۔ اڑیا باجرے دی راکھی۔
ماہیا میں نہ بھہندی وے۔
اڑیا میں نہ بھہندی وے۔
تیرے باجرے دی راکھی۔"

"اوئی' یہ کون سی جناتی زبان کا گیت ہے؟ ہمیں تو اپنے گانے آتے ہیں۔"

"یہ میری ددھیالی زبان کا گیت ہے۔ لاہوریوں کا۔ آپ اپنے سو سال پرانے دور سے نکلیے اماں جان۔"

"جیسے میرا خاندان کوئی اور ہے؟ چل بھاگ۔ مجھے اپنا گانا ختم کرنے دے۔"

ارے سب بھائیوں میں بھولا ہے پگلا۔
وہی نند کو دو رے۔
منے کے ابا وہی نند کو دورے۔
نندیا باؤلا لیتی نہیں رے۔
حرافہ باؤلا لیتی نہیں رے۔
نندیا مانگے پھولوں جڑی رے۔"

سانس لینے کو رکیں۔ بوڑھے پھیپھڑوں میں بس اتنا ہی دم تھا۔

"اچھا اماں جان۔ یہ باؤلا کہاں دستیاب ہوا۔ اور کیوں نند کو دیا جا رہا ہے۔"

"بھائی کے گھر بیٹا ہوا ہے۔ تو بہن نیگ مانگ رہی ہے۔ بھابھی چالاک ہے۔ اپنا پاگل بھائی نند کے سر منڈھ رہی ہے۔ وہ بھلا باؤلا کیوں لے۔ اب سنو کیا لیتی ہے؟

"ارے سلونے سیاں سوتے ہو کیا؟ جاگو
نندیا مانگے پھولوں جڑی رے
ارے سب گاؤں میں میر ٹھ بڑا ہے
وہی نند کو دو رے
سلونے سیاں۔ وہی نند کو دو رے
حرافہ میرٹھ لے کر چلی رے
چالاکو میرٹھ لے کر چلی رے۔"

"لو۔ میرٹھ کوئی پھولوں کی ڈالی ہے کہ لے کر چلی۔"

نواسی کی مین میخ سے نانی عاجز آگئیں۔

"جائیداد۔ میری بچی۔ ایک گاؤں یعنی کہ جائداد۔ زمین پھولوں جڑی۔ کیا سمجھی کوڑھ مغز۔"

"او۔۔۔ اچھا اچھا اے کاش۔ میں بھی بڑے ماموں سے میرٹھ مانگ لیتی نیگ میں۔ چلو میرٹھ نہ سہی۔ قصور دے دیں۔ اچھا تو پھر چیچو کی ملیاں ہی سہی۔ نہیں تو پشاور کا ڈمہ ڈولا ہی لے لوں گی۔ بدرجہ مجبوری۔ ورنہ تو۔۔۔ آپ ہی بتا دیں کون سا گاؤں مانگوں۔"

"پاگلوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔" نانی سخت ناراض ہوتیں تو ایسا ہی جملہ کہہ کر لیٹ جاتیں۔ مگر اس وقت انہیں اپنے بیٹے کے کھانے کی فکر تھی۔ لاڈلی بیگم تو میاں کے لیے کچھ پکاتی نہ تھیں۔ ایک نوراں ملازمہ تھی۔ وہ صبح کام کر کے جا چکی تھی۔

"ماموں کے کھانے کا سوچا۔ کیا کھائے گا آکر نگوڑا۔" آخر بولنا پڑا۔

"نوراں نے آلو پالک پکا دیا ہے۔ وہی دستیاب سبزی گھر میں تھی۔ روٹی وہ تندور سے لائیں گے۔"

"آئیں؟ سبزی اور گوشت کہاں گیا۔"

"میرے پیٹ میں۔ بلکہ میرے اور نوراں کے پیٹ میں۔ دو تین بوٹیاں ہی تھیں۔ ہم نے تکے بھون کر کھائے۔ مزا آگیا۔"

"پورا ایک پاؤ گوشت تھا۔۔۔ اللہ سمجھے فجر! نوید کو پالک پسند نہیں۔"

"تو لے آئیں گے کباب۔۔۔ لاڈلی بیگم کی فرمائش پر۔ روز کی طرح۔" لاپروائی۔ اف۔

اماں جان سٹپٹا کر پلنگ سے اتریں۔ کچن کی راہ لی۔ اب لاڈلے بیٹے کے لیے انڈے بنائیں گی۔ یا چکن قورمہ اور ساتھ ہی کوئی میٹھا۔ بڑی بی خود بھی سویٹ ڈش کی شوقین۔ نواسی کو کھانے سے دلچسپی۔ پکانے سے الرجی۔ نانی کچن میں بھی گنگنانے سے باز نہ آئیں۔ باہر سے نواسی نے بہ آواز بلند یاد دلایا۔

"اماں جان! ایک پوتا۔ جوان جہان ماشاءاللہ لاہور میں موجود ہے۔ آپ کو وہ یاد نہیں۔ اس کے لیے تو کبھی کچھ گنگناتی بھی نہیں۔ بڑے ماموں کو تو بڑھاپے میں بیٹا بونس میں مل گیا۔ اس سے آپ کو بھلا کیا ملے گا؟ جس کی مدح سرائی میں آپ مصروف ہیں۔"

"میں لالچی ہوں کیا؟ مجھے پوتا مل گیا۔ بس اور وہ لاہور والا۔ وہ پرایا ہو گیا ہے۔"

"ہائے اللہ۔ پوتا اور پرایا جیسے میں پرائی آپ کی اور ماموں کی کنیز۔"

"اللہ نہ کرے۔ وہ تو میں کبھی غصے میں کہہ دیتی ہوں اسے پرایا۔ نانی ماموں کا غلام۔"

نانی نواسی کے مکالمے تو چلتے رہتے تھے۔ گھر میں ہر وقت کا ساتھ۔ نوراں بدبخت کو روز ہی جانے کی جلدی پڑ جاتی۔ بیٹا بہو آفس، اسکول۔۔۔ یہ لاڈلی نہ جانے اسکول میں کیا کام کرتی ہے۔۔۔ چپراسن لگی ہو گی۔ جاتی فخریہ انداز میں ہے۔ مجھے اسکول جانا ہے۔ پڑھنے جانے سے رہی۔ کہتی ہے تنخواہ ملتی ہے۔ یہ نہیں بتایا کس کام کی تنخواہ۔

"یہ بن ٹھن کر کدھر کے ارادے ہیں؟" نواسی کو نہایا دھویا بہترین لباس میں دیکھ کر چونک گئیں۔

"گھر میں صاف ستھرا رہنا گناہ ہے کیا؟ میں تو ہر وقت بن ٹھن کر رہتی ہوں۔"

"گناہ تو نہیں۔ مگر کل ہی تو وہ گلابی جوڑا پہنا تھا۔ آج اتار کر میلے دان میں ڈال دیا ہو گا۔ نہ تم گھر کی صفائی کرو نہ کچن کا کام۔ کپڑے میلے ہونے کی نوبت نہیں آتی کہ اتار پھینکتی ہو۔ اے بھئی روز روز کپڑے دھلنے سے بدرنگ ہو جاتے ہیں۔ اتنے مہنگے۔ ہماری مجال نہ تھی کہ نانی یا دادی کی اجازت کے بغیر نئے کپڑے نکال کر پہنتیں۔" اماں جان کی فلاسفی الگ ہی تھی۔

"اماں جان۔ بھول جائیں اپنا زمانہ۔ آپ کے انڈیا کا دستور ہے گھر میں میلا کچیلا رہنا۔ ہم پاک لوگ۔

ہیں۔ صاف ستھرے۔ یہ کیا کہ کہیں جانا ہو۔ تو صاف کپڑے پہنو ورنہ کنیز بنے رہو۔"

"پٹے گی میرے ہاتھ سے۔ کہاں سے سن کر آجاتی ہے انڈیا کے قصے۔ ہماری حویلی میں نوکر چاکر کام کرتے تھے۔ صاف ستھرے، مگر یہ ہیں کہ... لو اور سنو ۔" دگڑ بڑا گئیں۔

"حویلی۔ وہ کھنڈرات۔ دیکھ لی تھی تصویر میں نے ۔ نوکر چاکر تو ہوتے تھے۔ مگر گھر میں روز مرہ نہانے کا رواج نہ تھا۔ نئے کپڑے... کہیں جاؤ تو نصیب ہوتے تھے عید کے علاوہ۔"

"اچھا اچھا۔ فضول بکواس نہ کر۔ نوید کے لیے دو روٹی تو ڈال دے میری بیٹی۔ میری جان۔" فوراً" موضوع بدل ڈالا اور فجر نے بھی فوراً" ارادہ بدل لیا۔

"میں تو اپنی دوست سے ملنے جا رہی ہوں۔ نئے کپڑے پہنے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھالوں۔" کہہ کر سامنے سے ہٹ گئی پنکھے کی دسترس سے دور۔

اماں جان کی خفگی سے بچ کر باہر نکل آئی۔ دو چار ہی سہیلیاں تھیں۔ مینو نزدیک تھی۔ دس منٹ میں اس کے گھر پہنچ گئی۔

نوید ماموں اور لاڈلی بیگم ساتھ ساتھ گھر آتے تھے۔ ان کے آنے کا وقت قریب تھا۔ نانی ناشتہ ذرا دیر سے اور بھرپور کرلیتی تھیں، پھر سات بجے ہی کھاتی تھیں۔ اسے بے فکری تھی۔

نانی بڑبڑاتی رہیں۔ پھر اس پر ترس آگیا۔ "کیا کرے بچاری بجھ سے ہی منہ ماری کرتی رہتی ہے۔ کوئی ساتھی نہیں۔ لاڈلی کے نخرے... گھر کا سناٹا اسی کے دم سے ختم ہے وہ نہیں ہوتی تو میں تو پاگل ہو جاتی۔ ماں باپ اس کے نہیں رہے۔ کبھی دادی کے پاس کبھی یہاں۔ اس کا دل بھی ایک جگہ نہ لگتا۔ کیا کرے۔ لڑکا ہوتی تو دوستیاں کرتی۔ اب یہاں ایک دو ہی سہیلیاں ہیں۔ کبھی آجاتی ہیں کبھی یہ چلی جاتی ہے۔ لاڈلی کو اس سے کد ہے۔ ہر بات میں تو اس کی نقل کرتی ہیں۔ مگر... کہاں نقل اور اصل کا فرق رہتا ہے اور یہ بھی لاڈلی کی بات درست ہے کہ نانی دادی کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ بگاڑا نہیں ہے۔ وہ ہے ہی بے فکر ذات نہ کسی کے برے میں نہ بھلے میں اپنی الگ ہی پہچان رکھتی ہے۔ نیک اور ہمدرد، خوش مزاج، تیز مزاج، منہ پھٹ۔ بے دھڑک۔ کچھ بے لگام۔ مرضی کی مالک برا بھلا کہتی رہتی ہوں۔ اس پر اثر ہی کب ہوتا ہے، بلکہ لاڈلی کو دکھانے کے لیے پنکھے کی ڈنڈی سے پٹائی بھی کرتی ہوں۔ پھر بھی لاڈلی منہ بنائے رہتی ہے۔ اے بھئی اب کیا اپنے بچوں کو تیر تلوار سے مارا جائے تب چین ملے گا۔ لو اور سنو۔ نوید کے کان بھرتی ہے۔ وہ زن مرید۔ آکر تن فن سارا غصہ مجھ پر اگل دیتا ہے۔ پاگل اور فجر منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی رہتی ہے۔ پتا بھی ہے سب اسی پر تیر برس رہے ہیں میری معرفت سے... توبہ ہے۔ چلی گئی اکیلا چھوڑ کر نہ جانے یہ چمچہ کہاں رکھ دیا۔"

☼ ☼ ☼

مینو فجر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کے پاس معلومات کا خزانہ ہوتا تھا۔ چائے کے ساتھ اس قدر چیزیں تھیں کہ فجر کھا کھا کر تھک گئی۔

"کس کی دعوت کا سامان کیا گیا ہے۔ اس قدر اعلیٰ ـ"

"پروا نہ کرو۔ اپنا ہی مال سمجھ کر کھاؤ۔ کدو کا حلوہ تو تم نے چکھا تک نہیں۔ میں نے بدست خود بنایا ہے۔"

"مگر... تم نے بتایا نہیں۔ کون آنے والا ہے۔ کس کے لیے اتنا کچھ... ضیافت کا انتظام۔"

"ہاں آکر چلے گئے۔ میری سسرال والے۔" چہک کر مطلع کیا۔

"آہا تب ہی... شادی کی تاریخ لینے آئے ہوں گے۔" فجر نے دہی بڑے کا مزا لیا۔

"شادی کی نہیں۔ ٹالنے کی۔ چار سال بعد کا جونہی

ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے چائے کا چولھا بند کیا۔"

"کیا؟ کیا؟ کیا؟... یعنی کہ..."

"یعنی کہ... منگنی گئی چولھے میں۔ رشتہ ہوا ختم۔ شکر ہے کھانے کی سب چیزیں بچ گئیں۔ ورنہ تمہیں کیا کھلاتی؟" مینو ایسی بے فکر جیسے کسی غیر کی منگنی ٹوٹنے کی خبر دے رہی ہو۔ چیزیں بچ جانے کی خوشی۔

"مجھے... آج نہیں آنا چاہیے تھا۔" فجر کو افسوس ہوا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں آنا چاہیے تھا؟" مینو ایسی معصوم نہ تھی۔ مگر بن رہی تھی۔ "تم سمجھ رہی ہو کہ مجھے کوئی غم ہو گا؟ او بھئی نہیں بلکہ میں تو آزادی کا جشن منانا چاہتی تھی۔ تمہارے آنے سے میری تمنا پوری ہو گئی۔"

مینو نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"منگنی تو میرے پیروں کی زنجیر تھی۔ اب جو وہ آئے۔ تو ان کی ایک اور طلب ساتھ کہ جی بڑی بہو کو جہیز میں گھر ملا ہے اور دولھا کو سلامی میں کار۔ لہٰذا چھوٹی بہو سے بھی وہ یہی چاہتے تھے۔ میں بے چاری چھوٹی بہو۔ کہاں سے لاتی گھر اور ابا کہاں ڈاکہ مارتے کہ کار بھی دے دیتے۔ تو ان لوگوں نے کہا۔ چار سال ہم انتظار کر لیں گے۔ تب تک آپ اتنا تو جمع کر لیں گے۔"

مینو نے گلاب جامن فجر کے منہ میں ٹھونسی۔ خود بھی کھائی۔

"میں نے انگوٹھی ان کے منہ پر ماری۔ سب ہکا بکا۔ ابا اماں اور وہ جو آئے تھے۔ سب... ہائیں ہائیں کر کے رہ گئے۔ مگر ابا نے زیادہ زور دیا ہی نہیں۔ چار سو سال بعد بھی ابا گھر اور کار نہیں بنا سکتے۔ ریٹائر بندہ۔ تین بیٹیاں۔"

"پھر اب...؟" فجر کا سانس اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ اتنا لالچ۔ چار سال میں خود بنا لو اپنا گھر۔

"اب؟" وہ شوخی سے کھلکھلائی۔ "خالہ کا بیٹا ہے ناں۔ بس جی۔ انہیں جلدی بھی ہے۔ وہ تو میری منگنی کا سن کر دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ ان کی تو خوشی بس... میں نے ابھی فون پر بتا دیا وہ آ رہی ہیں۔ دو گھنٹے میں پہنچیں گی۔ انگوٹھی لینے مارکیٹ بھی جانا ہے انہیں۔" بہت خوش تھی۔

"اور اس انگلی کو دیکھو۔ تنگ انگوٹھی نے نشان ڈال دیا۔ میری بچاری نگوڑی انگلی... چلو اسے آزادی ملی۔ اب خالہ سے کہوں گی۔ انگوٹھی نہیں۔ چوڑی پہنا دیں۔ ٹھیک ہے؟"

مینو کی خوشی۔ اس کی آرزو کی تکمیل... واہ کیا نصیب ہیں گو کہ ان کے گھر گاڑی تھی۔ مگر مینو کے والد نے بہت محنت سے گھر بنایا تھا۔ جوانی میں۔ کار بھی لے لی تھی۔ مگر لڑکے والے کس قدر ظالم ہوتے ہیں۔ مجبوریوں کے سودے۔ لڑکی والوں سے کس طرح سودا کرتے ہیں۔ اچھا ہوا۔ لالچی لوگوں سے جان چھوٹی۔

مینو اسے خود گھر چھوڑنے آئی۔ وہ باہر سے ہی واپس چلی گئی۔ گاڑی میں آئی تھی اسے لے کر۔ چھوٹے بھائی کو لے کر اور بھائی کو میچ پریکٹس کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ فجر بہت خوشگوار موڈ میں اندر آئی۔ سامنا ہو گیا لاڈلی بیگم سے۔ مسز نوید۔ میک اپ تھوپے ساڑی پہنے کہیں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ چہرے پر ازلی پھٹکار برس رہی تھی۔ گردن موڑ کر مغرور انداز میں پکاریں۔

"آ گئی ہیں۔ شہر خبراں۔ محلے بھر کی سیر سے فارغ ہو کر۔"

اماں جان کو تو کمرے سے باہر آنے میں دو چار منٹ لگے۔ نوید ماموں شاید اسی پکار کے منتظر تھے۔ لمحہ بھر میں کمرے سے نکلے۔ جھپٹ کر فجر کو بالوں سے پکڑ کر چلائے۔

"کہاں گئی تھی۔ بول۔ آوارہ۔ کدھر تھی۔ اکیلی... ہیں کہاں سے آئی ہے۔" اب وہ اس کے بالوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش میں جھٹکے پر جھٹکا دے رہے تھے۔ "بولتی کیوں نہیں؟ کیا گونگی ہو گئی ہے؟"

وہ بولتی کیسے۔ اس کے حلق سے تو چیخیں ہی نکل رہی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے اس نے نوید کی کلائی جکڑی ہوئی تھی۔ اور "چھوڑیں۔ چھوڑیں" کے سوا بس چیخیں۔

"آوارہ ذلیل کس کے ساتھ گئی تھی گلچھرے اڑانے۔"

پیچھے لاڈلی بیگم دبی زبان میں "چھوڑیں نوید۔ چھوڑ بھی دیں۔ بس کریں۔"

مگر کون سنتا جمعہ بھر سے سماعت میں جو انڈیلا جا رہا تھا۔ وہ چند منٹوں میں کیسے ختم ہو جاتا اور اماں جان بے چاری بھی گھبرا کر آئیں تو اتنی دیر میں فجر ادھ موئی ہو چکی تھی۔ ان کے زوردار دھکے بھلا نوید کو کیا محسوس ہوتے جو طوطے کی رٹ لگائے ہوتے تھے۔

"کون تھا؟ کس کے ساتھ گئی تھی رنگ رلیاں منانے؟"

لاڈلی بیگم نے ہی بزور شوہر کو نوچا۔ اماں جان کی موجودگی کا احساس ہوا تو انہوں نے فجر کو چھوڑا۔

"زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر اب گھر سے اکیلی کہیں گئی۔" دھمکی بھی دی۔

فجر جھٹکے سے لڑکھڑائی۔ اسے بھی اماں جان کی پر زور طاقت حاصل تھی۔

"جاؤں گی، ضرور جاؤں گی۔ پھر کس کے ساتھ جاؤں۔ لاڈلی بیگم کو چوکیدار رکھ دیں۔ تنخواہ دے دوں گی۔" کہہ کر اندر گھس گئی۔

نوید ماموں سٹپٹا گئے۔ اماں جان تھپڑ پہ تھپڑ مار رہی تھیں اور کیا طاقت تھی۔ اف۔

"تو ہوتا کون ہے اس کو مارنے والا۔ حق کیا ہے تیرا؟ بول میری اجازت سے جاتی ہے میری مرضی سے جاتی ہے۔ مینو کے گھر گئی تھی۔ ابھی وہ کھڑکی کے سامنے سے گزری سلام کرتی ہوئی۔ سنا۔"

"زبان دیکھی ہے؟ کیا بکواس کر کے گئی ہے۔ مار ڈالوں گا۔" بیگم کی توہین برداشت نہ تھی۔

"ٹھیک کہہ گئی ہے۔ اکیلی نہ جاتی۔ تو کیا کرتی۔ پھر چوکیداری ان سے بہتر کون کر سکتا ہے۔" اماں جان کم نہ تھیں اور بیگم کی شان میں گستاخی۔ اف۔

"آپ کی یہی حمایت اسے گستاخ بنا رہی ہے۔" بلبلا گئے۔

"آپ سن رہے ہیں۔ اماں بھی اسی کی زبان بول رہی ہیں۔" لاڈلی بیگم نے اور اکسایا۔

"ہاں ہاں اور صور پھونکو اس کے کان میں تاکہ وہ ماں کو بھی مار پیٹ کر تمہارا کلیجہ ٹھنڈا کرے۔ بھڑکاؤ اور۔ محلہ بھی تو تماشا دیکھے۔ ایسی ہی عورتیں فتنہ اٹھاتی ہیں۔ اسی کے گھر میں راج کر رہی ہو۔ اس کا ہی کھا رہی ہو۔ شرم ہوتی تو میاں کے کان میں زہر بھرنے کے بجائے۔ خود ہی پی لیتیں۔ ہائے میرا احمق بیٹا۔ دماغ سے نہیں کان سے کام لیتا ہے۔ لعنت ہے۔ جاہل بیوی مل گئی ہے۔ نمونے پیش کرتی رہتی ہے۔ بہت پچھتاؤ گے نوید۔" اماں جان ننگی تلوار بن گئیں۔

"جاہل۔ مجھے جاہل کہا۔ بلبلا گئیں۔ "اسکول کیا گھاس کاٹنے جاتی ہوں؟"

"ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کیا کرتی ہو، بتاؤ۔" اماں جان تو آج ننگی تلوار بن گئی تھیں۔

نوید کو اماں نے بٹھا کر از سر نو نصیحتیں شروع کر دیں۔ "ہاں ماموں کو حق ہے مگر مار پیٹ کا نہیں۔ تسلی سے۔ ٹھنڈے دل سے بات کرنی چاہیے۔ اپنے بچوں کو بھی اسی طرح مارو گے؟ یہ سکھایا ہے میں نے؟ کبھی ہاتھ اٹھایا تم پر یا سعید پر۔ یا کسی پر اب تم لاڈلی سے سیکھو گے جاہلانہ باتیں۔"

"اماں مگر... بدزبانی۔"

"تم نے ابھی جو شرمناک الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ انہیں کیا کہو گے؟ لاڈلی کی زبان کی مجھے پروا نہیں کہ اس کی تربیت ہی یہ ہوئی ہے۔ مگر فجر... تمہاری بچی ہے۔ اپنی بیٹی کو ایسے الفاظ کہہ سکو گے۔ لاڈلی سے توقع کر سکتی ہوں۔"

لاڈلی کہیں جانے کو تیار کھڑی تھیں مگر۔ حالات

ناموافق دیکھ کر اندر جاکر لباس تبدیل کر آئیں۔ بدرجہ مجبوری آلو پالک پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ ورنہ اماں جان۔۔۔ جو پڑتی بن ہے روٹی پکوا چکی تھیں۔ بیسن کا حلوہ خود بنا چکی تھیں۔ ان کے مزید لتے لینے سے باز نہ رہتیں۔

نوید بھی اماں سے جھاڑ کھا کر ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ کھائی کر معاملہ درست ہونے کا یقین ہو چلا تھا۔ تب اماں جان نے بے مروتی سے ان سے کہا۔

"نوید! اب تم اپنا کہیں اور انتظام کر لو۔ میں نہیں چاہوں گی کہ آج کے بعد پھر کوئی اور واقعہ ایسا ہو جائے۔ یہ گھر فجر کا ہے۔ تمہاری کسمپرسی دیکھ کر فجر نے ہی سفارش کی تو میں نے تمہیں بلا لیا۔ مگر بیٹا اب نہیں۔ میں فجر کا سامنا نہیں کر سکتی۔ تم کل رات تک ۔۔۔ جہاں سے آئے تھے۔ وہیں چلے جاؤ۔ بس۔۔۔ اب میں تمہیں نہیں رکھ سکتی۔"

لاڈلی بیگم پر پہاڑ گرا کر اماں اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

اب برتن سمیٹنا۔ کچن لے جا کر ان کو دھونا۔ یہ کام وہ اپنی نوکری کے فخر کی وجہ سے نہیں کرتی تھیں۔ یہ فجر کی ذمے داری تھی۔ اور آج فجر۔۔۔ اف۔

اور اماں جان تو جب کچن میں بے ترتیبی دیکھتیں۔ فجر کی خبر لیتیں ساتھ ہی ان کو بھی سناتیں۔

"جس گھر میں رہتی ہو۔ اس کی کبھی تو دیکھ بھال کر لیا کرو۔" یا "اس قدر پھیلاوا۔ صحن گندا۔ ارے کتا بھی بیٹھتا ہے تو دم سے جگہ صاف کر لیتا ہے۔ تم یہیں کرسی پر جمی بیٹھی ہو۔ نظر کمزور بھی نہیں ہے۔" آج تو بم گرا دیا تھا۔ میاں سے کہا۔

"اماں کو منا لو۔ کیسے رہیں گے یہاں سے جا کر وہاں ۔۔۔"

"سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ ہر وقت فجر کے خلاف بکواس کر کے مجھے غصہ دلاتی ہو۔ دیکھ لیا نتیجہ۔"

"اوہو۔ بھانجی سے اگر ماموں پوچھ گچھ کر لے تو کیا گناہ ہوتا ہے؟ میں نے تو بس ایسے ہی۔"

"میں بھی خوامخواہ غصے میں آ گیا۔ تمہارے چکر میں اپنا سارا پیسہ کھائی کر اڑا دیا۔ فجر کے گھر رہ کر اس کا احسان ماننے کے بجائے۔ اس کے خلاف سازش کرتی ہو۔ میرا بھی دماغ خراب ہے جاؤ۔"

✡ ✡ ✡

رات کو میاں بیوی کہیں چلے گئے۔ فجر دروازہ بند کر کے جو بیٹھی۔ تو پھر کھلا نہیں وہ جانتی تھیں۔ وہ روتی رہے گی اور اس کے دکھ پر نانی رو رہی تھیں۔ رات دونوں کے لیے یکساں اذیت ناک تھی۔

صبح نوید اور لاڈلی بیگم اماں جان سے معافی مانگنے آئے۔ انہوں نے بے مروتی اور بے لحاظی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

"مجھ سے معافی۔۔۔ زیادتی فجر کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس سے معافی مانگو۔" دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔

"ماموں بھانجی سے معافی مانگے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"زبان کھولتے ہوئے۔ ہاتھ اٹھاتے وقت سوچا تھا کہ بھانجی ہے؟ کبھی عقل استعمال نہ کی۔ افسوس" اتنا ظرف نہ تھا۔ کہ بھانجی کے سامنے جاتے۔

دونوں کے جانے کے بعد فجر باہر آ گئی۔ جانتی تھی اس کے کچھ کھائے پیئے بغیر اماں جان کے حلق سے کچھ نہ اترے گا۔ نوراں نے ناشتہ بنا دیا۔ دونوں ناشتہ کر چکیں تو انہوں نے فجر کے بال سہلائے۔

"بہت درد ہوا ہو گا۔" آواز بھاری ہو گئی۔

"نہیں تو مزا آ گیا۔ چلو بھگائے میں آ کر سہی۔ ماموں نے حق ادا کیا۔ یہ کم ہے؟"

"صبح دونوں آئے تھے معافی مانگ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ فجر سے معافی مانگو۔ اب شام کو آ کر۔۔۔"

"نہیں اس کی کیا ضرورت۔" بہت سنجیدہ تھی۔

"میری قسمت' آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کی تابعدار بیٹی ہوں اور رہوں گی۔ آپ وعدہ کریں۔ مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوں گی۔" لب کانپ رہے تھے۔

انہوں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔ "میری جان تم تو

میرا سکھ چین ہو۔ میرا بیش قیمت ہیرا۔"

نہ جانے اور کیا کیا کہتی رہیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور فوراً" واپس آئی۔ ایک سوٹ کیس کھینچتی ہوئی۔

"اماں جان! میں دادی کے پاس جا رہی ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں اور دعائیں دیتی رہیں۔"

اماں جان اس کے چہرے پہ پختہ عزم دیکھ چکی تھیں۔ وہ جب کچھ طے کر لیتی تھی۔ پھر مرضی کی مالک ہوتی، وہ کھڑی ہو گئیں۔ اب وہ نہیں رک سکتی۔ شاید ذلت کا احساس شدید تھا۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر دعائیں دیں۔

"اماں جان۔ میرا کمرہ بند ہے۔ چابی آپ کے پاس ہے۔ کبھی ضرورت ہو تو آپ ہی کھولیں گی۔ چابی کسی اور کو نہ دیں۔" چہرے پر تمازت سی تھی۔ غصہ بے بسی یا تاسف۔

سڑک پر رکشے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ تو آنکھیں برس رہی تھیں۔ یہ دن بھی آنا تھا، کبھی منہ دکھانے کے لائق نہ رہی۔ بے قصور۔ مگر قصوروار بن گئی۔ پتا ہی نہیں چلا کب ایک چمکتی کالی سیاہ گاڑی آن رکی۔ اندر بیٹھا نوجوان کس حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟" حیرت تاسف اور بے یقینی لہجے میں تھی۔ وہ اچھل پڑی۔ گاڑی اور اس کے مالک پر نظر پڑی۔ یک لخت چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے۔ شاید اطمینان کی سرخی۔

"نظر نہیں آرہا۔ سوٹ کیس... جا رہی ہوں دادی کے پاس۔"

"اچھا مگر کیوں، اکیلی پھر کوئی بھوت سوار ہوا ہے؟"

"اکیلی نہیں تو کیا فوجیں لے کر آتی۔ اکیلی ہوں تو اکیلی ہی جاؤں گی۔"

"اگر... ایک دن رک جاتیں۔ میں کل ہی واپس جاؤں گا۔ ساتھ چلتے۔" التجا تھی لہجے میں۔

"کیوں؟ تمہاری محتاج نہیں ہوں۔ ابھی ٹیکسی مل جائے گی۔ اسٹیشن تک کے لیے۔"

"اسٹیشن... چلو تھوڑی دیر کو مجھے ٹیکسی ڈرائیور سمجھ لو۔ آئیے بیگم صاحبہ۔" لپک کر سوٹ کیس اٹھا لیا۔ اگلا دروازہ کھول کر اشارہ کیا۔ سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر تمیز سے رکھا۔ پھر اپنی سیٹ سنبھالی۔

اسٹیشن پہنچ کر پہلی بار تسلی سے بات کی۔ "کس سے جنگ ہوئی ہے؟"

"جنگ ہاری ہے۔ بغیر مقابلہ کیے۔ اس لیے نکل آئی۔ احتجاجاً" راستے بھر بولتی تو رہی تھی۔

"اپنے نشیمن۔ اپنی پناہ گاہ سے بھی کوئی نکلتا ہے۔ ہار مان لی۔ یقین نہیں آتا۔ من مانی کا زمانہ نہیں رہا۔ پھر حماقتیں نہ کرو۔ بہت نقصان اٹھاؤ گی۔" دردمند لہجہ۔ ہمدرد انسان۔

"فتنے سے دور رہنا۔ حماقت نہیں۔ مجھے جنگ لڑنا نہیں آتا۔" آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

ٹرین آگئی تھی۔ کھڑکی کے پاس تنہا سیٹ پر بٹھا کر سوٹ کیس نیچے رکھ کر۔

اس کا سر تھپتھپا کر نیچے اتر گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ کزن بہت حساس ہے۔ سمجھ دار بھی ہے۔ گھر میں ملازمہ ملی اور... دادی۔

"اماں جان... السلام علیکم۔" لپٹ گیا۔

"چلی گئی، مجھے اکیلا کر کے چلی گئی۔" باقاعدہ آنسوؤں کی برسات تھی۔ اثر نے ان کے بازوؤں میں سر ڈال دیا۔

"اماں جان، جانے دیجیے۔ آپ کو عادت ہو جانی چاہیے۔ آنیاں، جانیاں لگی رہتی ہیں۔ آجائے گی۔" تسلی دلاسا یقین سب کچھ لہجے میں سمو دیا۔

"تمہیں...؟ پتا چل گیا۔ کس نے۔" گھبرا گئیں۔

"اس نے خود، باہر کھڑی تھی۔ میں اسٹیشن چھوڑ آیا۔ ٹرین میں بٹھا کر روانہ کیا۔ یعنی کہ..."

"اچھا روک لیتے۔ تمہارے ساتھ چلی جاتی۔"

"اچھا۔ مجھے بتائیے۔ ہوا کیا؟ محترمہ نے کچھ بتایا ہی نہیں۔" دادی پوتے کو تفصیل سنانے لگیں۔

دوپہر کو دادی کی پسند کا کھانا ہوٹل سے لے آیا۔

شام کے لیے نوید کے پسندیدہ پسندے بھی ایک دیسی ہوٹل سے پیک کروا لیے۔ کھانا کھا کر دادی کی دعائیں لے کر آرام کرنے لیٹ گیا۔ دادی کے ہی ساتھ۔ وہ اس کے سر میں انگلیاں چلاتی رہیں۔ بہت لطف آ رہا تھا۔ نیند بھی آ ہی گئی میٹھی نیند۔

پھر ناگوار سی کھٹ پٹ پر آنکھ کھل گئی۔ لاڈلی بیگم کی آمد کا نقارہ بجا تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے سامنے آ گیا۔ اور انہیں سلیوٹ کیا۔ ہنس پڑیں۔ خوشی سے دانت باہر آ گئے۔

"اوہو بھئی، میری ترقی ہو گئی ہے کیا؟ یہ سلیوٹ کس سلسلے میں۔" مذاق کی عادت تھی اثر کی۔

"زبردست معرکہ سر کیا ہے آپ نے۔ سلیوٹ تو واجب ہوا۔ بلکہ توپوں کی سلامی دینی تھی۔ مگر سردست میرے پاس اس کا انتظام نہیں۔ چلیں آئندہ کسی معرکے پر سہی۔"

"ارررے۔ بھئی ایسا کیا کر دیا میں نے کہ..... مجھے بھی خبر نہیں۔" باچھیں حد سے باہر تک چر گئیں۔ چہرہ سکڑ گیا۔ آنکھیں بچ گئیں۔

"فجر کو گھر سے نکالنے کی منصوبہ بندی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ذہن رسا کو داد نہ دوں؟ پھر زیادتی ہو گی۔ سلیوٹ تو واجب ہوا۔" تمسخرانہ مسکراہٹ اثر کے چہرے پر پھیل چکی تھی۔

انہوں نے ہونق پن سے اماں جان کی طرف جھانکا۔ وہ نیچے جھکی ہوئی اپنی چپل تلاش کر رہی تھیں۔ لاڈلی بیگم نے وہاں سے ٹل جانا مناسب سمجھا۔ تعجب نہ تھا کہ اماں کی چپل اڑتی ہوئی آئے اور عین ان کے چہرے پر ٹھک سے جا لگے۔ پچکی ہوئی ناک مزید پچکنے کی گنجائش نہ رکھتی تھی۔ اپنی ناک ٹٹولتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں جا گھسیں۔ فجر کی نانی کے رشتے کی مناسبت سے وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔

اماں جان اپنی اور مہمان پوتے کی چائے بنا لائیں۔ دونوں کیک اور چائے میں مگن باتیں کر رہے تھے۔ نوید اور لاڈلی کی بند کمرے میں زوردار جھڑپ سے چونکے۔ نوید کو آتے دیکھا نہیں تھا۔

"ہو بہو۔ وہ مجھے ہی سنا رہا ہے۔ ہر بات کا الزام مجھ پر۔ واہ جی واہ۔ پوچھیں تو جا کر بھتیجے سے اور اگر وہ مجھے عزت نہیں دے سکتے۔ ذلیل کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی۔"

"اچھا۔ اب چپ ہو جاؤ۔ باہر تک آواز جا رہی ہو گی۔" نوید دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔

"واہ کمال ہے۔ میں ہی چپ ہو جاؤں۔ سب مجھے ذلیل کیے جائیں۔ آپ نہ کچھ پوچھیں گے نہ کریں گے۔"

"تو اب اس گھر سے چلے ہی جائیں گے۔ نہ یہاں رہیں، نہ کوئی ذلیل کرے گا۔"

"واہ یہ آپ کے گھر کا اچھا انصاف ہے۔" تلملا رہی تھیں۔

"انصاف تو دنیا میں رہا ہی نہیں اماں جان۔" اندر اثر دادی سے شکوہ کر رہا تھا۔ "لوگ تو مجھے دادی کا لاڈلا کہتے ہیں۔ حالانکہ رہتا تو نانی کے ساتھ ہوں۔ مگر کوئی لاڈلا نواسا نہیں کہتا۔ افسوس۔"

دادی اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کا لاڈلا کبھی نہیں رہا۔ حالانکہ اکلوتا پوتا تھا اور چند دن پہلے والے پوتے کو دیکھا تک نہ تھا۔ مگر پیارا تھا کہ اڈپڑتا تھا۔ دراصل اثر تو نانی کے گھر رہتا تھا۔ انہیں اس کا ملال تھا۔ اور اپنی کسمپرسی کی مجبوری۔ لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی تھیں۔ البتہ ناراضی۔ خفگی شکوہ کرتی رہتی تھیں۔

جب ان کا بڑا بیٹا۔ ایک حادثے کا شکار ہوا۔ جوان بیٹے کی موت 'ناگہانی سانحہ' بہو بھانجی تھی۔ عدت کے بعد بچے کو لے کر میکے چلی گئی اور پھر اس کے والدین نے اس کی شادی بھی کر دی۔ جو اماں جان کے لیے دوسرا حادثہ تھی۔ بہو، نہ بہو رہی۔ نہ بھانجی۔

وہ اس سے خفا ہو گئیں۔ بہن کو چھوڑ دیا۔ بہو بچے کو لے کر نئے شوہر کے ساتھ دوبئی چلی گئی۔ دوبئی سے آتی۔ تو بچے کو دادی سے ملوانے لاتی۔ وہ بھانجی سے بے رخی برتنے لگیں، ساتھ ہی بچے کو بھی نظر انداز کرتیں۔ ہاں کبھی اکیلا نظر آتا تو کلیجے سے لگا لیتیں۔

آنسو بہا کر اس سے محبت کا اظہار کرتیں۔ لیکن وہ بہت چھوٹا تھا۔ ناسمجھ بچہ پھر ستم ایسا ہوا کہ انہیں کئی سال دوری سہنی پڑی۔

بھابھی کا شوہر امریکہ چلا گیا۔ کئی سال بعد آنا ہوا۔ تو پھر بھابھی اسے لائیں۔ اس کے بعد۔ انہوں نے بھابھی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ بھابھی جو کبھی بہو تھی۔ ان کے لیے غیر ہو گئی۔

پھر ان کی دعائیں قبول ہو گئیں ' پوتا۔۔ نانی کے پاس رہنے لگا۔ کیونکہ وہاں تعلیم کی نسبتاً" زیادہ سہولت تھی۔ امریکہ آنا جانا بھی لگا رہا اور نانی کے گھر سے دادی سے ملنے بھی آتا رہا۔ لیکن پیاس ' پیار کی مامتا کی پیاس نہ بجھی۔

اب چند سال سے مستقل لاہور ہی میں رہ رہا تھا۔ چھٹیوں میں دادی کا پیار وصول کرنے آتا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہنوں سے ملنے امریکہ بھی جاتا تھا۔ غرض کئی حصوں میں تقسیم شدہ.... مگر ہر کسی سے انصاف قائم رکھتا۔ حالات نے بے حد حساس اور دردمند بنا دیا تھا۔ اپنی زندگی کی اکھاڑ پچھاڑ نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا۔ بگاڑا نہیں۔ سنوار دیا۔ حد سے زیادہ ضبط ' برداشت ' امید اور یقین زندگی میں شامل ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ فہم و فراست نے بھی مزاج میں دخیل ہو کر اسے آہنی انسان کا روپ دے دیا۔ سچا کھرا اور مضبوط کردار۔

فجر اور اس کی زندگی کے حالات کافی مماثلت رکھتے تھے۔ وہ اثر کے سگے ماموں ' سگی پھوپھی کی بیٹی تھی۔ یہی رشتہ فجر کا اثر سے تھا۔ فجر کے والدین بھی اس کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کی عمر دادی کے پاس گزر رہی تھی۔ وہ بھی نانی سے ملنے کبھی تو اثر کے ساتھ ہی آجاتی تھی۔ اثر اس کے بڑے بھائی کا سا رویہ رکھتا۔ فجر کو پابندی۔ نصیحتوں کی کبھی پروا نہ رہی ' وہ اپنے دل کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اثر اسے سمجھاتا۔ "دماغ اللہ نے دیا ہے۔ اس سے بھی مشورہ کر لیا کرو۔" لیکن وہ.... فوری عمل کو ترجیح دیتی۔ ادھر ڈھائی سال سے وہ نانی کے پاس ہی آگئی تھی۔ نانی نے ہی تقاضے کر کے بلوایا تھا۔

فجر کے نانا نے وفات سے پہلے اپنی جائداد کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ دونوں بیٹوں کو ان کے شرعی حصے دینے کے بعد بیٹی کے لیے مکان چھوڑ دیا اس وصیت کے ساتھ کہ فجر ماں کی جائداد کی وارث ہو گی۔ فجر اب بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس گھر کی مالک تھی اور نانی چاہتی تھیں وہ آئے اور اپنا گھر آباد کرے۔

نوید نے اپنا حصہ شوق عاشقی میں ادھر ادھر گنوا دیا۔ سعید فیملی کے ساتھ آسٹریلیا جا بسے۔ وہاں ایک اسٹور قائم کر لیا۔ چار بیٹیوں کے بعد اب بیٹا پیدا ہوا۔

نوید نے کسی کم حیثیت گانے والی لڑکی سے عشق کا چکر چلایا۔ وہ گھر سے بھاگ آئی۔ مجبوراً" شادی کرنی پڑی۔ یہ ان کا آخری عشق تھا۔ ابھی تک تو....

فجر میں بھی برداشت کا مادہ تو تھا مگر اس کا استعمال گوارا نہ تھا اسے۔ اب اس بار نہ جانے کون سی چوٹ کھائی تھی۔ شکوہ نہ شکایت روانہ.... جسمانی چوٹوں کی تو اسے زیادہ پروا ہوتی نہ تھی۔ لیکن کہاں چوٹ لگی تھی کہ گھر سے نکل گئی۔ اثر نے سب قصہ سن کر اس کی چوٹ کو اپنے دل پر لے لیا۔ اسے بھی شدید زخم لگا تھا۔ جبڑے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے اذیت برداشت کر لی۔ اب دادی کو باتوں میں لگا رہا تھا۔ بہت فکر مند تھیں وہ نوید نے آکر خوش دلی سے بھتیجے کا حال پوچھا۔ "کدھر بھئی۔ شہزادے۔" ہاتھ ملایا۔

لاڈلی بیگم بھی منہ پھلائے باہر آئیں۔ چائے کی خالی پیالیوں پر نظر جم گئی۔

"اماں! فجر کا مزاج صحیح ہو گیا؟ چائے تو بنوائیے۔" سرسری لہجے میں بولے تھے۔

"آپ کی بیگم چائے بھی نہیں بنا سکتیں؟" اماں سے پہلے پوتا غرایا۔

"وہ تو چلی گئی۔ اپنے لیے میں نے بنالی تھی۔" اماں نے آرام سے کہا۔ لاڈلی بیگم سرخ ہو گئیں۔

نوید کو لاڈلی نے اصل کہانی سنائی نہ تھی۔ وہ حیرانی سے بولے۔ "کب کہاں۔ چلی گئی۔"

"کہیں بھی چلی گئی۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہے۔"

"اور آپ نے روکا بھی نہیں۔ یعنی کہ پھر۔ اکیلی کہیں چلی گئی اور آپ ایسے کہہ رہی ہیں۔ جیسے چھت پر گئی ہے آجائے گی۔ کب گئی اور کہاں؟"

"صبح تمہارے جانے کے بعد۔"

"ہاں... صبح کچھ، کچھ تو آپ کو بتا کر گئی ہوگی۔ دیکھا یہ حال ہے خود سری کا۔" انہوں نے اب اثر کی طرف منہ کیا۔ "بے باکی اور۔ اماں کا خیال ہے سب نے اس پر ظلم کیا۔ بتایا ہوگا اماں نے لڑکی ذات کو کنٹرول میں رکھنا چاہیے۔ زمانہ خراب ہے اور میں نے صرف بال ہی پکڑے تھے۔ اس نے ایسا واویلا کیا جیسے میں اسے قتل کر رہا ہوں۔ پوچھا نہ جائے کہ کہاں گئی تھیں۔ کس سے ملنے... میں نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ کیا برا کیا؟"

"میرا خیال ہے چچا! یہاں آپ ایک سال پہلے آئے ہیں۔ اس سے پہلے... آپ کو کسی فرض کا احساس نہ تھا۔ ماں کا نہ بھانجی کا اور وہ تو بیس سال سے اسی دنیا میں ہے۔ پہلے کسی فرض کا خیال کیوں نہ آیا آپ کو؟"

لہجے میں تندی۔ الفاظ میں برفانی تودے جیسی ٹھنڈک۔ لحہ بھر کو جم گئے۔ مگر اپنی صفائی دینی تھی، نہ جانے اماں نے کسی پیرائے میں بیان کیا ہوگا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ہوا کیا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں دیکھوں اور نہ پوچھوں۔ میں گھر آیا۔ وہ موجود نہ تھی۔ انہوں نے از سر نو واقعہ بتایا۔ لاڈلی بیگم کو گول کر گئے۔

"اور اب سن رہا ہوں کہ پھر وہ کہیں چلی گئی۔ اماں موجود۔ اسی طرح لڑکیاں گھر سے..."

"تو اب آپ کس سے جواب طلبی کریں گے؟ آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو لاڈلی بیگم سے معلومات لے لیں۔ ان کو تو خاصا تجربہ ہے۔ گھر سے بھاگنے کا۔"

لاڈلی بیگم چلانے لگیں۔ نوید گھبرا گئے۔

"تم اندر جاؤ۔" بیگم سے کہا۔ وہ بھلا کب سنتی تھیں۔ عام حالات میں بھی۔

"واہ میں کیوں اندر جاؤں سب کے تیر مجھ پر برسیں۔ میں نہ بولوں اور وہ جو شریف زادی کارنامہ انجام دے کر گئی ہیں۔ انہیں تخت پر بٹھا دیا جائے۔"

نوید کی آنکھ کا اشارہ بھی نہیں سمجھا۔ مزید گویا ہوئیں۔

"اور... وہ بدتمیزی بھی سنائیں۔ جو کہہ رہی تھیں کہ لاڈلی بیگم کو چوکیدار مقرر کردیں۔ تنخواہ وہ دے دیں گی۔" اثر کو اطلاع دی۔

"تو بالکل درست کہا۔ اس میں غلط کیا ہے؟ آپ کی اسکول کی تنخواہ سے چار گنا تنخواہ دے سکتی ہے۔ آپ کو علم تو ہوگا۔ آپ کی ایک سال کی تنخواہ سے زیادہ اس کی ماہانہ انکم ہے۔"

"تو... تو اس کا مطلب کہ کسی کو کچھ بھی سنا دے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز بھی تو آخر آ۔" کمزور لہجہ۔

"بے شک ہونا چاہیے۔ جب گھر کے بڑے اپنے وقار کا بھرم نہ رکھ سکیں۔ تو چھوٹوں کو بھی تمیز نہیں رہتی۔ آخر سیکھتے تو وہ بڑوں سے ہی ہیں۔"

"لو جی... کل ہی مک گئی۔ بری ہو گئیں ہر الزام سے اور جو۔" وہ پھر چراغ پا ہوئیں۔ میاں کی انگلی کا اشارہ نظر انداز کر دیا۔ "صبح سے غائب ہیں۔ تو کل کچھ طے کر کے ہی آئی ہوں گی بہانا مل گیا۔ اب کہہ دو۔ کہ میں نے گھر سے بھگایا ہے۔ لگا دو الزام۔ کون زبان پکڑے گا۔"

"شریفوں میں بہتان تراشی بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ پر الزام کیوں لگاؤں گا؟ آپ کو تو پہلے ہی سے یہ طریقے آتے ہیں۔" بے رحمی سے دانت پیس کر کہا۔ بھنا گئیں۔ مگر۔

"تو... پھر بھی پتا لگانا چاہیے۔ کہاں گئی گھر چھوڑ کر پولیس میں اطلاع کریں۔" میاں سے فرمائش کی۔

"کس لیے؟" اثر نے ازحد حیرت ظاہر کی۔

"یہ معلوم کرنے کہ کس کے ساتھ... یعنی کہ کوئی غلط فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔"

"میں کیوں غلط فائدہ اٹھاؤں گا اس نے کہا۔ دادی کے پاس جانا ہے۔ میں اسٹیشن لے جا کر ٹرین میں بٹھا آیا۔ پہنچ چکی ہیں محترمہ فون آگیا ہے۔ چھوٹے چچا!

آپ نے مجھے شکوہ ہے۔ آپ کی اخلاقی گراوٹ.... چند سال گھر سے باہر رہ کر اتنی بڑھ گئی ہے۔ ایک پاک باز لڑکی پر الزام لگا کر تشدد کرنے پر کیسے جی چاہا۔ آپ کو اپنے خاندانی خون پر اعتبار نہ آیا۔ اپنے خالص خون کا تو احساس کر لیتے۔ فجر نے خود آپ کو بلا کر گھر میں رکھا تھا۔ اگر آپ سے جواب طلبی نہ کی گئی۔ تو اسے آپ نے اپنا اعزاز سمجھ کر قبول کر لیا۔ افسوس۔"

پہلا فقرہ حیرت۔ اگلی بات نصیحت' تاسف نوید منمنانے لگے۔

"وہ بس لاڈلی نے اس طرح سے.... میں گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ اماں نے کہا ہے۔ میں ایک دو دن میں... گھر ملتے ہی چلا جاؤں گا۔"

"کیوں۔ آپ کی سسرال میں کیا ایک کمرہ بھی نہیں ہو گا آپ کے لیے۔ وہ ہی لوگ تو ہیں آپ۔"

"میرے ماں باپ نے میرا اور نوید کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ شادی کا فائدہ ہی کیا۔ جب لڑکی میکے میں جا پڑے۔" لاڈلی بیگم چپ رہنا جانتی نہ تھیں۔ اثر کی تلخ گوئی کی اہمیت نہ تھی۔

"ماں باپ کبھی ٹھیکہ نہیں لیتے۔ مگر آپ نے انہیں موقعہ دیا ہی نہیں۔ خود ہی نکل پڑیں۔ تعجب ہے انہوں نے پولیس سے مدد نہیں لی۔ جس طرح آئی تھیں۔ اسی طرح چلی جائیں گی تو وہ خوش ہوں گے یقین ہے مجھے۔ آپ کو وہاں جگہ مل جائے گی۔"

اثر فجر پر گزری واردات کا بدلہ لے رہا تھا۔ وہ تن فن کرتی کمرے میں گھس گئیں۔ اثر نے کہا۔

"چچا آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ اماں جان کو آپ کی۔ آپ کو اماں جان کی ضرورت ہے۔ فجر کا غصہ کم ہو گا۔ تو آجائے گی۔ آپ اپنا فرض سمجھ کر اماں جان کی خدمت کریں اور لاڈلی بیگم کو لگام دیں۔ جب تک وہ خود دوسروں کی عزت نہیں کرنا سیکھیں گی۔ کوئی ان کی عزت نہیں کرے گا۔ اپنے رشتے آپ کو نباہنے ہیں۔ ان کی سروس چھڑا دیں۔ آپ خود ان کو مناسب رقم دے دیا کریں۔ میں آپ کو.... بھیج دیا کروں گا۔"

چچا کی سمجھ میں آتو گیا۔ مگر لاڈلی کو کون سمجھائے۔ لیکن فجر کے جانے کے بعد اماں کی تنہائی کا بہانہ موجود تھا۔ جانے سے پہلے ایک بار پھر چچا کو نصیحت کی کہ وہ آنکھ بند کر کے لاڈلی بیگم پر انحصار نہ کر لیا کریں۔ ان کی وجہ سے خاندان میں آپ کی بہت بے عزتی ہو چکی ہے۔ اب عزت کو سنبھالیں۔ انہیں بھی اخلاق کا سبق دیں۔ اماں جان کی عزت اور خدمت آپ دونوں فرض سمجھ کر کریں۔ آپ کا تو حق بھی ہے فرض بھی اور آپ کو اماں جان کی دعاؤں کی بھی بہت ضرورت ہے۔ جتنا خسارہ ہو چکا۔ اب ماں کی ممتا کے سائے تلے فائدے حاصل کریں۔"

نوید اثر کی فہم و فراست کے قائل تھے ہی۔ اب بزرگانہ انداز پر بہت خوش ہو گئے۔ فائدہ

"اماں جان۔ بڑے چچا کا حال سنائیں۔" رات کو دادی کے پاس لیٹ کر باتیں شروع ہوئیں۔ "میں ان سے ملا تھا۔ بہت مصروف تھے۔ ہاں چچی کھانا بہت عمدہ بناتی ہیں بچیاں۔ بہت پیاری ہیں۔ پریاں لگتی ہیں۔"

"ارے ہاں' خوش خبری سنانا بھول گئی۔ سعید کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ یاسر نام رکھا ہے میں نے۔"

"ارے اچھا بوڑھاپے کی اولاد۔ چچا تو اس کے دادا لگتے ہوں گے۔ سفید بال ہو گئے ہیں سارے۔"

"ارے اللہ نہ کرے۔ میرا بیٹا بوڑھا کیوں ہونے لگا۔ بالوں کا کیا ہے نزلے سے سفید ہو گئے ہوں گے۔"

"اچھا پھر بوڑھا کیسا ہوتا ہے؟"

"میرے جیسا۔" اماں جان تڑپ گئی تھیں بیٹے کے بڑھاپے کا سن کر۔

اثر نے اٹھ کر ان کا چہرہ اپنی گرم ہتھیلیوں کے پیالے میں لے لیا۔ "یہ بوڑھا چہرہ تو نہیں۔ معصوم بچے کا چہرہ ہے۔"

"چل ہٹ۔" شرما گئیں۔ "ارے یہ تو بتا کوئی شادی وادی کا بھی ذکر ہے۔ یا بس۔ نکاح کافی ہے۔ میری زندگی میں تمہارا گھر بس جاتا۔ میں پھر تمہارے گھر پر ہی آپڑوں گی یاد رکھنا۔"

"زندہ باد۔ اماں جان۔ میری دلی تمنا ہے۔ میں آپ کو بھی لے جاتا۔ مگر آپ اکیلی کیسے رہیں گی۔"

"کہہ دیا ناں۔ رخصتی کرالو۔ آجاؤں کی ہائے موقع نکل گیا۔ اگر تو تم کل آجاتے۔۔۔ جیسے میرے بغیر نکاح ہوا ہے۔ میں ان سب کے بغیر رخصتی کر دیتی۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جاتے۔"

"اور اماں جان۔ وہ کیا مثل ہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا۔ مگر افسوس دیر کر دیتا ہوں میں۔"

٭ ٭ ٭

فجر کو توقع نہ تھی۔ مگر اسٹیشن پر عباد اور حماد موجود تھے۔ اثر نے انہیں اسٹیشن سے ہی فون کر دیا تھا۔ بوگی نمبر بتا دی تھی۔ سامنے ہی تھے۔ دونوں نے قد نکال لیے تھے۔ گھر پر تپاک خیر مقدم ہوا۔ عشا کی چیخ نکل گئی۔

"ہائے اپیا۔ بال۔۔۔ اتنے گھنے لمبے بالوں کا کیا حشر کر دیا۔"

"بھئی۔ آج کل یہی فیشن چل رہا ہے۔ درمیان سے تھوڑے تھوڑے نکال دیے ہیں۔ گھنے تھے نا۔ میں تو بوائے کٹ کروا رہی تھی۔ اماں جان نے اس قدر دہائیاں دیں کہ بس افوہ۔"

چچی نے شام تک بغور معائنہ کیا اور اعلان کیا۔ "فجر تو ویسی ہی ہے جیسی تھی۔ بدلی نہیں۔"

"کیا دو ڈھائی سال میں بدل جانا چاہیے تھا؟" وہ حیران ہو گئی۔

دادی کی پر شفقت آغوش ہمیشہ کی طرح محبت کی حرارت سے لبریز تھی۔ بہت بے تابی سے بہن کا حال پوچھا۔ نوید کا۔۔۔ فجر ہمیشہ ان بہنوں کی جدائی خفگی کا سبب اماں جان کو گردانتی تھی۔ جو ضدی بھی تھیں۔ صرف شکوے کو انا بنا لیا۔ شنو پھپھو کی شادی کو قبول ہی نہیں کیا۔ آخر وہ کب تک بیوگی کی زندگی گزارتیں۔ صرف اماں جان کے پوتے کی خاطر ان کے ساتھ زندگی گزارتیں۔ مگر دادی نے سرد آہ کے ساتھ کہا۔

"نہیں ضدی نہیں۔ وہ شنو کی عاشق تھی۔ بہو نہیں بیٹی کی طرح سنبھالا تھا۔ شنو کی ہر خواہش پوری کرتی تھی۔ میں جانتی ہوں۔ اسے صدمہ ہوا تھا۔ بہو نہیں بیٹی بن کر اس کے پاس رہتی اور وہ خود اس کی شادی کرتی۔ ہم لوگوں سے غلطی ہو گئی۔ اس کی بے پایاں محبت کا خیال کر کے شادی چپ چپاتے کر دی۔ پھر وہ دبئی چلی گئی۔ تو اسے شدید دکھ ہوا۔ میری بہن۔ بہت بھروسا تھا اسے شنو پر۔ بس اب میری بھی ہمت نہیں کہ جا کر اس سے معافی مانگوں ناراضی مجھ سے ہی ہے۔"

دادی غمگین تھیں۔ فجر نے انہیں لپٹا لیا اور اماں جان کے قصے سنا کر ہنسا بھی دیا۔

٭ ٭ ٭

صبح سفینہ پھوپھو کی آمد۔ غیر متوقع فجر کو چمٹ گئیں۔ پیار دلاسے' وہ جھینپ گئی۔ نانی کے گھر جانے سے پہلے پھپھو سے جو منہ ماری ہوئی۔ یاد آ گیا۔

"سوری پھپھو!"

"کس بات کے لیے؟"

"میں نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔"

"لو رات گئی بات گئی میں دل میں کینہ نہیں رکھتی۔ اور تم' تم تو میری پیاری پہلی بھتیجی ہو۔ اچھا خالہ کا حال سناؤ۔ کیسے آنے دیا تمہیں۔" وہ واقعی صاف دل تھیں۔

"بس آ گئی اور اماں جان کا پوتا ہوا ہے آسٹریلیا میں۔ بہت خوش ہیں۔ گانے گاتی پھرتی ہیں۔ اسے زچہ گیری کہتی ہیں اور کیا گانا ہے کہ بہن نیگ میں نہ تو جھومر لیتی ہے۔ نہ بھابھی کا باؤلا بھائی۔ بلکہ ایک گاؤں لے کر چل پڑتی ہے جیسے گاؤں کوئی برگر ہو۔ میں نے کہا۔ میں ماموں سے نیگ میں گاؤں مانگ لوں۔ تو خفا ہو گئیں کہا کہ پاگلوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔" سب ہنسنے لگے۔

"گاؤں کیا۔ مجھے کوئی بکری دے تو نہ لوں۔ ہاں بھئی۔ بکری کا کیا بھروسا۔ سینگ ہی مار دے۔"

چچی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس پر قہقہہ پڑا۔

"ارے لاڈلی بیگم کا حال بتاؤ۔ نوید... خوش ہیں۔" سفینہ پھپو کا شوق بھرا سوال۔

"ہاں لاڈلی بیگم بھی۔ جاب کرتی ہیں اسکول میں۔ تنخواہ ملنے سے پہلے شاپنگ کا پروگرام بنتا ہے۔"

"اچھا پڑھاتی ہیں کیا؟ تنخواہ کتنی ملتی ہے بھلا؟"

"کہتی ہیں چھ ہزار ملتے ہیں۔" فجر جواب دینے کی پابند تھی۔ دادی کی ناگواری ظاہر ہونے کے بعد بھی۔

"اے ہے۔ چپراسن ہو گی پھر۔" سفینہ پھپھو نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"مگر شاپنگ وہ پندرہ ہزار کی کر لیتی ہیں اسی تنخواہ میں۔" فجر نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"اچھا۔ جادو بھی آتا ہے؟" دادی نے پھر سفینہ پھپھو کو تنبیہاً گھورا۔

"ہاں ماموں زندہ باد۔"

"بری بات ہے بیٹا۔ کسی کی ٹوہ لینا۔ جستجو کرنا گناہ ہے۔ غیبت میں شمار ہوتا ہے۔ چھوڑو ان کے قصے۔" آخر دادی نے دخل دینا مناسب جانا۔ ورنہ۔ "اپنی نانی جان کی بات کرو۔"

"ہاں بھئی ہماری اماں کو تو بس اپنی بہن کی باتیں ہی سننی ہوں گی۔ اچھی! اچھی۔"

فجر نانی جان کی تعریف میں پوری کتاب لکھ سکتی تھی۔ بیان کرنا تو اور بھی آسان تھا شروع ہو گئی۔

"ویسے تو دن بھر بڑھاپا طاری رہتا ہے۔ ہائے ہڈی میں درد ہے۔ ارے گھٹنا رہ گیا۔ اوئی کندھے بیکار ہو گئے۔ نگوڑی انگلیاں ہیں کہ بانس کی کھپچی۔ بچی ذرا زور لگا کر دبا دے ہائے۔ کمر بھی... اور بچی کا کام یہی ہے کہ صبح سے سہ پہر تک دباتی سہلاتی رہے۔"

"ہاں تو بڑھاپا تو... خدمت کرنی چاہیے تمہیں۔ اولاد ہوتی کس لیے ہے؟"

"کرتی ہوں خدمت اور میرا کام ہی کیا ہے۔ کچن تو نوراں سنبھالتی ہے یا وہ خود۔ جوں ہی پتا چلا کہ سبزی بنی ہے۔ بیٹے کے آنے سے پہلے درد ہڈیاں بڑھاپا بھول بھال کے۔ پہنچ گئیں کچن میں۔ مرغی بھونی جا رہی ہے۔ میٹھی چٹنیاں مربے بنائے جا رہے ہیں۔ حلوہ ضرور بنے گا۔ بہانہ ماموں کا۔ خود بھی کم شوقین نہیں ہیں۔ حلوے کے بغیر... انہوں کھانا ہی کیا۔ جس کے ساتھ میٹھا نہ ہو۔"

سب ہنس رہے تھے۔ انداز بیان بہت دلچسپ تھا۔

"اچھا کرتی ہے۔" دادی پیار سے بولیں۔ "چلتی پھرتی رہے۔ کسی کی محتاج تو نہیں ہوتی۔ طاقت بھی کھانے پینے سے آتی ہے۔ اور عادت بھی ہے ساری عمر کام کرنے کی۔ خالی بھی بیٹھتی نہیں تھی۔"

"تو کچن میں گھستے ہی مجھے کیوں سناتی ہیں کہ جوان جہان مسٹنڈی نواسی کے ہوتے ہوئے مجھ ناتواں کو کفگیر چلانا پڑ رہا ہے۔ بھئی میں کیوں کروں۔ کروائیں اپنی لاڈلی بیگم سے۔"

"لاڈلی سے کیوں... ارے بابا وہی سدا کی۔ صفائی کا تو مراق ہے اسے 'جوانی سے گندگی برداشت نہیں۔ ہر کسی کا اعتبار نہیں کرتی۔ اس لیے تم سے چاہتی ہے۔ بیٹا کر دیا کرو۔ تم بھی سیکھ لو گی۔"

چچی کو ایک دم کچھ خیال آیا۔ "ارے فجر یہ اثر کتنے دن کے لیے گیا ہے وہاں؟"

اس نے نظر چرائی۔ "پتا نہیں میری تو... کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں تو باہر نکل رہی تھی۔ تو۔"

سفینہ گھر جانے لگیں تو فجر نے کہا۔ "پھوپھو اقصیٰ سے کہیے۔ یہاں آئے۔" ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

"وہ بیوٹی پارلر سے شام کو آتی ہے۔ تم ہی آ جاؤ۔ آج یا کل۔" لاپروائی سے دعوت دے ڈالی۔

ان کے جانے کے بعد چچی نے بتایا۔ "اقصیٰ بیوٹیشن کورس کر رہی ہے۔ بیوٹی پارلر کھولے گی اپنا اور ہاں اس کی بھی شادی طے ہو گئی ہے۔ حمزہ کی بھی۔"

"اچھا پھپھو نے بتایا نہیں مبارک باد دے دیتی۔"

وہ سناٹے کی زد سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا ہو گیا... دل میں کوئی کانٹا چبھا... یا کچھ عجیب ہوا۔

پھپھو اتنی بڑی خبر کیوں نہ سنا سکیں۔ یہاں وہاں کی باتیں اور اپنے گھر کی بات ۔۔۔ بے چینی دور کرنے باہر نکلی۔ لان میں عباد حماد کرکٹ کھیل رہے تھے۔ حماد نے گیند فجر کو دی۔

"آپ ہی اسے آؤٹ کرلیں۔ میں تو تھک گیا بالنگ کرکے۔"

فجر نے بے دلی سے گیند وکٹوں کی طرف دے ماری ۔ وکٹیں اڑ گئیں۔ عباد ناراض ہو کر بلا پھینک کر اندر چلا گیا۔ وہ ارے ارے کرتی رہ گئی۔

"تم نے خوامخواہ مجھے بال پکڑا دی۔ خفا ہو گیا عباد۔" "ایک تو اس گھر کے لوگ خفا بھی جلدی ہو جاتے اور منانے پر بھی نہ مانتے۔" "اب بھلا کیسے مناؤں اسے۔"

"کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ اسی لیے میں نے آپ کو بال دی تھی۔ مجھ سے آؤٹ نہیں ہو تا تھا۔ کبھی نو بال کہہ کر کبھی ایکشن صحیح نہیں کہہ کر جما ہوا تھا۔ سنچری کرنے والا تھا کہ آپ نے ننانوے پر وکٹیں اڑا دیں۔ ویسے اندر کی بات بتاؤں تھک گیا تھا۔ اس لیے خفا ہونے کا ڈھونگ رچا کر بھاگ گیا۔" حماد مطمئن تھا۔ اندر آتے ہوئے اس نے سنا۔ دادی کہہ رہی تھیں۔ سفینہ کی عقل کو کیا کہوں۔ لو بتاؤ فجر کو گھر آنے کی دعوت دے گئی۔ بیٹے کا جنون نہیں جانتی۔ اگر فجر نے جانے کا کہا تو میں ساتھ جاؤں گی۔ یا تم۔"

"اماں بی اثر کو آنے دیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔" چچی نے مشورہ دیا۔

اثر دادی سے ملنے گیا تھا۔ ابھی آیا نہیں پتا نہیں 'میرے بارے میں اماں جان سے کیا باتیں کی ہوں گی۔ اماں جان مجھے یاد تو کرتی ہوں گی۔ اور حمزہ' حمزہ سنا تھا کہیں چلا گیا ہے۔ پڑھنے۔ اب پھر۔

اقصیٰ سے فجر کی دوستی قریبی رشتے داری کے علاوہ کلاس فیلو' ہم عمر' حمزہ کا بھی یہی معاملہ تھا۔ دونوں بہن بھائی تقریباً" روز آجاتے۔ لان میں کرکٹ لاؤنج میں کیرم۔ دادی کے کمرے میں تاش۔ جس میں دادی بھی شریک ہوتیں۔ چچی کے کمرے میں ڈرامہ ہوتا۔ خوب اداکاری کے جوہر دکھائے جاتے۔ ہمیشہ حمزہ ہیرو ۔ فجر ہیروئن ہوتی حمزہ ڈرامے کا مصنف اور ہدایت کار ہوتا۔ چچی بھی ان کے ڈرامے میں کسی نہ کسی کردار میں موجود۔ فجر ڈرامے میں ہیروئن کیا بنی۔ زندگی میں بھی خود کو حقیقی ہیروئن کے کردار میں ڈھال لیا۔ حمزہ ۔۔۔ ہیرو' وہ اس کے لکھے ڈائیلاگ پر یقین کرنے لگی۔ خیالوں میں گم رہنے لگی۔ اب شاید حمزہ۔۔۔ شاید کیوں ۔ وہ اسی کے لیے تو ڈائیلاگ لکھتا ہے۔ زندگی کو آسان سمجھنے والی فجر۔ محبت کے مشکل ادوار میں پھنس گئی۔ حمزہ یقیناً" اسے پسند کرتا ہے۔ آخر اسے ہی ہیروئن بناتا ہے۔ چونکہ ڈرامہ کچھ مزاحیہ سا ہوتا۔ کسی کو اعتراض بھی نہ ہوتا۔ چچی نے تو ایک بار کہا بھی۔

"ہم تو ایک ہی ہیروئن' ایک ہی ہیرو کو دیکھ دیکھ کر تھک گئے بھئی۔"

"تو کیا کریں۔" حمزہ نے فوراً" کہا۔ "آپ کو ہیروئن بنا سکتا ہوں نہ اقصیٰ کو' ہماری مختصر انڈسٹری ہے اور ہیرو تو دوسرا کوئی ہے بھی نہیں مجبوری۔"

"مجھے بھی ہیروئن کا رول دو تو سہی۔" چچی نے حسرت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

"ماموں جان سے ماردیں گے۔"

"تو ہیرو ان ہی کو بتانا۔ میں کب تم جیسے مسخرے کو ہیرو سمجھتی ہوں۔"

پھر اثر مستقل رہنے آگیا۔ اسے ولن کا کردار دے دیا جاتا۔ جو ہیرو ہیروئن کے درمیان آجاتا اور ہیرو کی پٹائی کرتا۔ پھر ہیرو اسے پچھاڑ دیتا۔ ولن زمین پر گرا ہیرو سے معافی مانگتا۔ تالیاں بجائی جاتیں۔ ڈرامہ ختم۔

فجر کو حسرت رہی کہ کبھی تو ڈرامہ شادی کے مناظر پر ختم ہو۔ شاید حمزہ ڈرتا تھا کہ اعتراض نہ ہو جائے۔ تو وہ اسے پسند تو کرتا ہے۔ پھپھو سے کہے دادی سے کہے۔

مگر پھر ڈرامے ختم ہو گئے۔ سب پڑھائیوں میں جت گئے۔ اقصیٰ حمزہ کبھی چھٹی کے دن آتے۔ حماد عباد کے ساتھ کرکٹ ہوتا اقصیٰ فجر فیلڈنگ کرتیں۔ کبھی فجر وکٹ کیپر اقصیٰ امپائر ہوتی۔ کبھی حمزہ اور اثر یہ عہدہ سنبھالتے۔ آخر میں میچ لڑائی جھگڑے پر ختم ہوتا

فجر کی بالنگ سے سب تنگ ہوتے۔ جو نہ تو بال مانتی۔ نہ کیچ۔ اس کی بال پتھر کی طرح سیدھی وکٹوں میں جا لگتی۔ یا کسی کے سر پر پھر۔

کیرم میں حمزہ سب کو ہرا دیتا۔ اقصیٰ چیختی بے ایمانی ہاتھ سے کوئن جال میں ڈالی ہے۔ چلو سب کو آئس کریم کھلانے چلتے ہیں۔ تم لوگوں کے ہارنے کی خوشی میں۔ اثر اور حمزہ چندہ کر کے سب کو آئس کریم کھلاتے۔ پھر ایسا ہوا کہ اثر دن بہ دن سنجیدہ ہو گیا۔ الگ تھلگ رہنے لگا۔

"بی اماں کہتی ہیں مجھے پڑھ لکھ کر کچھ بن کر دکھانا ہے۔ یہ میرے بابا جان کی خواہش تھی۔ اور امی بھی.... یہی چاہتی ہیں۔" اس نے اقصیٰ سے بہانہ کیا۔

اقصیٰ اثر کو ہر کھیل میں شریک کرنا چاہتی مگر وہ پڑھتا رہتا۔ لان میں پڑھ رہا ہوتا۔ تو ان لوگوں کو دیکھ کر کمرے میں چلا جاتا۔ لیکن اس کا رزلٹ بھی بہت زبردست آیا۔ اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔

حمزہ فیل ہو گیا۔ مگر اسے فکر نہ تھی۔ وہ ہر حال میں خوش مگن تھا۔ اب تو اس کی لڑکیوں سے دوستی کی خبریں بھی آنے لگیں۔ فجر کو یقین تھا کہ لاکھ وہ کسی سے دوستی کر لے۔ محبت فجر سے ہی کرتا ہے۔ اور سفینہ پھپو بھی اس کو ہی بہو بنائیں گی۔

اثر کی امی اس کی کامیابی کا سن کر آ گئیں۔ بہت ہی نفیس خاتون تھیں۔ فجر کو اس طرح لپٹا کر پیار کرتیں۔ جیسے وہ ان ہی کی بیٹی ہو۔ چچی نے ایک بار کہہ بھی دیا۔ تو ہنسنے لگیں۔

"تو تم کو شک ہے کیا؟ میری بیٹی ہی ہے۔ بلکہ اولاد سے بڑھ کر۔ میری عزیز ترین دوست۔ سب سے پیارے بھائی کی بیٹی۔"

فجر کو اماں جان کا خیال آجاتا۔ جو ان سے اسی لیے خفا تھیں کہ وہ کسی غیر کی بیوی بن کر چلی گئیں۔ جبکہ اماں جان انہیں اپنی بیٹی سمجھتی تھیں۔ بے چاری اماں جان اور بے چاری شنو پھپو۔

یہاں تو ان کی آمد پر خوب خوشی منائی جا رہی تھی۔ اثر کی شاندار کامیابی اور اسے بہترین جاب بھی مل گئی۔ پھر امریکہ سے آنے والی شنو پھپو۔ دعوتیں۔ فجر تو امتحان کے بعد کی نیندیں پوری کر رہی تھی۔

اقصیٰ بھی ایک بار شنو پھپو سے ملنے کے بعد دوبارہ نہیں آئی۔ سنا کہ وہ اپنی ددھیال گئی ہوئی ہے پشاور۔ حمزہ بھی ساتھ تھا۔ فجر نے اماں جان کو فون کر کے شنو پھپو کا بتایا۔ اثر کی کامیابی کی تو خبر انہیں مل چکی تھی۔ اثر نے ہی انہیں بتایا تھا۔ شنو پھپو کا فجر نے بتایا۔ چپ ہو گئیں۔ سرد آہ بھر کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔

✡ ✡ ✡

چچی دبے قدموں اس کے پاس آئیں۔ "سنو فجر۔ تمہارے نصیب جاگ گئے۔ تم سے اماں پوچھیں گی۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ خبردار' انکار نہ کرنا۔ غلطی سے بھی نہیں۔"

جیسے آئی تھیں ویسے ہی چلی گئیں۔ بے آواز وہ انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ عشا نے کاپی پر سے سر اٹھا کر کہا۔

"اپیا! امی آپ کی شادی کا کہہ رہی ہیں۔ میں نے دادی سے سنا تھا۔ کچھ آپ کا ہی ذکر تھا۔"

شادی۔ وہ سٹپٹا گئی۔ کیا؟ واقعی میرے نصیب جاگ گئے۔ ہاہ حمزہ اور اس کا وہ محل نما بنگلہ۔ یہاں سے وہاں تک۔ اور بڑے بڑے شاندار کمرے۔ سجے سجائے' قیمتی قالین۔ خوب صورت پردوں والے۔ ہزاروں ڈیکوریشن کی اشیا اور نوکروں کی قطار۔ یہ ہوئی نا بات۔ کیا حمزہ نے پھپھو سے کہا۔ یا داوی سے۔

"ہائے اللہ.... کتنے ٹھاٹھ باٹ سے رہتی ہیں سفینہ پھپو۔ جب دیکھو دوبئی۔ انگلینڈ چلی جاتی ہیں شاپنگ کے لیے۔ پھوپھا جان کے پاس تین گاڑیاں ہیں۔ ایک حمزہ کی ایک پھپو کی۔ جب جی چاہا کہیں بھی چلی گئیں۔ اقصیٰ کے پاس ایک الماری جوتے سینڈلوں سے بھری ہوئی ہے۔ کپڑوں کا تو حساب نہیں۔ ایک دفعہ کے بعد دوسری دفعہ پہنتے نہیں دیکھا کوئی سوٹ' چاہے کتنا ہی قیمتی ہو اور حمزہ کی ڈریسنگ.... اف ڈریسنگ تو اثر کی بھی

لاجواب ہوتی ہے مگر حمزہ کا مقابلہ۔ ایک بار اقصیٰ نے اثر کو توجہ دلائی۔

"امریکہ سے آئے ہو۔ امریکہ میں پڑھا ہے۔ مگر ڈریسنگ پاکستانی۔۔۔ حمزہ کو دیکھو۔"

اثر مسکرایا تھا۔ "میرا باپ ہوتا۔ تب بھی میں پاکستانی ڈریسنگ کرتا۔ یوں میں ایک غریب ملک کا شہری ہوں۔ جس کا بال بال قرض میں گروی ہے۔"

"ہائے اللہ۔ تم نے اتنا قرض کیوں لیا۔ ڈیڈی سے مانگ لیتے۔" اقصیٰ بہت ہمدرد تھی۔

"میں نے قرض نہیں لیا۔ حکومت نے عوام کو بیرونی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس حساب سے ہمیں اپنی اوقات میں رہ کر سادہ زندگی گزارنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

"تو حمزہ بھی تو اسی ملک کا۔۔۔ بلکہ میں بھی مگر ہم تو پرواہ نہیں کرتے۔ امی منع بھی نہیں کرتیں۔"

اثر مسکرا دیا۔ "شاید میری امی بھی منع نہ کرتیں۔ اگر یہاں ہوتیں یا میرے والد ہوتے۔۔۔ لیکن اپنا ضمیر اور احساس زندہ ہونا چاہیے۔ کسی کے منع کرنے کا انتظار نہیں ہونا چاہیے۔"

بات سمجھ میں نہیں آئی مگر فجر کو اس جواب سے خوشی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی غیر ضروری اشیا کے خلاف تھی۔ یا پھر اس لیے کہ خود اس کے پاس محدود تعداد میں اشیائے ضروریہ ہوتی تھیں۔

دادی فضول خرچی اور اصراف کے خلاف تھیں۔ گو کہ اس کے مرحوم باپ کی چند دکانوں کا کرایہ اتنا ہوتا تھا کہ وہ بھی ہر شوق کی چیز خرید سکتی تھی۔ مگر دادی 'نانی کی طرف سے پابندیوں کا سلسلہ۔

"یہ رقم تمہاری تعلیم اور شادی کے اخراجات کے لیے جمع ہو رہی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے لیے نہیں ہے۔"

اسے جو محدود رقم ملتی تھی۔ وہ زیادہ تر غریبوں 'ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ اس کا دل چاہتا کوئی غریب نہ رہے۔ اپنی ساری رقم دے دلا کر لوگوں میں غربت کے احساس کو ختم کر دے۔ وہ اقصیٰ کے سامنے اپنے کپڑے، جوتے مانگنے والی کو دیتی تو وہ اس کے چٹکیاں کاٹتی۔ چپکے چپکے کہتی۔ "تمہارے پاس بھی کون سے سینکڑوں جوڑے ہیں۔ اسے دیکھو خاصے ٹھیک ٹھاک کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ان لوگوں کو مانگنے کی عادت ہوتی ہے۔ تم جیسے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے۔ دیکھنا بیچ دے گی۔"

فجر کو حیرت ہوتی۔ پھر یہ اطمینان کہ بیچ کر اپنی کوئی ضرورت ہی پوری کر لے گی بے چاری۔ اور ویسے جو رقم اسے ملتی تھی۔ وہ ہر ماہ اس سے دگنی کسی نہ کسی بہانے لے کر خرچ کر دیتی تھی۔ دادی پابندی سے زکوۃ بھی ادا کرتی تھیں۔ اور اس کے جہیز کے لیے بھی کچھ نہ کچھ منگا کر رکھتی تھیں۔ اسے دادی کی حرکتیں خاصی پراسرار لگا کرتیں۔ جو ایک بڑی سی پیٹی میں کچھ چیزیں فجر سے چھپا کر رکھتیں۔ مگر اسے سن گن مل جاتی۔ جیسے عشا نے بتایا کہ اس کی شادی کا سلسلہ چل رہا ہے۔

اور پھر دادی نے اسے بلا لیا۔ اور لمبی تمہید۔ جذباتی تقریر سے ملتی جلتی اس کے گوش گزار کی۔ اپنے خوابوں کی تعبیر۔ اپنے مرحوم بیٹے بہو کی آرزو۔ اپنی زندگی سے مایوسی۔ فجر سے اطاعت کی امید۔

"تم جانتی ہو۔ میری ذمے داری اب صرف تمہارا مستقبل روشن دیکھنا ہے۔ بہت فکر رہتی ہے مجھے۔"

ہاں یہ تو درست تھا وہ واقعی اس کو بے پناہ چاہتی تھیں۔ باقی سب سے بڑھ کر متفکر رہتی تھیں۔

"کیوں فکر کرتی ہیں میری۔ میں تو خوش ہوں۔ مزے میں۔ آپ جو ہیں میرے پاس۔" وہ ان سے لپٹی۔

"بیٹا۔ تم میری سب سے پیاری اولاد ہو۔ سب سے پیارے بیٹے کی بیٹی۔ وہ آج زندہ ہوتا تو میرے فیصلے سے خوش ہوتا۔ شنو کو امریکہ جانے کی جلدی ہے' اس کی بچیاں وہاں بے چین ہیں۔ تمہاری بہتر زندگی اور مضبوط روشن مستقبل کے لیے میں تمہارا اقرار چاہتی ہوں۔ میری فکروں کا خاتمہ اسی طرح ہو گا۔ اپنے اطمینان کے لیے پوچھ رہی ہوں۔ جلدی اس

لیے ہے۔ کہ شنو چلی جائے گی۔ تمہیں جتنا پڑھنا ہو۔ پڑھتی رہنا۔ ابھی صرف نکاح ہو جائے۔ باقی رسمیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ بس میرے دل کو چین مل جائے گا۔ مجھے تمہاری محبت اور فرماں برداری پر فخر ہے۔ لیکن شرعاً" بھی لڑکی سے اجازت درکار ہوتی ہے۔"

وہ ان کے بازوؤں میں سر گھسا کر بیٹھی رہی۔ کیا بولے۔ کیا کہے۔ وہ پھر گویا ہوئیں۔

"تم بتاؤ۔ کیا میں اپنی مرضی اور اختیار کو کام میں لا کر جو تمہارے لیے فیصلہ کروں گی۔ تمہیں منظور ہو گا۔ مجھ پر بھروسا ہے تم کو؟ کہ میں نے کبھی تمہارے بارے میں غلط فیصلہ نہیں کیا تعلیم تربیت ہر قدم ہر جگہ صرف تمہاری بہتری دیکھی اور سچ بات تو یہ کہ تم نے کبھی رخنہ بھی نہیں ڈالا کبھی انکار نہیں کیا۔" ان کا انتظار کرنا اچھا نہیں لگا۔ بول پڑی۔

"پھر اب کیوں مجھ سے جواب مانگ رہی ہیں۔ مجھے اپنے اچھے برے کا کیا پتا۔ آپ سے بہتر کون بھلائی کر سکتا ہے میری' ہیں ناں دادی جان۔"

وہ انہیں بی اماں کہتی تھی۔ بلکہ سب بچے اثر اقصیٰ حمزہ سمیت بی اماں کہتے تھے' اس وقت اس نے شرارت میں انہیں دادی جان کہہ دیا۔ وہ جو اپنی جذباتی تقریر کے نتیجے میں خود ہی آنسو بہانے لگی تھیں۔ اس کے دادی جان کہنے پر ہنس پڑیں۔ سر پر چپت رسید کیا۔

"آپ ہی میری ماں باپ ہیں دادا اور سب کچھ ہیں۔ کبھی میں نے آپ کو نانی کہا؟"

وہ اسے گلے لگا کر بولیں۔ "تمہاری نانی بھی مجھ سے زیادہ خوش ہوں گی۔ ان کی تو پرانی تمنا تھی۔ ان کو اپنے پوتے سے بڑھ کر تمہارے لیے اور کون ہو گا۔ لاکھ وہ شنو سے ناراض ہوں۔ اثر اور تم سے زیادہ اور کون پیارا ہو سکتا ہے۔ بس یہی سوچ کر۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم کو اس گھر کے سوا کہیں سے وہ خوشی نہیں ملے گی۔ شنو تمہاری عاشق زار۔ اثر بھی تمہیں پسند کرتا ہے اور میری دلی تمنا بھی یہی ہے۔ تم دونوں کے حالات زندگی بھی ایک جیسے ہیں۔ احساسات بھی۔ بس بیٹا۔ اللہ تم دونوں کو بہت خوشیاں دے۔ میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔"

فجر تو برف کے سمندر میں جمی رہ گئی۔ اثر۔۔۔۔ یہ کیا ہوا؟ تو۔۔۔۔ حمزہ نے کچھ کہا ہی نہیں۔ سفینہ پھپو سے۔ نہ بی اماں سے۔ کبھی بھی۔۔۔۔ دادی تو اس کا صدقہ اتار رہی تھیں۔ خوشی اور سکون اطمینان ان کے روئیں روئیں میں سما گیا تھا۔ اس قدر مسرور تھیں ہنس رہی تھیں فجر کا منہ چوم رہی تھیں۔

پھر شنو پھپو اپنی ہی خوشی کا اظہار کرتی آئیں۔ کبھی روتی کبھی ہنستی تھیں۔ اسے لپٹائے نہ جانے کیا بول رہی تھیں۔

سفینہ پھپو بھی خوشی کے اظہار میں کم نہ تھیں۔ اس کا مطلب کہ وہ بھی اس رشتے پر راضی ہیں۔ چچا چچی سب خوش تھے۔ عشا ندا نے گانے گائے۔ حماد عباد ڈانس کرنے لگے۔

وہ تو یوں گم صم تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ آخر اسے کیوں یہ توقع تھی کہ حمزہ۔۔۔ اس سے شادی کرلے گا۔ کیوں؟ کبھی اس نے اپنی پسند ظاہر نہیں کی۔ صرف ڈراموں میں ہیروئن کا اعزاز بخشا اور وہ سمجھ بیٹھی کہ۔۔۔۔ وہ زندگی کا سفر فجر کے ہمراہ لیکن "کوئی جوڑ بھی تو ہو۔" یہ الفاظ اس نے چچی سے سنے۔ وہ چچا کو بتا رہی تھیں۔

"انہوں نے سفینہ پھپو سے کہا۔

"آپا! حمزہ اثر سے بڑا ہے۔ آپ چاہتیں تو۔۔۔۔ فجر آپ کی بہو ہوتی۔"

سفینہ آپا نے کہا۔ "حمزہ تو رشتے داروں میں شادی کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ۔ کوئی جوڑ بھی تو ہو۔ اس کی ددھیال میں ایک سے بڑھ کر ایک امیر اور حسین لڑکیاں موجود ہیں۔ سب کی خواہش بھی ہے۔ لیکن میں آپس میں بدمزگی نہیں چاہتی اور حمزہ رشتے داروں کو پسند نہیں کرتا۔ بہت اوپر نظر ہے اس کی۔"

سنا آپ نے بھانجے کی اونچی نظر۔ تعلیم میں پھسڈی نخروں میں اول۔ باپ کی دولت پر عیش کرنے والا۔ اثر کو دیکھو۔ یتیم بچے نے کیسی جدوجہد کی۔ آج اتنی

اچھی جاب۔ ماشاء اللہ اور کتنا نفیس۔"

نہ جانے وہ کیا بولے جا رہی تھیں فجر تو ایک جملے سے ہی زخمی ہو گئی تھی۔ واقعی جوڑ تو نہ تھا۔ کہاں وہ سرمایہ دار اور کہاں ایک یتیم لڑکی۔ رات بھر وہ اپنے زخموں پر تسلی کے مرہم رکھتی رہی۔ دادی کی فرماں برداری۔ اطاعت۔ انہوں نے حالات زندگی یکساں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔

صبح ہوتے ہی دادی کی گھبراہٹ شروع ہوئی۔ انتظامات میں دخل۔ کھانے کی اقسام پر اعتراض بلکہ ہر بات اعتراض پر ختم ہوتی۔ دوپہر میں انہوں نے شنو کو بلا کر پاس بٹھایا۔

"لو بیوی! تمہارے اصرار پر میں نے ساہیوال فون کیا۔ بہن کو بتایا کہ ان کے پوتے سے میں اپنی پوتی کا رشتہ کر رہی ہوں۔ آج شام کو نکاح کی تقریب ہے۔ لو بی۔ وہ تو جھاڑ کے کانٹے کی طرح الجھ گئیں۔ بولیں۔ میرے پوتے کا نکاح۔ میری مرضی اور رائے لیے بغیر کس نے طے کیا۔ وہ لاوارث نہیں ہے کہ وہیں کے وہیں سب کچھ ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "بہن تمہاری مرضی نہیں ہے تو یہ رشتہ ختم کر دوں۔ ابھی نکاح ہوا نہیں ہے۔" تو خفا ہوئیں۔ کہ میں تمہارے باندھے بندھن کو کیوں توڑ رہی ہوں۔ میرے پوتے کی بارات میرے گھر سے جائے گی۔ اسے یہاں بھیجو۔ میں اس کو دولھا بنا کر روانہ کروں گی۔" میں نے کہا۔ بھئی تم یہاں آ کر بھی یہ کر سکتی ہو۔ تو بولیں۔ "میرا اپنا گھر موجود ہے۔ میرا پوتا میرے گھر سے بارات لے جائے گا۔" اور میں نے پوچھا بارات میں کون کون کتنے لوگ ہوں گے تو بولیں۔ "یہاں کون ہے۔ وہی جائے گا۔ میں تو سفر کر نہیں سکتی۔ لو سنو اکیلا لڑکا۔ دادی کے گھر سے دولہا بن کر آئے گا۔ اب بولو۔"

چچی بھی آگئیں۔ سب سن کر متفکر ہوئیں۔ "اماں آپ نے بھی عین وقت کے وقت انہیں اطلاع دی۔"

شنو پھپو پریشان ہو گئیں۔ چچی نے کہا۔ "اکیلا کیوں۔ نوید بھی تو ہیں۔ وہ دو چار لوگ اور جمع کر لیں گے۔"

"ارے نوید نے تو کسی گانے والی لڑکی سے پوشیدہ شادی کر لی ہے۔ اسے گھر میں گھسنے کی اجازت کب دی ماں نے۔ خیر' وہ ایسے ہی پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ خوش تو ہو گئی۔ آواز سے پتا چل رہا تھا۔ تم اثر سے کہو فون کرے اور اجازت لے باقاعدہ۔ پھر نکاح کی اجازت دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اثر اور فجر سے بھی ناراض ہو جائے۔"

چچا چچی ان کے چاروں بچے شام کی تقریب کی تیاریوں میں زور و شور سے حصہ لے رہے تھے۔ دادی پر جوش تھیں۔ فجر سناٹے کے عالم میں۔ وہ اقصیٰ کی منتظر تھی۔ شام ہو گئی۔ اقصیٰ نہیں آئی۔ پشاور سے نہیں آئی کیا؟

سفینہ پھپو آگئیں اور فجر کا میک اپ کرنے لگیں۔ فجر نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا۔

"شنو کی خوشی ہے۔ تصویریں بنیں گی۔ وہ امریکہ جا کر دکھائے گی۔ سوٹ بھی لائی ہے۔"

شنو پھپو آگئیں۔ انہوں نے بھی وضاحت کی کہ "امریکہ میں دونوں بہنیں بھائی کی شادی کی اور بھابھی کو دیکھنے کی تمنائی ہیں۔ ان کی خوشی کے لیے باقاعدہ دلہن بنانا مجبوری ہے۔"

شنو پھپو کی بیٹیاں بچپن میں ایک بار آئی تھیں۔ بہت الگ الگ رہتی تھیں۔ اثر سے ہی مخاطب ہوتی تھیں۔ اب بڑی ہو گئی ہوں گی۔ فجر تو کمرے میں ہی بیٹھ رہی۔ مگر باہر صحن میں کافی لوگوں کا مجمع تھا۔ گانا بھی ہو رہا تھا اور قہقہے لگ رہے تھے۔

پھر نکاح کا وقت آگیا۔ چچا' پھوپھا جان اور ایک اور رشتے دار ایجاب و قبول کے لیے اندر آئے تھے۔ رجسٹر پر دستخط کے بعد فجر کی حیثیت بدل گئی۔ اب وہ بیوی ہو گئی تھی۔ بہو بن گئی۔ بھابھی کہلائے گی۔ سب خواتین اس سے لپٹ کر مبارک باد دینے لگیں۔ آنسو بھی بہائے گئے۔ خوشی بھی منائی گئی۔ مبارک بادی گائی گئی۔ اقصیٰ نہیں آئی۔

کچھ ایسا ہنگامہ رہا کہ وہ پوچھ نہ سکی کسی سے بھی

"اقصیٰ حمزہ کیوں نہیں آئے۔"

پھر اثر اندر آیا۔ سلام کرنے۔ فجر کے پاس بٹھا کر اس کی تصویریں لی گئیں۔ خاصی گھماگھمی رہی فجر نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں کہ دولہا کیسا لگ رہا ہے۔ کسی خاص روپ میں یا عام۔۔۔ دادی کے ساتھ بھی ان کی تصویریں لی گئیں۔ سب سے زیادہ دادی ہی خوش تھیں۔

رات گئے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ اس نے بھی لباس تبدیل کیا۔ شنو پھپو بار بار آ کر اس کو لپٹا کر پیار کرتی رہیں۔ سب اس قدر خوش تھے کیوں؟ فجر کی خوش قسمتی پر۔ یا اثر کی خوش نصیبی پر۔ فجر کو بھی کیا خوش ہونا چاہیے؟ فیصلہ نہ کر سکی۔ اثر کی کوئی خوبی یا خاص بات۔۔۔ یاد کرنے پر بھی کچھ یاد نہ آئی۔ خصوصی طور پر کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ورنہ سب تعریفیں تو کرتے تھے۔ باپ کی شفقت کو ترسا ہوا یتیم لڑکا۔ ماں بھی اس کی کئی حصوں میں بٹی ہوئی۔ کوئی تربیت کرنے والا نہیں۔ اس کے باوجود۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ کوشش۔ محنت۔ جدوجہد کی اور سب کی دعائیں۔ اسے صلہ بھی ملا۔ عزت کی نوکری اور اب۔۔۔ ایک بہترین لڑکی کا ساتھ۔

اثر کے چہرے پر خوشیوں کا عکس بھرپور جھلک رہا تھا۔ آنے والی خوش رنگ۔ حسین زندگی کی توقعات۔ امید اور یقین کے ساتھ۔ اور فجر۔۔۔ اگلے دن وہ حسب عادت ادھر ادھر پھرتی نظر آ رہی تھی۔ کسی بھی جذبے کے اظہار سے خالی۔ اثر کا سامنا ہونے کے بعد بھی۔ وہ نارمل نظر آ رہی تھی۔ اثر اپنی بہنوں کے لیے کچھ تحائف لایا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ تعریف بھی کر رہی تھی۔ شاید اسے ابھی تک اس رشتے کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

سفینہ نے شنو کی الوداعی دعوت اور بھانجے بھتیجی کے نکاح کی خوشی میں سب کی دعوت کی۔ شنو پھپو تو فجر کو بہو کے روپ میں بنا سنوار کر لے جانا چاہتی تھیں

لیکن وہ سادگی سے تیار ہوئی سفینہ پھپو کے اصرار پر دادی شنو اور فجر اثر کے ساتھ پہلے آ گئیں۔ چچی نے چچا کے ہمراہ رات کو آنا تھا۔ سفینہ پھپو کی وسیع و عریض کوٹھی حسب معمول قیمتی سامان آرائش سے سجی ہوئی تھی۔ شاندار ہال نما ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا گیا۔ فجر کو اثر کے ساتھ بیٹھنے سے گھبراہٹ ہوئی۔ وہ اقصیٰ سے ملنے کا کہہ کر اوپر آ گئی۔ اقصیٰ کمرے میں موجود تھی۔ تعجب۔ وہ سب سے ملنے نیچے نہیں آئی تھی۔ فجر بے تکلفی سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اقصیٰ لیٹی تھی۔ لیٹی رہی۔

"تم یہاں ہو۔ میں تمہیں نیچے تلاش کرتی رہی۔ تم بیمار ہو؟ کسی نے بتایا ہی نہیں۔ کیا ہوا ہے؟"

اقصیٰ کے چہرے پر زردی کنڈلی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کون بتاتا؟" تیز لہجے میں "تم نے جو تماشا وہاں لگایا ہوا تھا۔ سب اسی میں مصروف تھے۔ میری پروا تھی ہی کس کو؟"

"تماشا؟ میں نے؟" فجر بوکھلا گئی۔ وہ تو شکوہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر اقصیٰ۔۔۔

"ہاں تم نے۔" اقصیٰ حلق کے بل چلائی۔ "فجر! میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کہ تم، تم میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کرو گی۔ میں اثر سے محبت کرتی رہی اور تم اسے لے اڑیں۔ تم سے بڑی ایکٹریس شاید ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ میں تمہیں اپنی دوست سمجھتی رہی اور تم۔ میرا کلیجہ نوچ کر ہی کھا گئیں۔ کب سے چکر چل رہا تھا تمہارا بولو۔"

وہ اب بلند آواز میں چیخ رہی تھی۔ فجر مارے حیرت کی زیادتی کے دم بخود اسے دیکھ رہی تھی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"وہ میرا ہے۔ میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ تم۔۔۔ ہونہہ تم اسے کیا دو گی؟ نہ تمہارا باپ زندہ ہے نہ ماں کون ہے تمہارا؟ اپنی اماں نہ ہوتیں تو تم۔۔۔ سڑک پر کھڑی بھیک مانگ رہی ہوتیں۔ کیا اوقات ہے تمہاری۔ تم نے اثر کو۔۔۔ اپنی چالاکی سے۔۔۔ کمینی ہو

تم۔"

"اقصیٰ، اقصیٰ پلیز تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ تم.... مذاق تو۔"

یک لخت اسے خیال آیا۔ اقصیٰ مذاق کر رہی ہے۔ ڈرامہ، ایکٹنگ۔ ایک ڈرامے کے ہی بابا اس سے ملتے جلتے ڈائیلاگ تھے۔ ابھی وہ ہنس پڑے گی۔ مگر اقصیٰ کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کا پورا جسم جیسے نفرت کی آگ میں دہک رہا تھا۔

"مذاق۔ ہاں۔ یہ مذاق تم نے میرے ساتھ کیا۔ مجھے بے وقوف بنایا۔ ادھر میرے بھائی پر ڈورے ڈال رہی تھیں۔ ادھر اثر کو قابو کر لیا۔ ذلیل۔ منحوس۔ کھا گئی ماں باپ کو۔ اور اب مجھے.... ادھر میں پشاور گئی۔ ادھر تجھے موقعہ مل گیا۔ میرے گھر آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

اس کی چیخوں کی آواز سن کر سفینہ پھپو گھبرائی ہوئی آگئیں۔ اقصیٰ اب کھڑی ہو کر فجر کو دھکے دے رہی تھی۔

"مجھے اپنی فتح کی خبر دینے آئی تھی نا۔ میں تھوکتی بھی نہیں تجھ پر، تیری جیسی میرے تلوے چاٹتی ہیں۔ میری نوکر ہیں اور تو۔"

وہ فجر کو دھکے دے رہی تھی سفینہ پھپو اسے روک رہی تھیں۔ مگر وہ ان کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔

"دشمن ہے یہ میری۔ مار ڈالوں گی...."

سفینہ نے فجر کو اشارے سے نیچے جانے کا کہا۔

"اقصیٰ چپ رہو۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو خود کو۔ اپنی نہیں تو میری عزت کا خیال کر لو۔"

وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ سنبھال رہی تھیں۔ فجر کانپ رہی تھی۔ غم۔ ذلت۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ تو دیکھا۔ وہاں.... شنو پھپو حیران پریشان کھڑی تھیں۔ وہ بھی شاید سفینہ پھپو کے ساتھ اوپر آئی تھیں۔ فجر لرزتی کانپتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ہر قدم جیسے من بھر کا تھا۔ بمشکل نیچے آئی مگر.... ایک تپائی پر گیلری میں ہی بیٹھ گئی۔

اثر اندر سے نکلا۔ اس کے پاس آکر اس نے پوچھا۔ "تم اوپر گئی تھیں۔ کیا ہو رہا ہے وہاں۔"

اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ جو فجر سن نہ سکی۔ اوپر سے اب بھی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ تیزی سے اوپر چلا گیا۔

فجر حیران بیٹھی رہی۔ کبھی تو اقصیٰ نے اپنی پسند۔ اپنی محبت اپنے دل کی بات اسے بتائی نہ تھی.... اور فجر اسے اپنی رازدار دوست کہتی تھی۔ اور فجر کے راز ہی کیا تھے۔ اقصیٰ.... اسے اتنی کم حیثیت سمجھتی تھی۔ کمتر کہ کمترین۔ اس کے تلوے چاٹنے والی نوکروں کی جتنی۔ اقصیٰ نے اپنی محبت۔ چاہت فجر سے اس لیے چھپائی کہ وہ اسے اس قابل سمجھتی نہ تھی۔ راز تو اپنے برابر والوں کو بتائے جاتے ہیں۔ اور فجر یتیم لاوارث بے مایہ تھی۔

وہ کانپتی رہی پھر شنو پھپو آکر اسے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

"ڈرو مت۔ بالکل نہ ڈرو، وہ پاگل ہو گئی ہے۔"

وہ اس سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ فجر کو سکون ہوا مگر سکون اس کی قسمت میں نہ تھا۔ اثر اوپر سے آگیا۔ ماں بیٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرنے لگے۔ دادی صوفے پر آرام دہ حالت میں آنکھیں بند کیے کوئی وظیفہ زیر لب پڑھ رہی تھیں۔ اثر فکر مند تھا۔ اور پھر حمزہ بھی اندر آگیا۔ پہلے اس کی نظر فجر پر پھر اثر پر پڑی، اور یک لخت اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔ وہ اثر پر حملہ آور ہو گیا۔

"ذلیل۔ کمینے کیا کرنے آئے ہو تم میرے گھر۔"

اس نے اثر کو دھکا دیا۔ وہ لاعلمی میں پیچھے ہٹا۔

"کیوں آئے ہو۔ میرا سب کچھ تو چھین لیا تم نے۔ میری خوشیاں اور میری محبت، مگر میں معاف نہیں کرتا۔ میں دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔"

وہ جنون اشتعال کے عالم میں اثر کو مکے مار رہا تھا، دھکے دے رہا تھا۔ مگر اثر صرف اسے روک رہا تھا۔ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ.... پھپا جان آگئے۔ ملازم آگئے۔ بمشکل سب نے حمزہ کو قابو

کیا۔ مگر اس کی زبان۔۔۔

"زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ہارنا نہیں جانتا۔ سمجھے تم۔ اپنی جیت کو عارضی سمجھو۔ میری محبت فجر ہے۔ اور تم نے مجھ سے اسے چھینا ہے۔"

دادی الگ چیخ رہی تھیں۔ انہوں نے شنو سے کہا۔

"تمہیں بیٹھنا ہے تو بیٹھو۔ میں جا رہی ہوں۔ چلو فجر! اثر! اسے پکڑو۔ گر جائے گی۔"

پھپا جان حمزہ کو لے جا چکے تھے۔ اثر نے فجر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی کپکپاہٹ۔ لرزہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ شنو پھپو بھی اٹھ گئیں۔ دادی کو پکڑ کر باہر کے دروازے کی طرف چل پڑیں۔ فجر نے اثر کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" اور دادی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سناٹا ۔۔۔ گیٹ کے پاس وہ باہر جا رہے تھے۔ چچا چچی اور بچے اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ پوچھتے رہے۔

"کہاں۔ کیا ہوا کدھر۔" مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ یہ لوگ باہر چچا چچی اندر چلے گئے۔

گھر آکر بھی سب خاموش تھے۔ جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ دادی لیٹ گئیں انہیں بہت تھکن ہو گئی تھی۔ جذباتی تاسف اور غصہ۔ فجر کو انہوں نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پلنگ کے دوسری جانب اثر بیٹھ کر ان کا ہاتھ سہلانے لگا۔ دس منٹ بعد چچا چچی بھی آ گئے۔ چچی وہاں سے اندر کہیں چلی گئیں۔ چچا شنو پھپو کے پاس بیٹھ کر افسوس کے عالم میں سر ہلانے لگے۔

"مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا۔ آپا کے بچے اس قدر بدتمیز۔ گستاخ ہو سکتے ہیں۔ یہ کیسی تربیت کی ہے آپا نے۔ حمزہ آپے سے باہر۔ ارے میں نے صرف اتنا پوچھا تھا کہ اماں وغیرہ کیوں چلے گئے۔ جواب حمزہ کی دہاڑوں نے دیا۔ اقصیٰ کی چیخ پکار میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ قصہ کیا ہے آخر پھر اندازہ ہوا۔ سب کچھ دولت کا شاخسانہ ہے۔ وہ کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ دولت سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ محبت اور شادی اور انسان تک ۔۔۔ سب کو ان کے سامنے جھکا رہنا چاہیے۔ اماں کیا کر دیا آپ نے آپا کے لیے ایسا رشتہ ڈھونڈا۔"

دادی جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "جب رشتہ کیا تھا۔ تب انسان تھا سفینہ کا شوہر۔ شیطان تو بعد میں ہوا۔ جب دولت برسنے لگی۔ بچے بھلا پھر کیسے ۔۔۔ اور ہاں سفینہ کی بھی کمزوری ہے۔ اولاد کو چھوڑ دیا۔ ہاتھ سے نکل گئے۔ توبہ توبہ۔ ایسی زبان یہاں آتے تھے آخر۔ کبھی نہیں دیکھا نہ سنا کہ کچھ غلط بات کی ہو۔ یہ اب کچھ عرصے سے نہ جانے آنا بھی چھوڑا ہوا تھا اور نہ جانے کیسی صحبت ملی ہوئی تھی۔ یہی سننے میں آتا کہ ۔۔۔ حمزہ کی لڑائی ہوئی ہے۔ سر پھٹ گیا۔ یا کسی کا سر پھاڑ دیا۔ تھانہ پولیس تک بات ۔۔۔ چھوڑو۔"

چچی نے اندر آکر کہا۔ "چلو سب لوگ کھانا لگ گیا ہے۔ آجائیں اماں۔" چچی نے تو معاملہ ختم ہی کر دیا۔

سب کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ چچی کا یہی وصف تھا۔ معاملے کو ہینڈل کر لیتی تھیں۔

لیکن آج کا معاملہ اتنا معمولی نہ تھا۔ سب متفکر تھے۔ فجر کو سب سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہی تو اس واقعے کی وجہ بنی تھی۔ نہ صرف اقصیٰ بلکہ حمزہ نے جو زبان کے جوہر دکھائے تھے سب کے سامنے اسے تو ذلیل کر دیا۔ خواہ اثر کو سنایا۔ مارا۔ مگر ۔۔۔ وجہ فساد فجر بنی ۔ کس کس سے صفائی دے گی یہ کہ اقصیٰ نے کبھی اپنی چاہت ظاہر نہیں کی، لیکن فجر اس رشتے کو روک بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اقصیٰ کو بتانا چاہتی تھی لیکن کیسے؟ جب وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ اسے قائل کر سکے۔

اقصیٰ نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔ اور اثر کو دیکھو مجال ہے کچھ بولا ہو۔ کہہ دیتا ہاں میں بھی فجر کو چاہتا ہوں اس لیے ۔۔۔ میں جیت گیا۔ ارے مگر حمزہ نے بھی تو کبھی منہ سے نہ نکالا۔ فجر سے ہی کہہ دیتا۔ تم میری چاہت ہو۔ تو ۔۔۔ کتنا شرمناک الزام اس پر لگایا۔ دونوں بہن بھائی نے۔ اپنی دولت سے خرید لیا ہو تا اثر کو۔ میں کب ان کے عشق میں مر رہی تھی۔ مگر میں بکاؤ مال نہ تھی۔ انسان کو دل کی کشش اور طاقت سے خریدا

جاتا ہے۔ دولت سے نہیں۔ مجھے تو پتا نہ تھا کہ لوگ دولت کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ حمزہ نے کبھی لگاوٹ کا اظہار کیا ہوتا۔ میں اسے سچ سمجھتی اور پھر پتا نہیں اس سے زیادہ ذلیل کی جاتی۔

اقصیٰ کو بہت اعلیٰ دوست سمجھا۔ دل میں جگہ دی۔ اور وہ اسے کم تر نوکر کے درجے تک سمجھتی رہی۔ پتا نہیں دوستی سے محرومی.... خسارے کا سودا تھا یا بروقت انکشاف ہوا۔ وہ تو پھر بھی اقصیٰ کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن.... موقعہ کہاں آیا۔ معلوم نہیں چچا چچی کے سامنے کیا ڈرامہ ہوا ہوگا۔ اور اثر نے.... فجر کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ اس کا ابھی اظہار نہیں ہوا تھا۔ سونے کے لیے لیٹی تو.... نیند تو کیا آتی شام کے مناظر آنکھوں کے سامنے گزرتے رہے۔

"بی اماں۔" اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "اگر میں اقصیٰ کی غلط فہمی دور کردوں؟"

"کون سی غلط فہمی؟" انہوں نے اقصیٰ کی داستان تو سنی نہ تھی (شنو پھپو نے بھی نہیں بتایا؟)

"وہ.... وہی۔" ہکلا گئی۔ "اس نے مجھ سے لڑائی کی کہ میں نے اس کی محبت چھین لی۔ بی اماں' میں نے تو آپ نے کہا تو میں مان گئی۔ اگر مجھے اقصیٰ بتادیتی کہ وہ اثر سے محبت کرتی ہے تو میں آپ کو بتادیتی۔ ہیں نا؟ پھر تو مگر اس نے کبھی بتایا بھی نہیں۔"

دادی نے اسے لیٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ لیٹ گئی۔ "بیٹا! پھر بھی۔ اقصیٰ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ جب شنو اور اثر کی وہ پسند نہیں تم ہو تم ہی تھیں۔ بھول جاؤ سو جاؤ۔"

"جب درمیان میں غلط فہمی کی گرہ پڑ جائے۔ اسے کھولنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"چپ ہو جاؤ۔ تم میری دادی ہو۔ یا میں تمہاری ..... یہ غلط فہمی نہیں۔ ضد ہے بس اور حمزہ بھی ضد میں بکواس کررہا تھا۔ اثر سے جلتا ہے۔ حسد کرتا ہے۔ وہ ہر کلاس میں پھسڈا ہی رہتا تھا۔ اثر ہمیشہ کامیاب اور اس نے سب کی تعریفیں حاصل کیں۔ نوکری بھی مل گئی۔ اور اب نکاح۔"

"مگر حمزہ کو نوکری کی تو ضرورت نہیں بی اماں۔ اتنی دولت ہے۔"

"ہاں۔ اسے کیا ضرورت۔ لٹانے اڑانے کے لیے باپ کا روپیہ بہت۔ مگر تعریف بھی نہیں کرتا کوئی' ہر جگہ سے پٹ کر آجاتا ہے۔ باپ پھر خبر لیتا ہے۔ مگر سدھارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو سمجھ لو کہ غلط فہمی دور کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ اقصیٰ کی نہ حمزہ کی۔"

دادی لیٹ گئیں۔ حمزہ کی.... دادی جانتی ہیں کہ.... حمزہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ فجر کو اس سے محبت نہیں۔ شاید حمزہ کو بھی صرف اثر سے حسد ہے۔ مقبولیت کا۔ کامیابیوں کا۔

"سو جاؤ فجر۔ بچوں کو ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ہیں نا۔ تمہارے بڑے سنبھال لیں گے سب.... چلو۔"

ارے کس آسانی سے کہہ دیا۔ بچوں کو سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اتنا بڑا واقعہ۔ بلکہ حادثہ اس کی زندگی میں آکر سب کچھ بگاڑ گیا اور دادی کہتی ہیں.... یوں تو اس کی زندگی کتنے ہی حادثوں سے کامیاب گزر گئی تھی۔ ماں باپ کا نہ ہونا کبھی دادی' کبھی نانی کے پاس رہنا۔ کوئی پیار کرتا کوئی گھر کتا۔ کوئی رحم کھاتا کوئی جھڑکتا۔

تربیت کے نام پر اسے سب نے ہی تختہ مشق بنایا۔ پھر وہ سب کچھ سہہ کر مضبوط ہوگئی۔ مضبوط اور لاپروا۔ بے فکر اور ڈھیٹ۔ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آساں ہوگئیں۔ ہاں سچ اور انصاف بھی اس کی فطرت کا خاصہ بن گئی۔ دردمندی' ہمدردی' اخلاص کی خوبیوں نے اسے مقبول بنادیا۔

محبت نفرت کی پہچان بھی اسے ہوتی گئی کمال ہے۔ "وہ اقصیٰ کی نفرت جان سکی (خود سے) نہ محبت سمجھ سکی (اثر سے) کہاں کوتاہی ہوئی اور حمزہ مہربان تھا لیکن محبت کا تو اس نے کبھی نام تک نہ لیا۔ شاید جوڑ نہ ہونے کا فرق اسے بھی ہوگا ہی۔ پھر اثر سے لڑائی جھگڑا اور اثر نے بھی خود کو بچایا ہی اس کے تابڑ توڑ حملوں سے اس کو ایک مکا رسید کردیتا۔ پتا چلتا حمزہ میاں کو۔

دھڑام سے گر جاتے۔ مزا آتا۔ کھا کھا کر مسٹنڈے ہو
چکے ہیں مسٹر۔ مگر بس غصہ۔ گرمی' دولت کی طاقت۔
اثر تو باقاعدگی سے جم جاتا اور گھر پر بھی صبح سویرے
سے ورزش' جاگنگ' باڈی بنائی ہے۔ ہیرو جیسا۔ اونہہ
ہیرو کون سے خوش جمال ہوتے ہیں۔ فلمی ہیرو تو بس
۔ اپنے نام پر چلتے ہیں۔ اثر تو ان سے ہزار۔"

"اُفوہ۔ اثر کا کیا ذکر ہے بھئی۔" خود کو جھڑکا۔ "ہاں
خیر طاقت تو حمزہ سے زیادہ ہو گی ہی پھر چپ چپاتے مار
کیوں کھالی۔ پوچھوں گی۔ شاید جواب دے ہی دے۔
ویسے تو مجھ سے مخاطب ہوتا نہیں۔ مگر... دادی
نے کہا تو میرا ہاتھ کس مضبوطی سے پکڑا۔ میں گرنے
والی ہو رہی تھی۔ کہاں کی دعوت۔ کیسا کھانا۔ جب
سفینہ پھپو کو خبر تھی۔ (ہو گی ہی) کہ بیٹا بیٹی یہ ٹھانے
بیٹھے ہیں۔ تو نہ کرتیں دعوت۔

اقصیٰ نے کبھی بھی کیوں مجھ پر ظاہر نہ کیا۔ شاید اثر
سے کہا ہو۔ ارے تو اقصیٰ سے کر لیتا شادی۔ اتنا جہیز ملتا
۔ کوٹھی کار۔ امریکہ۔ سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون۔ سفینہ
پھپو ذکر کرتی ہی رہتی تھیں۔ داماد کی تلاش کے ذکر پر'
کس کس طرح بخشش کی جائے گی۔ تو اثر ہی فائدہ اٹھا
لیتا۔ کتنا احمق ہے۔ میں تو بہت عقل مند سمجھی تھی
اور شنو پھپو انہیں بھابی کیوں پسند نہ تھی۔ اتنی خوب
صورت اوپر سے میک اپ کا سلیقہ بھی ہے اور قیمتی
لباس بھی اسے دو آتشہ بنا دیتے۔

اقصیٰ شدید غصے میں ہے۔ اسے کتنا صدمہ ہوا ہو
گا۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنی خالہ سے جواب طلب
کرتی۔ ہاں مگر شاید میرے آنے کے بعد کچھ کہا ہو گا۔
بے چاری کے ساتھ زیادتی ہو گئی۔ اب ازالہ۔ کوئی
تدبیر۔ دوست ایسے ہوتے ہیں؟ کبھی مجھ سے کہا ہوتا۔
میں فٹ انکار کر دیتی۔ مجھے کون سا عشق تھا اثر سے۔
لیکن اب..."

سوچ سوچ کر تھک گئی۔ تو نیند بھی آ ہی گئی اور پھر
... رات گزر گئی۔

صبح دادی نے جگایا۔ "نماز پڑھ لو۔" نماز پڑھ لی۔
دادی نے کہا۔

"دعا مانگو۔ اپنے لیے اور ان کے لیے بھی۔" وہ
دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی سوچتی رہی۔ کیا مانگے۔
کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو پھر لیٹ گئی۔ نیند پھر آ گئی۔
آنکھ پھر دیر سے کھلی۔

دادی نے اپنا اور اس کا ناشتہ کمرے میں ہی منگالیا۔
چچی لے کر آئیں۔ پھر خود ہی بتانے لگیں۔

"شنو آپا تو سفینہ آپا کی طرف گئی ہیں۔ وہیں ناشتہ
کریں گی۔ بدگمانیاں دور ہونی چاہئیں۔ اثر بھی گیا ہے
اللہ رحم کرے۔"

"ہوں۔ اچھا ہے۔" دادی نے سر ہلایا "شاید ان
کوڑھ مغزوں کی سمجھ میں کوئی بات آ جائے۔ میں بھی
جاؤں گی۔ مگر ابھی نہیں۔ معاملات سدھارنے کی
کوشش تو کرنی ہو گی۔ شنو کو سمجھانے دو۔"

سدھارنا اور سمجھانا۔ شنو پھپو نے اقصیٰ کا جنون
خود دیکھا تھا۔ حمزہ کا بھی۔ اثر کو کیوں لے گئیں۔ دادی
باتھ روم ہاتھ دھونے گئیں تو چچی نے چپکے سے کہا۔

"اقصیٰ جل کر کوئلہ ہو رہی ہے۔ کیا سمجھے گی۔"

"چچی! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ
۔"

"تم... بہت سادہ ہو اور سب کو اپنا جیسا سمجھتی ہو
۔ ایسا نہیں ہوتا ہر کسی کی فطرت مختلف ہوتی ہے۔"

دادی باہر آ رہی تھیں۔ ساتھ ہی باہر سے آہٹیں
اور آوازیں بھی۔ پھر سفینہ پھپو آئی اور دادی سے لپٹ
کر رونے چیخنے لگیں۔ شنو پھپو ان کے پیچھے کچھ حیران
سی... سفینہ پھپو کچھ کہہ رہی تھیں۔ رو رو کر فریاد کر
رہی تھیں۔

"کیا میں آپ کی بیٹی نہیں...؟ میرے بچے آپ
کے کچھ نہیں ہوتے۔ جو ہے وہ یہی ہے۔ کہاں کی فتنہ
۔" پھر ان کی نظر فجر پر پڑی۔ ماں کو چھوڑا اسے پکڑ لیا۔"
یہ' یہ ہے فساد کی جڑ۔ اسی فتنی کی وجہ سے کیا آپ مجھے
چھوڑ دیں گی؟ یہ ہے کیا چیز۔ میرے بچوں کا اس کا
مقابلہ ہی کیا ہے؟ ارے اس نے تو میرے کلیجے پر ہاتھ
ڈالا ہے۔ میں پھر بھی چپ رہی۔ ایک طرف بیٹا۔
دوسری طرف بھانجا۔ اس نے تو دلوں میں دراڑیں ڈلوا

دی ہیں۔ میری بچی کا کیا حق نہ تھا؟ آپ نے اس کی خاطر میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ میں احتجاج نہ کروں... اس ایک ہستی کے لیے آپ اپنی اولاد کو چھوڑ دیں گی میں اس کا۔"

انہوں نے فجر کو دھکا دیا۔ وہ ویسے ہی سراسیمہ تھی سنبھل نہ سکی۔ لڑکھڑا کر دور جا گری۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی اس کا سر نماز کی چوکی کے کنارے سے ٹکرایا۔ سر چکرا گیا۔ چچی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اور کمرے سے باہر لے آئیں۔ بچوں کے کمرے میں اسے بٹھایا۔

"پریشان نہ ہو۔ پتا نہیں شنو آپا کے ساتھ وہاں کیا بات ہوئی ہے پتا کرتی ہوں۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں فجر۔ تم اپنی جگہ مضبوط رہنا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔"

"میں اپنی جگہ مضبوط رہوں؟ اس کا کیا مطلب چچی! کیا میں اس لیے کمزور ہوں کہ میرا اس نکاح کے معاملے میں کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ بڑوں کا فیصلہ تھا۔ یا اس لیے کہ میرے ماں باپ نہیں۔"

"فجر! یہ شنو آپا اور اماں کی خواہش تھی۔ اگر اثر چاہتا۔ اقصیٰ کا انتخاب ہوتا مگر اثر نے بھی تمہارا نام لیا۔ سفینہ آپا بیٹی کی محبت میں اس اہم بات پر غور نہیں کر رہیں۔ ادھر بیٹے نے نیند سے جاگ کر انگڑائی لی ہے۔ سفینہ آپا کے پچھتاوے ہی ختم نہیں ہو رہے۔ لو اب اثر سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے ادھر آ رہی ہیں اثر روک رہا ہے۔"

اور دیکھتے دیکھتے سفینہ پھپو لپکتی ہوئی کمرے میں آگئیں، چچی گھبراہٹ میں دروازہ بھی بند نہ کر سکیں۔ سفینہ کے پیچھے اثر اور ہائیں ہائیں کرتی دادی بھی آ رہی تھیں۔ سفینہ نے فجر کو دیکھ لیا تھا۔

"کدھر گئی۔ یہاں آ کر چھپ گئی۔ دیکھا چوروں کی خصلت ہے۔"

چچی نے سفینہ کو روکنا چاہا۔

"آپا! اس کا کیا قصور ہے۔ بڑوں کا فیصلہ۔"

"نواسی نے بڑوں کو پٹی پڑھائی ہوگی۔ اس نے تانا بانا بن کر تیار کیا۔ کہ سب مجبور ہو گئے۔"

کمر پر ہاتھ رکھے دوسرا ہاتھ نچاتی چیختی چلاتی کہیں سے کسی شریف خاندان کی خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔ ایک بار فجر نے ایک تنور والی کو گلی میں اپنے ایک گاہک سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح کمر پر ہاتھ رکھے دوسرا ہاتھ نچاتی تھوک اڑاتی گالیاں بک رہی تھی۔ اس وقت فجر کو بہت ہنسی آئی تھی۔ مگر اس وقت وہ خوف زدہ تھی۔ چچی کی بات کا جواب دے کر پھر فجر پر توجہ مرکوز کر دی اور پھر اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ پھر گر گئی۔ (کیا اتنی کمزور تھی وہ؟) پلنگ کی پٹی ماتھے پر اسی جگہ ٹکرائی۔ جہاں پہلے چوٹ لگی تھی۔ پھر چچی کے منہ سے نکلا۔ "آئے ہائے۔"

انہوں نے ہی سفینہ کو ہٹا کر فجر کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جو واقعی چکرا گئی تھی۔ "خون نکل رہا ہے۔"

دادی نے اسے اٹھایا اور وہیں بیٹھ گئیں اسے پاس بٹھا لیا۔ چچی نے اثر سے کہا۔

"پٹی اور دوا۔ میرے کمرے سے لے آؤ۔ عشا بتا دے گی۔"

فجر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کیا ہو رہا ہے وہ آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔ شنو پھپو کچھ بول رہی تھیں۔ پھر سفینہ پھپو بھی بحث کرنے لگیں۔ چچی نے خون صاف کر کے اس کے زخم پر دوا لگا دی۔

"سنو' سنو' سفینہ میری بات تو سنو۔" سفینہ پھپو کہہ رہی تھیں۔ "کیا سنوں۔ صبح سے سن رہی ہوں۔ کیا میرا بھانجے پر کوئی حق نہیں۔ تم نے بھی۔" فجر نے ماتھے کو ہتھیلی سے دبایا اور کھڑی ہو گئی۔

"منجھی پھپو! میری بات بھی سنیں۔ آپ پریشان نہ ہوں اور کوئی غم نہ کریں۔ میں آپ کے بھانجے سے دستبردار ہوتی ہوں' لے جائیے اپنا حق اپنا بھانجا اور باندھ لیجیے بیٹی کے آنچل سے۔ میں اپنا حق چھوڑ رہی ہوں۔" آواز بھرا گئی۔

"آئے ہائے۔ دست بردار جانتی ہے کہ اس طرح نکاح ختم نہیں ہوتا۔ حق چھوڑنا ہے تو طلاق..."

دادی پھپھی' بھتیجی کے مکالموں پر سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ چیخ پڑیں۔ "سفینہ!"

"اچھا۔ وہ تو پھر یونہی سہی میں نے طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔ بس خوش میں نے ہر تعلق ختم کر دیا اب۔ یہی چاہتی تھیں آپ؟"

چکر آگیا۔ وہیں گر گئی دادی کی گود میں۔ اثر سفینہ کو زبردستی پکڑ کر باہر لے گیا۔ عجیب سا سناٹا کمرے میں چھا گیا۔ پھر چچی کی کھلکھلاہٹیں اس سناٹے کو توڑنے میں کامیاب ہو گئیں۔ فجر نے آنکھ کھولی۔ منہ پر ہاتھ رکھے چچی ہنسی سے دہری ہو رہی تھیں۔

"چچی اماں! مجھے ہنسی آرہی ہے فجر کے طلاق کہنے پر۔ کیسا چپ کیا سفینہ آپا کو۔ بے چاری پھر کیا کرتی۔"

وہ پھر ہنسنے لگیں۔ بی اماں بھی مسکرا دیں۔ اور شنو پھپو دیوار سے لگی رو رہی تھیں۔ انہیں بھی چچی نے گدگدایا۔ وہ بھی ہنس دیں۔ انہیں ہنستا دیکھ کر فجر کو بھی ہنسی آگئی۔ ساری تلخی فضا میں بکھر گئی۔

شنو پھپو نے اسے گلے لگا لیا۔ "تم میری آرزو ہو۔ سفینہ پاگل ہے۔" (پاگل ایسے ہوتے ہیں؟)

دوپہر ہو گئی تھی اور چچی کی انتظامی سرگرمیاں۔ کھانے کے لیے بلانے آگئیں۔ فجر لیٹ گئی تھی مگر اٹھنا پڑا۔ اسے کون بھوکا رہنے دیتا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اعلان کیا۔

"بس بی اماں' آج میں ساہیوال جا رہی ہوں۔ اگر آج یا کبھی سفینہ پھپو نے مجھے قتل کر دیا۔ تو میری بے چاری اماں جان (نانی) تو سنتے ہی مر جائیں گی۔ مجھے ان کی زندگی بہت عزیز ہے۔"

اس کے ارادے اور پروگرام یونہی اچانک بن جاتے تھے۔ سب کی گردنیں ایک دوسرے کی طرف اٹھ گئیں۔

"آپ فکر نہ کریں اماں! مجھے جانے دیں ورنہ یہاں بہت خراب حالات ہو جائیں گے۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا۔۔۔ مگر میں۔۔۔ میری برداشت بس اتنی ہی ہے۔" دادی سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ بہت غمگین تھیں وہ۔

"میں جانتی ہوں۔ تمہیں برداشت نہیں۔ میں تمہیں کیسے تسلی دوں۔ بڑھاپا انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ بوڑھا ذہن اور دل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی مجبوری میں غلط فیصلے بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں مطمئن ہوں۔ تمہارے مستقبل کے لیے میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ کیونکہ جانتی ہوں۔ شنو بے ریا۔ محبت کرنے والی ہستی ہے۔ اثر کی تربیت اس نے کی ہے۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں شنو نے۔ اور اثر نے بھی بہت ہمت سے یتیمی کی زندگی گزاری۔ میں نے اس کے دل کی خوشی پوری کی ہے۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے۔ جتنی تم۔ شاید میں اپنے سب بچوں میں توازن نہیں رکھ سکی۔ محبت کمزور کر دیتی ہے۔ لیکن چاہا تھا کہ سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے تسبیح کے دانوں کی طرح رہیں۔ اتفاق اور محبت سے۔ کبھی کبھی کوئی دانہ ادھر ادھر گم ہو جائے تو اذیت ہوتی ہے۔ یہ جو دل کی دھڑکن ہے۔ یہ محبت کا منبع ہے۔ تم نے شاید محسوس کیا ہو۔ میں نے سفینہ کی بہت سی ناگوار اور نا انصافی والا باتیں برداشت کر لیں۔ وہی کمزوری۔ تمہاری حمایت ویسے نہ کر سکی۔ جس کی شاید تم کو توقع تھی۔ شاید اس لیے۔۔۔ تم نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اختیار رکھتے ہوئے بھی بے اختیار رہوں۔ جان بوجھ کر نہیں' کمزور قوت ارادی کے باعث۔۔۔ اپنی ہر بات نہیں منوا سکتی۔ بہرحال۔ ایک مضبوط گرہ لگا دی ہے۔ تم سے بس اتنا چاہوں گی کہ اس کو کمزور نہ ہونے دینا۔"

دادی رو رہی تھیں۔ فجر کو خود پر غصہ آگیا۔ ایسی بھی خود سری اچھی نہیں۔ سفینہ پھپو کی محبت نے دادی کو۔۔۔ کچھ کہنے نہ دیا ہو گا۔ یا کمزوری کی وجہ سے نہیں بول سکیں۔ محبت بھی کمزور کر دیتی ہے۔

"بی اماں۔" وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر دردمندی سے بولی۔ "اگر آپ اجازت نہیں دیں گی تو میں نہیں جاؤں گی۔ لیکن مجھے اب ڈر لگ رہا ہے۔ بتائیے میرا کیا قصور ہے۔ سب مجھے ہی خطاوار سمجھ رہے ہیں۔ کیا اس لیے میں ہر الزام سہتی رہوں۔ سب کی باتیں سنوں کہ میرے باپ ماں نہیں۔ جو میری حمایت کریں۔ یا میرے لیے لڑیں۔ میں اکیلی ہوں اس لیے

کمزور ہوں۔"

دادی نے بزور اس کو کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ "میں جو ہوں۔ زندہ سلامت۔ میری چاند۔ میں لڑوں گی سب سے۔" چکوں پھکوں رو رہی تھیں۔ بچی کی زناٹے دار چلتی ہوئی آواز کے سامنے تو بول نہ سکیں۔

"ابھی کہہ رہی تھیں کہ بے اختیار ہیں۔ پھر کیسے لڑیں گی۔"

"یہ تو نہیں کہا تھا میں نے۔" صاف مکر گئیں۔ "بس یہ ہے کہ کوئی زور سے بولے۔ تو میں چپ ہو جاتی ہوں۔"

"بی اماں۔ شر کو بڑھنے سے پہلے۔ اس کا تدارک کر لینا چاہیے۔ میں جب تک یہاں رہوں گی۔ کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھاتا رہے گا۔ آپ بول سکیں گی نہ میں۔ میں بھی آپ کی پوتی ہوں۔"

جب اقصیٰ نے دوستی کا لحاظ نہ کیا۔ سفینہ پھپھو نے رشتے کا بھرم نہ رکھا۔ پھر اب اور الزام نہیں۔

"اچھا بیٹی۔۔۔ جیسی تمہاری مرضی۔ کیسے روکوں۔ تم بھی حق پر ہو۔"

کمرے سے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ کپڑے سوٹ کیس میں بھرے۔ ایک بیگ میں ضروری چیزیں۔

"پھر آؤں گی۔ فکر نہ کریں۔ بوا کو لے جاؤں گی۔ وہ بس میں بٹھا کر آجائیں گی۔"

دادی اس کے ارادے کی مضبوطی۔ لپ جھپ تیاری کرتے دیکھتی رہیں۔ دونوں چیزیں کھینچتی ہوئی باہر نکلی۔ چچی کو بتایا۔ بوا سے بات کی۔ چچی شنو پھپھو کو بتانے دوڑیں۔ جو کھانے کے بعد آرام کر رہی تھیں۔ "فوراً" آئیں۔ اس کی ایک نہ سنی۔ سامان برآمدے میں چھوڑا۔ شنو پھپھو کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی۔

"سنو فجر! میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ مگر اس طرح اکیلی۔۔۔ میں تمہیں اکیلی نہیں جانے دوں گی۔ اب تم میری ذمہ داری ہو۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتی۔ مگر خالہ جان مجھ سے ناراض ہیں۔ میری شکل دیکھنا نہیں چاہتیں۔ تمہیں باہر سے ہی چھوڑ کر آجاتی۔ مگر۔۔۔ وہاں سے "فوراً" واپسی۔۔۔ ہمت نہیں ہے۔ تھک جاتی ہوں۔ ہمت کر لوں گی۔ یقین کرو۔ مگر ابھی نہیں۔ کل صبح۔ میرا دل دماغ صبح سے اس قضیے کو نپٹانے میں۔۔۔ تھک گئے ہیں۔ دن میں تو واپسی بھی آسان ہو گی۔ اس وقت اگر گئے۔ تو مجھے رات ہو جائے گی واپسی میں۔ میں تو یہاں کے راستے بھی بھول گئی ہوں۔ ساہیوال کے تو پھر۔۔۔ مجھے وہاں کی بسوں کا بھی علم نہیں نہ ٹرین کا۔"

"پھپھو! مجھے سب معلوم ہے۔ میں جا سکتی ہوں۔ اکیلی بھی مشکل نہیں ہے۔" کبھی اکیلی گئی تو نہیں تھی۔ مگر آج۔

"میں نے کہا ناں۔ اب تم میری ذمہ داری ہو۔ تمہیں جانا بھی چاہیے۔ رخصتی تو تمہارے ہی گھر سے ہو گی۔ اثر سفینہ کو گھر لے گیا ہے۔ دیکھو۔۔۔ وہاں اب کیا۔" آزردہ تھیں۔ فجر کو ترس آگیا۔

"اچھا۔۔۔ چلیے میں کل چلی جاؤں گی۔" انہیں تسلی دی۔ وہ خوش ہو گئیں۔ بہت ہی سادہ دل صاف دل۔ محبت کرنے والی ہستی۔ وہ انہیں بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ گھر میں سب ہی اسے ڈانٹ دیتے۔ شنو پھپھو نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا ہمیشہ پیار سے مسکرا کر اسے سمجھایا۔ اور اب حمزہ کی بے ہودہ گوئی نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہوں گی۔ موجودہ حالات میں۔

"پھپھو۔۔۔ آ۔۔۔ آپ نے اقصیٰ کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کے مقابلے میں وہ خوب صورت بھی ہے۔ لائق۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ اور اس کے والد کی اعلا پوزیشن ہے۔ سفینہ پھپھو آپ کی سگی بہن ہیں۔" فی الحال حمزہ کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شنو پھپھو تڑپ گئیں۔ فجر کو کھینچ کر قریب کر لیا۔

"ہاں سچ ہے۔ مقابلہ ہی کیا ہے؟ تو سنو۔ تم میری اپنی ہو۔ وہ غیر خاندان کی ہے۔ تم میرے بے حد پیارے عزیز بھائی اور بہترین پیاری دوست کی بیٹی۔ جو میری نند بھی بنی۔ ہم میں اتنی چاہت تھی۔ کہ سب

ایک جان دو قالب کہتے تھے۔ اور پھر.... میری یتیم پیاری بھتیجی۔ اثر کی جیسی، مجھے یہی لگا۔ تم دونوں میں فرق نہیں اور شروع سے میں چاہتی تھی کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔ میں پرورش کروں۔ اپنے بھائی اور اپنی دوست کی محبت کا قرض ادا کروں۔ اگر دوسرے ملک کا معاملہ نہ ہوتا تو یہ ممکن بھی تھا۔ حالات ہی ایسے ہو گئے کہ....“

سرد آہ بھر کر چپ ہو گئیں۔ نہ جانے بے چاری کے کیا کیا ارمان تھے۔ جو دوسرے ملک جا کر تشنہ رہ گئے۔

”لیکن میں نے سوچ لیا تھا۔ میں تم سے دور نہیں رہوں گی۔ میں نے اس لیے اثر کی تربیت اس طرح کی کہ وہ یہاں کے معاشرے میں اجنبی نہ رہے۔ بار بار اسے یہاں بھیجتی کہ سب سے تعلق رہے اور خاندان کے طور طریقوں سے واقف ہو.... میں اسے تمہارے لائق بنانا چاہتی تھی اور وہ بن گیا۔ جب اس نے خود تم کو دیکھا بار بار واسطہ پڑا۔ اور جو میں چاہتی تھی۔ ویسا ہی ہوا۔ یعنی وہ تم کو پسند کرنے لگا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں، یہاں کے لوگوں کی ذہنیت اگر تمہاری کسی جگہ شادی ہو جاتی اور سسرال قدر دان نہ ہوتی۔ تمہیں محبت نہ ملتی۔ یا تمہاری یتیمی تمہارے لیے سزا بن جاتی۔ میں اپنے مرحوم بھائی اور اپنی عزیز دوست بھابھی، بہن، نند ارے کتنے رشتے بنتے ہیں۔ ان کو کیا جواب دیتی.... میں تمہارے سامنے ہمیشہ شرمندہ رہتی۔ اور کوئی مداوا نہ کر پاتی۔ تم جب پیدا ہوئیں۔ میں نے کہا۔ بس یہ میری ہے۔ میرے اثر کی سب ناراض ہوئے کہ کیا جاہلانہ ذہنیت ہے۔ مگر.... تمہارے اور اثر کے والد.... بہت ہنسے تھے۔ خوش ہوئے پہلے ہی کئی رشتے آپس میں بنتے تھے۔ شنو نے ایک نیا رشتہ بھی استوار کر لیا۔ مجھے یاد ہے۔ اثر پیدا ہوا۔ مجھ سے زیادہ تمہاری ماں نے خوشی منائی۔ گانے گائے تحفے.... ہر دن کچھ نہ کچھ لے آتی تھیں۔ تم کئی سال بعد پیدا ہوئیں۔ سب نے بے حد خوشی منائی۔ خالہ جان.... کو کچھ مایوسی ہوئی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اسے اثر کے لیے نامزد کر دیا ہے۔ تو بہت خوش ہوئیں۔“

شنو پھپھو کے چہرے پر روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ پرانی یادیں۔ خوشگوار یادیں۔ نہ جانے انہیں کیا کیا یاد آ رہا تھا۔

”میری اور ثمر کی دوستی تو تھی ہی۔ خالہ جان پہلے لاہور میں ہی رہتی تھیں۔ ہم دونوں نہ صرف یہ کہ خالہ زاد بلکہ۔ کلاس فیلو بھی۔ اثر کے والد اور تمہارے والد میں بھی دوستی تھی۔ رشتے اس طرح جڑے کہ پھر میں اور تو نہیں ہم ہو گئے۔ ہر جگہ ساتھ، ہر خوشی ساتھ، کوئی چھوٹی موٹی پریشانی بھی مل بیٹھ کر دور کر لیتے۔ غم تو کہیں تھا ہی نہیں۔ خوشیاں، قہقہے، چہچہے، خوش قسمتی کا مہربان پرندہ ہمارے ساتھ اڑتا پھرتا۔ پھر نہ جانے کس کی نظر لگی۔ کہتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی پر دشمن بھی رشک کرتے تھے۔ پھر وہ پرندہ جانے کس کے پاس چلا گیا۔ خوشیاں پانی کے بلبلے کی طرح پھوٹ گئیں۔ سب جدا، تتر بتر ہو گئے۔ میں تو پھر بھی.... اثر اور تمہیں لے کر خالہ جان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ خالو جان ساہیوال میں گھر بنا چکے تھے۔ میں نے عدت کے دن وہیں گزارے۔ پھر رسم و رواج کے مطابق عدت کے بعد میکے آئی۔ یہاں تم بھائی اور ثمر نے میرے دکھوں پر مرہم رکھا۔ میرا دل لگ گیا۔ ثمر اور بھائی تمہیں میرے پاس چھوڑ کر کسی شادی میں شرکت کے لیے گئے اور ایمبولینس میں جنازے آئے۔ اپنا غم سنبھالتے سنبھالتے ادھ موئی ہو رہی تھی۔ کہ یہ ناقابل برداشت صدمہ۔ کتنے دن اس گھر میں سناٹے کا دور رہا۔ اماں کا حوصلہ، ہمت اور برداشت .... انہی نے سب کو تسلیاں دے کر۔ اثر اور تمہارے حوالے دے کر۔ مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا۔ ورنہ میں تو....“

انہوں نے سر تکیے پر ڈال دیا۔ آنسو یوں روانی سے بہہ رہے تھے۔ جیسے ابھی جنازے اٹھے ہوں۔

فجر نے ان کے آنسو انگلیوں کے پوروں میں اٹھائے۔

"پھپو پلیز اب تو میں بھی رونے لگوں گی۔ ہاں۔"
اس کی آواز میں بھی آنسوؤں کا گولا پھنس رہا تھا۔ ماں باپ کی موت کو تو وہ بھول چکی تھی۔ مگر شنو پھپو کے آنسو۔ کتنا صدمہ انہوں نے سہا ہو گا۔ وہ خود تو ماں باپ کے لیے کبھی نہیں روئی۔ لیکن یہ۔۔۔ ایسی ہوتی ہے دوستی اور محبت۔ رفاقت۔۔۔ ایک اقصیٰ ہے۔ نہ دوستی کی لاج رکھی نہ رشتے کا بھرم۔
شنو پھپو مسکرائیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"دیکھا یہ ہے فرق۔ اس دن میں سفینہ کے گھر بھی اسی طرح رونے لگی تو اقصیٰ نے مذاق اڑایا۔ کہ اتنے برسوں میں تو مرنے والوں کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی' آپ یوں آنسو بہا رہی ہیں۔ جیسے ابھی جنازے اٹھے ہوں' اور تم آنسو پونچھ رہی ہو۔" وہ جھینپ گئی۔ "سچ پھپو! مجھے اپنی ماں یا باپ تو یاد نہیں۔ نہ ہی احساس ہے ان کے نہ ہونے کا' مگر آپ کو اتنا احساس ہے۔ تو محبت بھی کتنی ہوئی ان لوگوں سے۔"
"ہاں۔ سب کچھ محبت ہوتی ہے۔ یہی محبت تم سے ہے۔" وہ اداسی سے پھر بولنے لگیں۔ "خالہ جان تمہیں لے جانا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا میں آؤں گی تو فجر کو لے آؤں گی۔ مگر یہاں میرے رشتے آنے لگے۔ میری خوب صورتی میرے لیے۔ میری جوانی۔۔۔ ابا اماں کے لیے خطرہ بن گئی۔ حالانکہ میں۔۔۔ تم دونوں کے سہارے پوری عمر گزار سکتی تھی۔ خالہ جان کو بہت صدمہ ہو گا۔ اس لیے ان کو میری شادی کا بتایا ہی نہیں۔ جب انہوں نے سنا بے حد ناراض ہوئیں۔ مجھ سے ہر رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔ میں دوبئی سے آئی ان کے پاس گئی۔ انہوں نے بات کی نہ اثر کو پیار کیا۔ مگر میں نے دیکھا۔ میری غیر موجودگی میں۔ وہ اثر کو لپٹا لیتی ہیں۔ بہت پیار کرتی ہیں۔ پھر میں اکثر اسے اکیلا چھوڑ کر ادھر ادھر چلی جاتی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہونا درکنار۔ کھانے کا بھی نہیں کہتیں۔ بس کھانا میز پر رکھا اور ہٹ گئیں۔ ایسی صورت میں کب تک رہتی۔ اس کے بعد جب آنا ہوتا۔ اثر کو کسی کے ساتھ بھیج دیتی۔۔۔ پھر آسٹریلیا۔ امریکہ۔ غرض میں خانہ بدوش ہو گئی۔ اثر کی اسکولنگ شروع ہو گئی۔ پھر بھی۔۔۔ میں لاتی رہی۔ تعلق نہ ٹوٹے۔ خالو جان فوت ہوئے تو۔۔۔ اثر کے والد کا جائیداد میں جو ترکہ تھا۔ وہ رقم کی صورت مجھے دیا اور گھر بھی آدھا تمہارے لیے آدھا اثر کے نام کر دیا۔ بہت ہی منصف مزاج اور حساس تھے وہ۔ اب وقت آ گیا کہ میں اپنا ارمان اور تمہارے لیے جو میرا منصوبہ تھا اسے پورا کرتی۔ اماں سے ذکر کیا۔ وہ تو خود بھی۔۔۔ میں تو رخصتی بھی کر لیتی۔ اماں نے کہا اثر اپنا گھر بنا لے' پھر اس کے علاوہ بہنوں کے بڑے ارمان ہیں وہ اور ان کے والد بھی شریک ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے جلدی یہ تھی کہ۔۔۔ مضبوطی کر جاؤں۔ نہ جانے اب۔۔۔ کب آنا ہو۔"
شنو پھپو آج دل کھول کر دکھا رہی تھیں۔ وہ متاثر ہو گئی۔
بچی چائے لے آئیں۔ وہ فجر کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ انہیں آج کے معرکے میں بہت لطف آیا۔ سفینہ کی دولت مرتبے کی فجر نے پروا ہی نہ کی۔ خوب سنائیں۔ وہ بہت خوش مزاج تھیں۔ ہر حال میں خوش رہتیں۔ میاں سے بھی کبھی جھگڑا ہوتا۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ کو ادھر ادھر ڈال دیتیں۔ جیسے کسی نے آنچل ایک اس کندھے پر دوسرا دوسرے کندھے پر ڈال دیا ہو۔ ڈانٹ سنی۔ اور سامنے سے ہٹ گئیں۔ چند منٹ بعد آ کر خاص طور پر میاں سے یوں مخاطب ہوتیں جیسے انہوں نے کسی اور کو ڈانٹا ہو۔ وہ بھی ہنس کر کہتے۔
"بہت ہی ڈھیٹ شے ہو روحی بیگم۔"
"تو کیا روتی رہوں' کیوں بھئی۔ تمہارے ساتھ ہنسوں گی بھی' بسوں گی بھی اور پھنسوں گی بھی۔"
رات فجر دادی کے پاس ہی سوئی۔ شنو پھپو کی باتیں کرتی رہی۔ انہوں نے بھی کئی باتوں کی تصدیق کی۔
"تم پیدا ہوئیں تو شنو نے کہا۔ یہ میرے ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ ٹھیکرا تو ملا نہیں چینی کی پلیٹ میں سکہ ڈال کر ثمر کے آگے رکھا۔ اس پر تمہارے دادا بہت

ناراض ہوئے کہ جاہل لڑکی ہے۔ یہ اس طرح کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جوان ہو جائیں تو عمل کے ذریعے خواہش پوری کرنا۔"

"ٹھیکرے کی مانگ.... یہ کیا ہوتا ہے۔" فجر سن کر ہی پریشان ہو گئی۔

"ہوتا تھا۔ پہلے زمانے میں بچی کے پیدا ہونے کے بعد رشتہ ایسے دیا جاتا تھا' ٹھیکرے میں سکہ ڈال کر بچی کے ماں باپ کے سامنے رکھا جاتا تھا کہ یہ میری ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ بچی کے ماں باپ مان گئے تو سکہ قبول۔ بس یہ پیدائشی منگنی سمجھو۔ اب اور کوئی رشتہ بھی نہیں دے گا۔" فجر کو فخر ہوا (میری تو چینی کی پلیٹ کی مانگ ہوئی پھر)

☼ ☼ ☼

صبح پھر فجر کی روانگی کا غلغلہ ہوا۔ چچا نے کہا۔

"میں چھٹی لے کر تمہیں لے جاتا۔ مگر دو تین دن بہت مصروفیت ہو گی۔ ورنہ میں تمہیں جانے نہ دیتا۔"

"پھوپھو چل رہی ہیں میرے ساتھ' ویسے میں جا سکتی ہوں۔ اکیلی بھی۔" اطمینان دلانا چاہا۔

"آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ نہیں جا سکتیں۔ اب ایسا ہے کہ۔ اثر چلا جائے گا اپنی دادی سے مل بھی لے گا۔ ورنہ انہیں شکایت ہو گی کہ نواسی کو اکیلا بھیج دیا۔"

"میں اکیلی جا سکتی ہوں چچا۔" اس نے جتایا کہ وہ اثر کے ساتھ نہیں جائے گی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ٹرین میں تم اکیلی ہو گی اپنے ڈبے میں۔ اثر دوسرے ڈبے میں۔ مگر یہ تمہاری نانی کی تسلی کے لیے ساتھ جائے گا۔ ورنہ وہ کہیں گی۔" (اور اثر کو تو جیسے آفس میں کام ہو گا نہیں۔ منہ دیکھنے کے لیے رکھا ہے انہیں۔ حسن کا دیوتا جیسے.....) چڑ گئی تھی۔

"ہاں بھئی اپنے کمپارٹمنٹ میں تم اکیلی ہی ہو گی۔ اثر کیا عورتوں میں گھس کر بیٹھے گا؟ اصل میں اثر کے آفس کے مینجنگ ڈائریکٹر لندن میں فوت ہو گئے ہیں۔ ان کے سوگ میں آفس میں چھٹی ہے تین دن کی۔"

لو ان کو بھی آج ہی مرنا تھا۔ اچھا اور چچا تو جیسے جانتے ہیں۔ اب تو عورت مرد ایک جگہ ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ مزید چڑ کر منہ بنا لیا۔ مگر بحث بے کار تھی۔ چچا اف غصیلے۔

وہ اندر گئی۔ دادی کے پاس شنو پھپھو بیٹھی تھیں۔ اثر بھی تھا۔ اسے آتا دیکھ کر باہر چلا گیا۔ شنو پھپھو رنجیدہ تھیں۔ دونوں کو سلام کر کے گلے لگ کر فکر نہ کرنے کی ہدایت دیتی باہر آئی۔ چچا انہیں چھوڑ کر اپنے آفس جائیں گے۔ چلو ٹیکسی کا کرایہ بچا۔ دادی باہر نکل کر آ گئیں۔ بے چینی..... نصیحت بھی لازمی تھی۔

"دیکھو بیٹا! ہمیں علم ہے۔ تم بہت دلیر ہو۔ ہمت والی بھی ہو۔ مگر دنیا کی نظر میں تو لڑکی ہی ہو۔ مرد کا سایہ ساتھ ہو۔ وہ بھی مضبوطی کا سبب بن جاتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار حادثے کی صورت میں۔ مرد کی ہمراہی۔ تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اب نہ وہ غیر ہے نہ نا محرم۔"

اثر کے ہمراہ سفر اسے کب ارمان تھا۔ عجیب نامعلوم حالات میں یک دم نکاح کا شوشہ چھوڑا گیا اور کم بخت بلکہ بدبخت حمزہ کا نام لیا ہوتا دادی نے۔ کتنی خوشی ہوتی اسے۔ ہنس مکھ' چلبلا۔ شوخ اور امیرزادہ۔ لو جی کیسا دوسرا کمپارٹمنٹ اور کون سی الگ سیٹ۔ چچا بس اسٹاپ کی طرف مڑ گئے۔

"ٹرین اس وقت نہیں جاتی۔" کی اطلاع..... بس اسٹاپ پر پہنچ کر دی۔ انہیں چھوڑ کر خدا حافظ کہا یہ جا وہ جا۔

بس تیار تھی۔ اثر ٹکٹ لے آیا۔ دو سیٹیں برابر برابر۔ وہ جلتی بھنتی کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی۔

اثر دیدہ دلیری سے مسکرا رہا تھا۔ "کچھ کھاؤ گی؟ لاؤں؟" جی میں آیا کہے۔ تمہارا کلیجہ۔ چپ رہی کہ ساری زندگی یہی کرنا تھا۔ بس روانہ ہوئی۔ شہر کے باہر پہنچی کہ ہچکیاں لینے لگی۔ پھر تشنج سا ہوا۔ اف آخر رک گئی۔

"انجن میں خرابی ہے۔ کچھ دیر لگے گی۔" کلینر نے بلند

آواز میں صور پھونکا۔ گو کہ سب سمجھ ہی گئے تھے۔

سواریاں سب اتر گئیں۔ مرد خواتین کے نام پر اگلی سیٹ پر ایک بوڑھی سماعت سے محروم عورت۔ فجر سے پوچھتی رہی۔ "گڈی کیوں رک گئی۔" اس کا ساتھی مرد تو اسے کچھ بتا کر اتر گیا تھا۔ جو اس نے سنا نہیں تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی وہاں سگریٹ پان والے۔ شربت والے' چاکلیٹ ٹافی جوس والے۔ پھل والے۔ جمع ہو گئے۔ لمحہ بھر میں ہی.... نہ جانے کہاں چھپے ہوئے تھے۔

اثر کی بن آئی۔ کبھی جا کر چاکلیٹ ٹافی لاتا۔ کبھی جوس کے پیکٹ کبھی چپس.... وہ غصے میں اس سے جھپٹتی اور کھاتی رہی۔ حتیٰ کہ سوکھے مارے کیلے جو لایا۔ وہ بھی کچر کچر چبا گئی۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں بھی اثر کو گھور کر دیکھا۔ وہ لاپروائی سے بڑی بی کو بلند آواز میں حالات حاضرہ سے باخبر کر رہا تھا۔ حسب عادت پھر کہیں غائب ہوا۔ آخر لوگ آ آ کر بیٹھنے لگے۔ بڑی بی نے پوچھا۔

"گڈی ہوا ہو گئی۔"

فجر نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ وہ اچھل پڑیں۔

"میرا منڈا۔ میرا منڈا کدھر گیا۔ کتھے رہ نہ جاوے۔ وے میرے منڈے نوں۔"

"خیر منڈا آگیا۔ جوان جہان۔"

بس اسٹارٹ ہو گئی۔ بچی ہوئی سواریاں دھما دھم چڑھنے لگیں۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی دیکھ کر مونچھوں پر بل دیتے کئی لوگ بیٹھنے کو ہوئے۔ اس نے پرس رکھ کر سیٹ خالی نہیں ہے کا تاثر بھی دیا۔ پھر بھی کوئی کن اکھیوں سے دیکھتا۔ جائزہ لیتا گزرتا وہ بھنا کر کہہ دیتی۔

"پیچھے جاؤ اپنی سیٹ پر۔" گھورتا ہوا چلا جاتا۔ ڈرائیور سے شکایت کرنی چاہیے۔ مگر بس خاصی آگے بڑھ چکی تھی۔ سرکتی ہوئی۔ جب اثر ایک پھولا ہوا شاپر لیے آیا۔ نہ جانے کیا لے آیا تھا اب۔ (شاپنگ تو خوب کرائے گا۔ جل کر سوچا)

اپنی سیٹ پر رکھا پرس دیکھ کر مسکرایا۔ فجر نے پھرتی سے پرس جھپٹ لیا بیٹھ گیا۔

"حج کر کے آئے تھے بڑے میاں۔ جاء نماز لیے بیٹھے تھے۔ میں نے اماں جان اور بی اماں کے لیے لے لیں۔ تمہارے لیے بھی لے لوں۔"

ہائے معصومیت بس نے اسپیڈ پکڑی نہیں تھی مگر آگے بڑھ رہی تھی۔ ابھی میں کہہ دوں ہاں بھاگتا ہوا جائے گا۔ بڑے میاں کے سامنے جو بھی جیسی بھی جاء نماز کھسوٹ کر (دیکھے بغیر) پیسے پھینک کر دوڑ لگائے گا۔ بس کی طرف جب اسپیڈ پکڑ چکی ہو گی۔ چیخیں مارتا۔ "روکو ارے روکو بھئی۔ او بس والے میں رہ گیا ہوں بھائی۔" خاصا مزاحیہ سین ہو گا۔ مسکرائی۔ اے کاش۔ مگر (جھرجھری) اتنے عجیب عجیب اجنبی مونچھوں والوں کے ساتھ اور سیٹ خالی دیکھ کر کوئی مونچھ مروڑتا آ کر بیٹھ ہی گیا۔ تب (مرد کا تو سایہ بھی تقویت کا باعث ہوتا ہے) نفی میں سر ہلا دیا۔ گھبرا کر۔ مزاحیہ سین کے نظارے سے نکل آئی۔ وہ بھی آفت ہنس رہا تھا۔

"اب اتنا بھی احمق نہیں بنا۔ نہ مجنوں ہوا ہوں۔ کہ آپ کے اشارہ کرتے ہی۔ چھلانگ لگا کر بس سے کود کر بھاگوں گا۔ اور جاء نماز جھپٹ کر۔ پیسے پھینک کر دوڑ لگاؤں گا' بس کے تعاقب میں کہ ارے بھائی روک' روک مجھے پکڑ.... اور بس دور ہوتی جائے گی۔ پھر تمہارے ساتھ کوئی اکھڑ دیہاتی پکڑا باز آ کر بیٹھ جائے گا۔ کیسا پرلطف سین ہو گا۔" سر اونچا کر کے قہقہہ لگایا۔

وہ کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ مرد کا سایہ۔ اپنے مرد کا.... مسخرے کا؟

آج تین سال گزرنے کے بعد بھی۔ اس سفر کی یاد آتے ہی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ اثر سے چاہے جتنا بھی مضبوط بندھن تھا۔ مگر تعلقات بہت معمولی تھے۔ اماں جان سے ملنے کئی بار اس کی موجودگی میں آیا۔ مگر ایک یا دو دن رہا۔ امریکہ بھی جانا پڑا۔ شنو پھپھو کچھ بیمار ہوئیں۔ پھر ان کے شوہر۔ شنو پھپھو آ نہ سکیں۔ نہ تو اثر نے روابط بڑھائے۔ نہ وہ آگے بڑھی۔ اماں جان

کے ہاں لاڈلی بیگم کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لیے وہ حتی الامکان اثر کا سامنا نہ کرتی۔ وہ بھی محتاط رہتا اس بارے میں، جب وہ اسے اسٹیشن لا کر ٹرین میں بٹھا رہا تھا۔ باقاعدہ بزرگی طاری کیے رہا۔

وہ ایک دن ٹھہر کر اثر کے ساتھ آسکتی تھی۔ مگر لاڈلی بیگم اور ماموں کے سلوک کے بعد۔ ان کا سامنا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

سفینہ پھپھو نے اس سے مل کر پرانی رنجش دور کر دی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا اقصیٰ بھی اس واقعے کو بھلا چکی ہے یا نہیں۔ اب جبکہ اس کی شادی بھی طے ہو گئی تھی۔ اس کی مرضی بھی تو اس میں شامل ہو گی۔ بی اماں سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تین سال میں وہ تو اقصیٰ کو معاف کر چکی تھی۔ اب سفینہ پھپھو دعوت دے گئی ہیں۔ تو دیکھنا چاہیے۔ اب بھی وہ اسے دوست سمجھتی ہے یا ادنیٰ نوکر جتنی حیثیت۔۔۔ اس کے منگیتر کی تصویر ہی دیکھ لے۔

"بی اماں! پھپھو کے گھر چلیں؟"

"اثر کے ساتھ چلیں گے۔ ذرا صبر کرو۔"

"چچا کے ساتھ چلیں۔ کوئی بات ہوئی تو۔ وہ سنبھال لیں گے۔ کیا کسی خطرے کا ڈر ہے؟"

وہ تو سمجھتی تھی۔ اقصیٰ اور حمزہ اپنے منگیتروں میں مگن ہوں گے۔ اتنے دن بعد تو انسان ساری رنجش بھلا دیتا ہے۔ سفینہ پھپھو کی طرح انہوں نے خود ہی تو کہا تھا۔ اگر اثر نہ بھی ہو تو کیا ہو جائے گا، چچی نے مخالفت کی۔ "اثر کے بغیر جاؤ گی تو وہ سمجھیں گے اثر نے اللہ نہ کرے۔ تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ جس کی بہن بھائی کی کوشش ہے اور تمنا بھی۔ اس لیے اماں کی بات مانو۔"

عشا، ندا نے بتایا۔ "اب اثر بھائی اپنے گھر رہتے ہیں۔ بڑا خوب صورت گھر بنایا ہے۔ اکیلے رہتے تھے۔ اب سرونٹ کوارٹر میں فیملی آگئی ہے۔ میاں چوکیداری اور مالی کا کام کرتا ہے۔ بیوی کھانا پکاتی ہے اور صفائی کرتی ہے۔ پھپھو نے اب تک گھر نہیں دیکھا۔ جب آئیں گی۔ تو ان کا اور فروا، سحا کے کمرے کھلیں گے۔"

"اور سفینہ پھپھو نے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ حمزہ بھائی کی اثر بھائی سے لڑائی ہوئی تھی۔ تو پھپھو تو ان سے نہیں ملتیں۔ اثر بھائی ان سے جا کر مل آتے ہیں کبھی کبھی۔ جب حمزہ بھائی کہیں گئے ہوں۔ دوسرے شہر تو۔" "اثر سے لڑائی تو پھر حمزہ نے ابھی تک۔"

چچی نے بتایا "تم آگئیں۔ اچھا ہو گیا شنو آپا کا پتا نہیں۔ مگر اماں تمہاری رخصتی میں دیر نہیں کرنا چاہتیں۔ ویسے بھی دیر ہو چکی ہے۔ شنو آپا کے میاں کب صحت یاب ہوں گے کب وہ آئیں گی۔ ایک کام ہونا ہے۔ تو ہو ہی جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی سازش۔۔۔ ارے کچن کی خبر ہی نہیں۔ دیکھ کر آؤں۔"

"لو۔۔۔ میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔ جلدی کاہے کی ہے۔ اثر نے تو کبھی۔۔۔ ذکر نہیں کیا۔ اماں جان سے تو کہتا۔ وہ فوراً" بغیر کسی بارات کے رخصتی کروا دیتیں۔ اکیلا۔۔۔ گھر میں کتنے لوٹتے ہوں گے۔ کیا گھرداری کرے گا۔ اور میں تو بالکل کچھ نہیں کروں گی۔

گاڑی تو شاندار ہے۔ واہ بھئی تین سال میں اتنی ترقی! اسٹیشن آنے تک چند جملے ہی بولے۔ وہ تو غصے میں لاڈلی بیگم کے بخیے ادھیڑ رہی تھی۔ اور وہ غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ آرام سے، ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں ہم کسی کی فطرت بدل نہیں سکتے۔ سب مختلف مزاج کے ہوتے ہیں۔۔۔ پروا نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ جلد بازی نقصان دہ ہوتی ہے۔۔۔ غصہ کسی مرض کا علاج نہیں۔ بہت سوچ کر سمجھ داری سے۔۔۔ حماقت سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے اور جلد بازی حماقت کی وجہ بن سکتی ہے۔"

اس وقت تو وہ مشتعل تھی۔ اثر کی مختصر نصیحت پر اور بھی۔۔۔ گھر سے نکلتے ہوئے آنسو بہہ رہے تھے سڑک پر کھڑی رو رہی تھی۔ اثر کو دیکھتے ہی۔۔۔ بے بسی کا احساس جاتا رہا۔ مرد کا سہارا۔ اتنا مضبوط ہوتا ہے؟ گو کہ وہ خود کو بہت بہادر سمجھتی تھی۔ شاید اشتعال

کمزوری کی علامت ہو۔
"بی اماں۔ صبح چلیں؟ ان بادشاہ سلامت کا کب تک انتظار کریں گی۔" (پتا تو چلے اقصیٰ کی مزاجی کیفیت)
"ٹھہر جاؤ۔ صبر کرو۔ میں کوئی نیا قصہ نہیں چاہتی۔ برداشت نہیں ہے مجھ میں اب۔ غصہ آگیا تو کچھ کہہ بیٹھوں گی۔ چاہے بعد میں پچھتانا پڑے۔"
"ہیں؟ کیا کہہ بیٹھیں گی۔" وہ گھبرائی۔
"سفینہ سے تعلق توڑلوں گی۔ زندگی بھر کے لیے۔ بہت کچھ سن رہی ہوں۔"
"ارے نہیں میری وجہ سے بالکل نہیں اور بی اماں۔ غصہ حرام ہے یہ کسی مرض کا علاج بھی نہیں۔" بے خیالی میں اثر کی کہی بات دہرادی۔ یاد آیا تو زبان دانتوں تلے دبائی۔ اسٹیشن پر یہی بربڑا رہا تھا۔
"اب سوچ رہی ہوں۔ اثر کا گھر بھی اللہ رکھے بن گیا۔ تو بس..." رک گئیں کچھ کہتے کہتے۔
"بس کون سی بس۔ اچھا بس بھی لے لی محترم نے ... شاہزادے ٹھہرے بھئی۔" بربڑا کر بولی آخری جملہ۔
"اللہ چاہے گا۔ تو بس بھی لے لے گا۔" اطمینان۔
"اور اس میں ... بٹھائیں گے کس کو لاڈلے نواسے۔ آپ کو؟" دانت پیس کر (ترقی بھی ترقی) وادی ہنس پڑیں۔ اسے پکڑ کر کہا "آپ کو۔" وہ سٹپٹا گئی۔
"میں آ ئیں کیوں میرا کیا تعلق۔"
"سب سے بڑھ کر۔ سب سے زیادہ۔ سب سے بڑا تعلق۔ سب کچھ۔"
"آپ کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ میں نے ہر تعلق سے دست برداری اور طلاق دے دی تھی۔"
"فضول باتیں مت کرو۔ خبردار آئندہ یہ لفظ منہ سے نکالا۔ عورت کو ایسا حق ہے نہ اختیار۔"
"اللہ نے تو مرد عورت کو برابری کا درجہ دیا ہے۔ تو یہ اختیار صرف مرد کو کیوں؟"

"کیونکہ پھر تم جیسی بے وقوف کم علم لڑکیاں۔ اسی طرح احمقانہ فیصلے کرتیں۔ میں تو چاہتی بھی نہیں۔ کہ تم سفینہ کے گھر جاؤ۔ اقصیٰ کو ملنا ہو گا تو آجائے۔ مگر اس نے بھی یہاں آنا بہت ہی کم کردیا ہے۔"
"میں تو اقصیٰ کو منگنی کی مبارکباد... بی اماں۔ مجھے جانا چاہیے ناں... پھر وہ جیسا چاہے۔"
بی اماں چپ رہیں۔ ٹالنا چاہتی تھیں۔ لیکن احمق لڑکی۔
"کہاں شادی ہو کر جائے گی؟" پوچھ لیا۔
"فیصل آباد۔ لڑکے کا کپڑے کا کاروبار ہے۔" کاروبار کا سن کر فجر کی چیخ نکل گئی۔
"اوئی بڑا کاروبار ہے۔ اس میں چیخ مارنے کی کیا بات ہے۔ بہت لاڈلا ہے ماں باپ کا اور وہ ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ باقی کے چھ بھائی الگ گھروں میں رہتے ہیں۔"
"لاڈلا تو ہو گا ہی۔ جب ماں باپ کو اسی کے ساتھ رہنا ہے۔" چھ بھائی اور وہ۔ لاڈلا۔
"اقصیٰ کے سامنے کوئی بات نہ کرنا۔ وہ فیصل آباد کے نام سے چڑ جاتی ہے۔"
چچی نے بھی بتایا کہ وہ فیصل آباد سے لاہور نہیں بلکہ کراچی شفٹ ہونے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ ماں باپ کسی اور کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ وہ تو اب بیوٹیشن کورس کر رہی ہے۔ ڈانس سیکھ رہی ہے۔ فیصل آباد میں تو اپنے ہنر کا مظاہرہ نہیں کر سکے گی۔ اور اصل قصہ ساس سسر سے چھٹکارا بھی ہے۔"
ڈانس تو اقصیٰ پہلے بھی کرتی تھی۔ خاندان کی شادیوں میں، دوستوں کلاس فیلوز کی شادیوں میں فجر کو ڈانس پسند نہ تھا۔ ہاں وہ گانے خوب گاتی تھی۔ اماں جان کی صحبت میں رہ کر اور بھی شوق ہو گیا تھا۔ ان کی فرمائش پر اکثر انہیں سناتی تھی۔ ان کو گاتے دیکھ کر ٹوکتی تھی۔
"اماں جان۔ دیکھیے منیبہ۔ اس طرح کا گانا بھی سیکھ لیں۔ یاد رکھیے۔ پنجابی گیت وہ بھی پرانے تصوف کی جھلک لیے ہوئے ہمیشہ بہت مقبول رہے۔ آپ پتا

نہیں کس صدی کے پورلی اکالتی ہیں۔"

"اور تم نے جانے کو نبی جنابی زبان۔ خیر خفانہ ہو۔ سناؤ بھئی ہار نہیں آؤ گی۔ پتا ہے مجھے۔"

"اچھا تو سنیے۔ ہاہا کیا سر ہے۔ کیا الفاظ ہیں۔ مزا آجاتا ہے۔" گانے کا سوچ کر جھومنے لگی تھی۔ میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں۔

میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں

میں توپیر مناون چلیاں

ڈاچی والیا موڑ مہار وے

میرے ہتھ کٹورا اے ماں گادا

میری ہتھ کٹورا اے ماں گادا

میرا پیرولی انہاں راہواں وا

شاہ والیاں پیراں۔ پیراں ہو۔ پیراں

بے خیالی میں آواز اونچی ہو گئی۔ چچی تالیاں بجاتی آئیں تو خیال آیا۔ وہ ساہیوال ہی نہیں۔ لاہور میں ہے۔

"واہ فجر۔ تم تو آج کل کی تمام نئی سنگرز سے زیادہ اچھا گاتی ہو۔ کچھ اور سناؤ۔ القصیٰ کاڈائس ہو۔ تمہاری آواز زبردست مگر۔"

وہ فوراً جوش میں آگئی "سچ چچی؟"

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کاروباری لحاظ سے کہہ رہی تھی۔ گانوں کی وڈیو بنتی ہیں۔ بہت بکتی ہیں۔ مگر القصیٰ بہت اونچی چیز ہے اور تم خیر کچھ اور سناؤ خالہ جان والا کوئی گیت۔"

چچی اماں جان کے قصے بہت شوق سے سنتی تھیں۔ اماں جان.... فجر کو بہت یاد آئیں۔ مسکرادی۔ اچھا سنئے۔

"میں نے رات کھرا خوب سنا رے

میں نے رات کھرا خوب سنا

ساس ہماری کہہ گئی تھیں

بہو چولھے پہ ہانڈی چڑھادیجوری

میں سیدھی سادی میں بھولی بھالی

سیاں کو چولھے پہ بٹھا آئی رے

میں نے رات کھرا خوب سنا رے

ساس ہماری کہہ گئی تھیں

بہو بکری کو کھونٹے سے باندھ دیجوری

میں سیدھی سادی میں بھولی بھالی

سسر کو کھونٹے سے باندھ آئی رے

میں نے رات کھرا خوب سنا رے

ساس ہماری کہہ گئی تھیں

بہو مرغی کو ٹاپے میں بند کر دیجو

میں سیدھی سادی میں بھولی بھالی

نندیا کو ٹاپے میں بند کر آئی

میں نے رات کھرا خوب سنا رے

میں نے رات کھرا....

"ہائے" اللہ چچی کو ہنسنے کا موقع دے کھلکھلا رہی تھیں۔ "اور بھی سناؤ فجر۔"

"واہ.... آپ کو مزا ہی پڑ گیا۔ خیر سنیے؟"

سرو نا کہاں بھول آئے پیارے نندویا۔

ساس ہماری پان کھائیں چھالیا نندویا

میں بچاری الائچی چابوں چونا چاٹے سیاں

سرو نا کہاں بھول آئے

ساس ہماری مسہری پہ سوئیں۔ تخت پہ نندیا

میں بچاری چھپر کھٹ لیٹوں۔ نیچے سوئے سیاں

سرو نا کہاں

"ارے بھئی یہ سیاں بچارا.... ایسا کیوں تھا؟ اور نند کہاں تھی۔ توبہ فجر ہائے میں کچن دیکھوں۔" دوڑ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ادھر فجر کو سفینہ پھپھو کے گھر جانے کی ضد۔ ادھر بی اماں کو بغیر اثر کے جانے پر اعتراض۔

پھر ایک دن صبح ہی تشریف آوری ہوئی۔ ناشتا کر کے آفس روانہ کام کی زیادتی مصروفیت کا بہانہ کئی دن یونہی گزر گئے۔ پھر چچی کو یاد آیا۔

"ارے ہاں۔ تمہاری دوست عنبرین آئی تھی۔ تم بھی تو کسی کو خبر دیے بغیر۔ روانہ ہو گئیں اور وہاں جاکر کسی سے رابطہ بھی نہیں کیا۔"

فجر اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگئی۔ چچی اسے ہنسی کا کول گپا کہتی تھیں۔ عنبرین سیدھی سادی بلکہ کچھ زیادہ ہی سادہ تھی۔ بے وقوف۔ اس کی باتوں پر سب بہت ہنستے تھے۔ چالاکی تھی نہیں اس میں۔ ایسے لوگ زیادہ ہی مشکل میں رہتے ہیں۔ اور وہ بچاری یتیم تھی۔ نانا کے گھر رہتی تھی ماں کے ساتھ۔ ان کے خاندان میں لڑکی کی پیدائش پر باقاعدہ سوگ منایا جاتا تھا۔ عنبرین اور اس کی بیوہ ماں کے ساتھ نانا کے گھر میں نوکروں جیسا سلوک ہوتا تھا۔ اس لیے وہ بھی سہمی ہوئی رہتی تھی بوکھلائی ہوئی۔ سوال کچھ کرو۔ جواب مختلف۔

فجر کی اس سے اسکول سے دوستی تھی پھر کالج میں بھی ساتھ رہا۔ بہت نیک صورت اور شریف تمیزدار۔ عنبرین سے ملنے کو جانا چاہیے 'سوچا اور پروگرام بنالیا۔ چچی نے کہا" بابا رمضان رکشے والا عنبرین کے محلے میں ہی رہتا ہے۔ سامنے ہی آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے جانا ہو یا لڑکیوں کو۔ اسی کے رکشے پر چلے جاتے ہیں۔"

فوری پروگرام طے ہوا۔ عشاندا کی چھٹیاں تھیں۔ بابا رمضان کو بلایا گیا۔ تینوں بیٹھ گئیں۔ جانے سے پہلے بی اماں حسب عادت بابا کو نصیحت کرنا نہ بھولیں۔

"تیز نہ چلانا۔ چاہے یہ جتنا بھی کہیں اور وہاں چھوڑ کر کسی اور سواری کے لالچ میں نہ چل پڑنا۔ واپس لے کر آؤ گے۔ تو ڈبل کرایہ دوں گی۔"

اب بابا جی بھلا کاہے کو اسپیڈ پکڑیں۔ نصیحتوں کی گٹھڑی جو کندھوں پر دھری تھی۔ ڈبل کرایہ الگ۔ مجال تھی کہ گٹھڑی کو اس کندھے سے اس کندھے ہی سرکا دے۔

"اس سے تو پیدل ہی چلے جاتے۔" عشا نے اسے ورغلانا چاہا 'مگر نہ جی۔ بابا رمضان 'موج میں آکر تان اڑا رہے تھے۔ میرا لال دوپٹا ململ دا۔

"ارے ابا دیکھیں یہ سامنے کالے گیٹ والی کوٹھی۔ اثر بھائی کی ہے۔ بابا جی ذرا ایک دو منٹ کو روکیں۔ ابا چلیں اندر چلتے ہیں۔" بابا جی کو پیاس لگی تھی۔ گیٹ کے باہر نلکا دیکھ لیا۔ فوراً" رک گئے۔ بڑی بیگم کا کوئی جملہ ایسا یاد نہ آیا۔ جس میں راستے میں نہ رکنے کا اشارہ ملا ہو۔

تینوں گیٹ میں جا گھسیں۔ واہ' ہریالی' پھولوں کے لاتعداد پودے لان کی سبز گھاس اور پورچ پر چڑھی ہوئی آئیوی کی بیل۔ ملازمہ ہنستی ہوئی آئی۔ پہچانتی تھی' عشاندا کو۔ فجر تو لان کی بہار میں گم تھی۔

"کمرے تو سارے بند ہیں جی۔ آئیے۔ لاونج میں' میں ٹھنڈا لے کر آتی ہوں۔" بہت مہمان نواز تھی۔ مگر فجر نے انکار کر دیا۔ لان ہی اچھا تھا۔ باہر سے تو سجا اچھا ہی لگا۔ بابا رمضان نے نلکے سے نہ صرف اپنی پیاس بجھائی۔ بلکہ رکشہ بھی دھو دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عنبرین کی خوشی دیدنی تھی۔ فوراً" فجر کا ہاتھ پکڑ کر نانی کے پاس لائی۔ بہت ہی ضعیف ناتواں خاتون تھیں۔ فجر نے بیکری سے کافی بسکٹ وغیرہ اور کیک لے لیا تھا۔ کیک نانی کی نذر کیا۔ بسکٹ کا شاپر عنبرین کو دیا۔ وہ چائے لینے چلی گئی۔ نانی فجر سے باتیں کرنے لگیں۔

"عنبرین کی اگلے مہینے شادی ہو رہی ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "لڑکا اولاد کی خاطر شادی۔ کر رہا ہے۔ بیوی ہی کر دار ہی ہے۔"

فجر دنگ ہوگئی۔ عنبرین کی اماں آئیں۔ ان سے فجر نے پوچھا۔

"کیوں کر رہی ہیں بڑی عمر کے مرد سے شادی۔ عنبرین کے ساتھ ظلم ہے۔ اسے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ شکل کی بھی اچھی ہے۔ نانی نے بتایا کہ اسکول ٹیچر ہے۔ اپنا کماتی ہے۔ پھر۔" عنبرین کی اماں سنجیدہ ہو گئیں۔ تبسم غائب۔

"کون کرے گا اس کے.... باپ نہ بھائی۔ جہیز کے نام پر چھلا نہیں۔ کپڑے کے نام پر ٹانکا نہیں۔ لوگ گھر دیکھتے ہیں۔ پوزیشن۔ اس عورت کی مہربانی ہے کہ عنبرین کو سوکن بنانے پر تیار ہوگئی۔ بہت شوق سے۔ چلتا ہوا اسٹور ہے۔ اپنا ذاتی گھر ہے بڑا سا۔ میرا.... میرا

بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔ راضی ہیں مجھے ساتھ رکھنے پر۔"

انہوں نے گلوگیر آواز میں اپنی مجبوری کی داستان سنائی۔

"اماں کی زندگی تک تو میں یہاں ہوں' پھر ان کے بعد بھائی کیوں رکھیں گے۔ ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کریں گے۔ پھر خوف ہراس پریشانی۔

"لیکن آپ کے بھائی وہ کیوں آپ کو نکالیں گے' آپ ان کی بہن ہیں۔"

"بہن بھائی سب اپنے مفاد کے لیے برداشت کرتے ہیں۔ اماں کی خدمت گھر کے کام کرتی ہوں۔ مگر اعتراض' نکتہ چینی اور احسان.... یہ صلہ ملتا ہے۔ اماں کا سہارا نہ رہا تو دو روٹی کا آسرا بھی گیا۔"

عنبرین منگنی کا جوڑا دکھانے لائی۔ گلابی کامدار۔ انگوٹھی بھی اچھی تھی۔ بہت خوش تھی۔

فجر نے چپکے سے پوچھا۔ "تم بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ خوش رہو گی؟"

"میری خوشی کیا۔ اور غم کیا؟ عمر سے کیا ہوتا ہے۔ گھر کی چھت اور عزت.... اس کے سوا کچھ نہیں۔" وہ خاصی سنجیدہ اور مطمئن تھی۔ "اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اپنی جاب چھوڑوں گی نہیں۔ تنخواہ امی کو دوں گی۔ تاکہ وہ اپنا خرچ اٹھائیں۔ وہ راضی ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ یہاں گھر ہے۔ چھت ہے۔ عزت نہیں۔ تنخواہ۔ ماموں لے لیتے ہیں۔ پھر بھی ہم بھکاریوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔"

شاید۔ عنبرین اور اس کی ماں کا فیصلہ درست ہو۔ اللہ کرے ایسا ہو۔ وہ فکرمند تھی۔

"دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسا ہے۔ عزت کے ساتھ بیوگی کا زمانہ گزار دیا۔ بڑھاپا بھی انشاء اللہ بیٹی کے سہارے اللہ کی مدد کے ساتھ گزار لوں گی۔"

عنبرین کی اماں پر امید تھیں۔ فجر نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر جتنی رقم تھی نکال کر اماں کے ہاتھ میں دے کر مٹھی بند کر دی۔ وہ انکار کرتی رہیں۔ ایک ممانی بھی آکر کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ عنبرین کی اماں کے چہرے پر بڑا سکون اور خوشی کی سرخی آگئی۔ عنبرین باہر تک آئی۔ شکریہ ادا کیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"اچھے لوگ ہیں وہ کہہ رہے تھے۔ ماؤں سے خرچا لیا نہیں جاتا۔ گھر میں.... ماں کی طرح رہیں گی امی۔ بس.... میں بے فکر ہوں۔ تم بھی فکر نہ کرو۔"

☆ ☆ ☆

بھاری دل کے ساتھ گھر آئی۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہ چاہا۔ کمرہ بند کر کے لیٹ گئی۔ وسوسے' افسوس' اتنی مجبوری۔ کیسے بھائی ہیں۔ دنیا۔ خون کے رشتے۔ خود غرض' مفاد پرست۔ خدا سے بھی نہیں ڈرتے۔ بائیس تیئس سال کی لڑکی پینتالیس برس کا مرد۔ بیس سال ایک بیوی کے ساتھ.... بیس سال گزار کر اولاد کے لیے۔ شادی کر رہا ہے اور لڑکی خوش ماں مطمئن' سہارے کی تلاش.... بے بسی لاچاری۔ ماں کی خاطر قربانی۔ نہ جانے ایسے کتنے کردار ہیں دنیا میں۔ کاش کوئی بے آسرا نہ ہو۔

اندھیرا پھیل گیا۔ مغرب ہو گئی۔ نماز پڑھ کر باہر آئی۔ چچی نے بتایا۔

"اثر آیا تھا۔ تم سو رہی تھیں۔" وہ کب سوئی۔ رو رہی تھی۔ عنبرین کے لیے دعا کرتی رہی۔

"عشا بتا رہی تھی عنبرین کی شادی بڑی عمر کے مرد سے ہو رہی ہے۔ چلو ماں بیٹی کو ٹھکانہ مل جائے۔ ورنہ دنیا بہت خراب ہے۔"

دادی کو مگر سن کر افسوس ہوا۔ "اور اگر دوسری سے اولاد نہ ہوئی تو تیسری کرے گا کیا؟"

"تم انھیں سے ملنے نہ جاؤ تو اچھا ہے۔" چچی نے مشورہ دیا۔ "اثر بھی گھبرا رہا ہے جاتے ہوئے۔"

"کیوں چچی؟" چونک گئی۔ عنبرین کے غم سے باہر نکلی۔

"حمزہ کی بدزبانی اور فضول بکواس سے سب ہی تنگ ہیں۔"

"کیا؟ اب بھی؟" وہ حیران ہو گئی۔

"ہاں' اب بھی۔ کئی دفعہ اثر سے منہ ماری کر چکا ہے۔ وہ تو اثر ہی ہے۔ جو نہ صفائی دیتا ہے۔ نہ اس کی بدتمیزی کا جواب۔ تم اقصیٰ کو فون کر کے مبارکباد دے دو۔ اس کے مزاج کا پتا چل جائے گا۔"

فجر کو یہ مشورہ پسند آیا۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔

دو تین دن کے بعد آخر ہمت کر ہی لی۔ اقصیٰ نے ہیلو کہا فجر اچھل پڑی۔ عرصہ بعد اس دوست سے بات۔ جو کبھی اسے بے حد عزیز تھی۔ "اقصیٰ میں فجر۔"

"اچھا' اچھا بولو۔" ہمت شکن لہجہ تھا۔ مگر وہ سننا چاہتی تھی۔

"میں آ گئی ہوں۔ تمہیں شادی کی مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔"

"شکریہ۔ امی سے بات کرو۔" مگر لائن کٹ گئی۔

دوبارہ نمبر ملایا۔ انگیج ملا۔ خوش ہو کر چچی کو بتایا۔ "بات تو کی یہ کم ہے شکریہ کہہ رہی تھی۔ اف اپنی شادی سے خوش ہو گی۔ تین سال پہلے کا واقعہ بھول گئی ہو گی۔ شادی کی خوشی میں پرانی بات کو بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

"چلو۔ یہ کافی ہے۔ شادی کا بلاوا آئے تو چلی جانا۔"

"نہیں۔ اب تو مجھے جانا ہو گا۔ ورنہ وہ کہے گی میں نے دکھاوے کے لیے فون کیا ہے۔"

"نہیں کہے گی اور کہے گی تو کہنے دو۔ سن لینا۔ لیکن حمزہ جو اثر کو سنائے گا۔ وہ تمہیں اچھا لگے گا نہ اثر کو۔ خصوصاً" تمہاری موجودگی میں۔ ویسے بھی وہ کہتا پھرتا ہے کہ۔۔۔ حمزہ کے حق پر اثر نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ ورنہ فجر تو بچپن سے حمزہ کو چاہتی ہے۔ اثر نے خبر ہی نہ ہونے دی۔ پوشیدہ نکاح کر لیا۔"

"ہائیں! اچھی جھوٹ۔۔۔ اور اچھا اگر ایسا تھا تو کیا میں ان حضرت کے آگے ہاتھ جوڑتی کہ مہاراج۔ حضور مجھے قبول کریں۔ پہلے ہی کیوں نہ قدم بڑھائیے۔"

الزام۔۔۔ غصہ سے آگ بگولہ ہو گئی۔ بزدل ویسے۔ اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "بات پرانی ہو گئی۔"

"پڑتا ہے فرق۔ لڑکی پر ہر حال میں۔ خواہ وہ شادی شدہ بچوں کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ عجیب بات تھی۔ یہ حیثیت ہوتی ہے عورت کی۔ تہمت الزام' بہتان کسی بھی پاک دامن کو۔

"دیکھو۔ کوئی بات تواتر سے کہی جائے۔ تو اثر ہو سکتا ہے۔ اور مرد کو غصہ آ جائے۔ یا شک بہت ہی خطرناک ہے یہ شک۔ میں تم کو الزام نہیں دے رہی۔ اثر سن کر۔۔۔ غیرت مند مرد بہت جلد بھڑک اٹھتا ہے۔"

"میرا دل صاف ہے۔ اور اثر کا بھی تو مجھے حمزہ کا ڈر ہے نہ اقصیٰ کا۔"

وہ نہیں جانتی تھی۔ زمانہ کتنا خراب ہے اور ابھی تو ایک عمر باقی ہے۔

"نہ جانے اور کتنا نقصان اٹھائے گی یہ لڑکی۔" چچی سوچ کر رہ گئیں۔

خاندان۔ دوستی' خون کے رشتے۔ آزمانے میں حرج کیا ہے۔ جستجو۔۔۔ اپنا دل صاف ہے تو ڈر کیا۔

☆ ☆ ☆

پھپو کا وہ شاندار بنگلہ۔ جوں کا توں۔ مزید ترقی یافتہ۔ بی اماں کو اثر پکڑ کر لا رہا تھا۔

فجر نے باہر سے ہی آواز لگائی۔ "اقصیٰ! پھپو! میں آ گئی" اقصیٰ اور اس کے پیچھے گھبرائی ہوئی پھپو باہر آ رہی تھیں۔ مگر یہ کیا۔

کیوں آئی ہے' یہ میرے گھر آنے کی ہمت کیسے ہوئی اسے۔ امی' میں نے آپ کو کہا تھا۔ اسے روکیں۔ "وہی غصہ وہی آواز وہی اشتعال۔ وہی انداز فجر اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ بی اماں بھی اقصیٰ کے چہرے کے بگڑتے زاویے۔ چیختی ہوئی آواز۔

"دشمن' دشمن ہے میری۔ مذاق اڑانے آ گئی۔۔۔"

پھپو اقصیٰ کو اندر کھینچ رہی تھیں۔ اور اوپر سے لپکتا ہوا حمزہ۔۔۔ فجر کی طرف بڑھا۔

"اوہو۔ آ گئیں۔" تمسخرانہ لہجہ تھا۔ "لگتا ہے۔ نانی نے بھی نکال دیا۔ وہاں کے کتنے لوگوں سے افیر

چلائے تھے۔ ظاہر ہو گئے ہوں گے' یہاں تو سب پردے ڈالتے تھے۔"

اثر نے پیچھے سے ہی آواز دی۔ "حمزہ چپ رہو۔"

"ارے اثر! تم.... مگر بہت ہی بے غیرت ہو۔ ساری داستان سنا دی۔ کس طرح میرے ساتھ چکر چلایا۔ کالج کے زمانے میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس کی تصویریں دکھائیں۔ پھر بھی شاباش۔"

بی اماں تھک گئی تھیں زور سے چلائیں۔ "حمزہ! خبردار اب اگر ایک لفظ منہ سے نکالا۔ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی۔ بے حمیت' بے غیرت۔ تجھے کوئی شرم ہے....."

حمزہ ہنسا۔ "بی اماں زبان کیا کھینچیں گی۔ آپ میری انگلی ہی کھینچ کر دکھا دیں۔ تو مان جاؤں۔"

اثر نے ڈپٹ کر کہا۔ "حمزہ حد میں رہو۔ کس سے بات کر رہے ہو۔ اندر آنے دو۔"

"کیا؟ میں حد میں رہوں۔ اور تم اس رسوائے زمانہ چلتی پرزہ کے ساتھ عیش کرو۔ واہ یہ مردانگی ہے؟ ہاں مگر ایسی لڑکیاں پھر اسی لیے ہوتی ہیں۔"

کیا الفاظ تھے بم شور آگ کا سیلاب.... اثر تیزی سے آگے آیا۔ اس کا چہرہ اسی آگ میں دہک گیا تھا۔ آتے ہی حمزہ کو زبردست مکا رسید کیا۔ حمزہ لڑکھڑایا۔ ایک اور مکا اور دھکا۔

"الفاظ واپس لو اپنے۔ الفاظ واپس لو۔" سرد لہجہ برفانی آواز' مگر اس کا پورا جسم شعلوں کی زد میں تھا' حمزہ نے جھپٹنا چاہا۔ لیکن اثر میں آج ایسی طاقت آگئی تھی اور اب اس کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔ تابڑ توڑ مکوں نے حمزہ کو چکرا دیا۔ وہ زور سے زمین پر گرا۔

"الفاظ واپس لو۔ ورنہ یہیں قبر بنا دوں گا۔" یہ اثر تھا۔ یہ اس کا نیا ہی روپ تھا۔ اب حمزہ کی چیخیں اندر تک پہنچ گئی تھیں۔ نوکر آگئے اور دم بخود کھڑے تھے۔ حمزہ زمین پر اور اثر اس کے سینے پر اپنا پیر رکھے۔

"الفاظ واپس لو۔" حمزہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ رو رہا تھا' نہ جانے کہاں چوٹ لگی تھی۔ اثر آگ بگولہ بول رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟ اب کہو اس دن کیا کہا تھا۔ ہاں اور وہ تصویریں.... بولو سچ بولو۔ حمزہ۔" دہاڑ رہا تھا۔ یہ کون سا روپ تھا۔

کبھی تو اثر نے اونچی آواز میں کسی سے بات نہ کی تھی۔ آج' آج غیرت کا طعنہ نہ سن سکا۔

"حمزہ اپنے الفاظ واپس لو گے یا.... کچل دوں۔ بہت برداشت کر لیا۔ اب نہیں حمزہ۔"

اور چشم حیراں نے کیا دیکھا۔ حمزہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑے زمین پر گرا ہوا معافی مانگ رہا تھا۔

"میں ہاں میں الفاظ واپس.... ہاں وہ میں نے فجر کے ساتھ دوست کی تصویر کمپیوٹر سے بنوا کر.... آہ۔ بہت درد ہے۔ ای ہاں میں جھوٹ بولتا رہا۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ الزام لگایا تھا۔"

حمزہ اب چیخ رہا تھا۔ دم بخود سفینہ پھپھو اپنی ماں کے سامنے قصہ جو رک چکی تھی۔ اور نوکر سب کے سامنے.... اس امیر زادے نے اثر کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اثر نے اس کے سینے پر پیر کا دباؤ بڑھایا۔ اس کی چیخیں.... سفینہ پھپھو چیخی تھیں' مگر وہ اپنے بیٹے کو نہیں۔ اپنی ماں کو اٹھانے آرہی تھیں جو زمین پر گری ہوئی تھیں۔ بی اماں نے ان کا سہارا رد کر دیا۔ وہ چیخیں۔

"اثر! اماں گر گئی ہیں۔" اور اثر یک لخت ہوش میں آکر حمزہ کو چھوڑ کر پیچھے بھاگا۔ فجر زمین پر گھٹنوں میں سر دیے کانپ رہی تھی۔ اسے سفینہ پھپھو نے اٹھایا۔ اثر بی اماں کو اٹھا کر گیٹ کی طرف چلا۔

"فجر! چلو گھر چلتے ہیں۔" اور فجر مسمریزم کے اثر میں سوئی جاگی اس کے پیچھے چل دی۔ نوکر اب حمزہ کو اٹھا رہے تھے۔

سفینہ پھپھو بے بسی سے ماں کو ان کے پیاروں کے ساتھ جاتا دیکھ رہی تھیں۔ گاڑی میں بی اماں کو بٹھاتے ہوئے اثر نے فکر سے دیکھا۔

"تکلیف ہو رہی ہے؟ کلینک ہوتے ہوئے چلیں۔ فجر بیٹھ جاؤ۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت

نہیں۔ بہت دن سے سن اور دیکھ رہا تھا۔ ٹال جاتا تھا۔ مگر۔ بی اماں۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟ کوئی تکلیف ہو تو۔" فکر مند تھا۔

"ہاں بیٹا۔ میں ٹھیک ہوں۔ کمزور ہو گئی ہوں۔"

گھر آنے تک۔ ہوش اور بے ہوشی کا عالم طاری رہا۔ گھر میں سامنا کسی سے نہ ہوا۔ بی اماں کو بستر پر لٹا کر ان کو تسلی دے کر گم صم کھڑی فجر سے کہا۔

"دنیا میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اپنا ضمیر زندہ ہے اور دل صاف ہے۔ تو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ چلتا ہوں۔"

یوں جیسے کوئی عام بات ہو۔ اٹھا اور چلا گیا۔

فجر کو لگا۔ وہ مر گئی ہے۔ قبر میں لٹائی جا رہی ہے۔ تاریکی، جسم سن ہو رہا تھا۔ بی اماں ہمت سے کام لے رہی تھیں۔ مگر فجر گونگی ہو گئی تھی۔ یا بہری۔ اثر کی تسلی دلاسوں کے باوجود نیچے پاتال میں گرتی جا رہی تھی۔ ایسی زندگی اور یہ زندگی نہ تھی۔ اس طرح کا جینا اس نے کب سیکھا تھا جو وہ خوش باش۔ آزاد پنچھی۔ اس کے فخر کو کس نے آگ لگا دی۔ اس کے پرجوش مائل پرواز پر کسی نے کتر دیے۔ جسے وہ اپنا محبوب سمجھتی تھی۔

اب وہ کبھی بھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہے گی۔ سر جھکا کر۔ نظر چرا کر جینا آتا نہ تھا۔ مگر اب یہی کرنا تھا۔ خصوصاً "اثر کے سامنے۔ وہ اپنی صفائی میں کیا گواہی دے۔ اس کے وجود پر لگا ہوا بدنامی کا داغ کیسے دور ہو گا۔ حمزہ کے اپنا جرم تسلیم کرنے کے باوجود۔

وہ چچی کو گزری ہوئی واردات کے بارے میں بھی کچھ نہ بتا سکی۔ خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھتی رہی۔ چچی زیادہ تجسس نہیں کرتی تھیں۔ جانتی تھیں معلوم ہو ہی جائے گا۔

دادی اس کی ذہنی کیفیت جانتی تھیں۔ ان کی اپنی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ مگر کس طرح اسے معمول پر لائیں۔ کوئی جملہ، فقرہ کوئی نصیحت بھی کام نہ آئی۔ دو تین دن ایسے ہی گزر گئے۔ تو انہوں نے اس کو پاس بٹھا لیا۔

"اپنی اماں جان سے کب سے بات نہیں کی۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔"

فجر چونک گئی۔ بی اماں ٹھیک تو کہہ رہی تھیں۔ مگر آج اس پوزیشن میں وہ ان سے کیا بات کریں گی۔ گو کہ وہ منتظر ہوں گی۔ کوئی نئی خبر بھی ان کے پاس ضرور ہو گی۔ سنانے کے لیے بے قرار ہوں گی۔ رات بھر بے چینی رہی۔ نیند تو غائب ہی ہو چکی تھی۔ سوچنے کی صلاحیت بھی نہ رہی۔ کاش سماعت سے بھی عاری ہو جائے۔ نہ جانے ابھی اور کیا کیا سننا باقی ہے۔

بی اماں کے دوبارہ یاد دلانے پر صبح اس نے فون ملا لیا۔ ادھر سے گانے بلکہ چہچہانے کی آواز سنی۔ خوش لگ رہی تھیں۔ خود کو سنبھال کر اس نے کہا۔

"اماں جان۔ السلام علیکم۔" آواز بھاری ہو گئی۔ نہ جانے کس طرح بات کروں گی۔ آواز تو سب راز کھول دے گی۔

"ہاں فجر ارے میری جان۔ کل سے اس قدر یاد آ رہی ہے۔ کئی دن سے دل چاہ رہا تھا۔ آپ کو سب کچھ بتا دوں اور آپ سے آپ کی طبیعت کا پوچھوں۔"

"اماں جان آپ مجھے آپ کہہ رہی ہیں۔ کیا میں کہیں کی ملکہ ہو گئی ہوں۔" (ہاں بدنامی رسوائی کی)

"آپ بہت مصروف ہستی ہیں۔ ہم جیسے غریب غربا کو بھلا دیتی ہیں۔ اس لیے عزت احترام سے یاد دلا رہی ہوں۔ کہ محترمہ آپ کی ایک بچاری نانی بھی ہے۔"

اماں جان کی آواز میں طنز مگر خوشی کا عنصر بھی تھا۔ گو کہ وہ رونا چاہتی تھی۔ اپنا غم اپنی اذیت ان کو سنا کر۔ مگر نہیں، اتنی دور بیٹھی ہوئی بوڑھی نانی بھلا کیا کر سکتی تھیں۔ آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ اور آواز قابو میں کر کے پوچھا۔

"خوش لگ رہی ہیں تب ہی طنز کے تیر برسا رہی ہیں۔"

"ہاں تو ہوتی تو مجھے سناتی۔ جو ابھی گا رہی تھی۔ ارے خوش خبری ہے۔ لاڈلی کے گھر لاڈلا آنے والا

ہے۔ ابھی میں گانے گا رہی تھی۔ تجھے سناتی۔ مگر تو اتنی دور ہے۔" لاڈ میں تو تکار پر اتر آنا عادت تھی۔

آنسوؤں کا گولا حلق میں پھنس گیا۔ کسی طور نیچے اتارا۔

"اچھا میرے وہاں سے آتے ہی.... گانا سنایئے۔"

وہ اس کا غم نہیں بٹا سکتی تھیں۔ وہ ان کی خوشی میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ فوراً" شروع ہو گئیں۔

"ارے پیڑ سہوں آنگن میں کھڑی پیڑ سہوں آنگن میں۔ (پیڑ۔ تکلیف۔ درد)

"ارے دائی اماں آؤ ذرا کھٹیا بچھاؤ آنگن میں۔ او بے ہودے او بے ہنرے (شوہر کی عزت افزائی) کھٹیا نہ کہو۔ زچہ خانہ کہو بچہ خانہ کہو۔ چھپر کھٹ کہو۔ آنگن میں (ہائیں) کھڑی پیڑ سہوں۔

آؤ دائی اماں۔ ذرا چیتھڑے بکھیرو گودڑ تو لاؤ آنگن میں او بے ہودے۔ اے بے ہنرے۔ گودڑ نہ کہو چھٹی چھوچھک کہو آنگن میں پیڑ سہوں۔

ارے دائی اماں ذرا وہ کپڑا دکھاؤ۔

لو تھڑا دکھاؤ آنگن میں۔ او بے ہودے۔ او بے ہنرے۔

کپڑا نہ کہو۔ شہزادہ کہو۔ فرزند کہو آنگن میں۔

آنگن میں کھڑی پیڑ سہوں آنگن میں۔

"استغفار۔ سارے کام آنگن میں ہوں گے؟ لاڈلی سے اور توقع بھی کیا ہو سکتی ہے؟" چڑ گئی۔

"اے ہے گانا ہے۔ آنگن تو بس۔ سر درست کرنے کا بہانہ ہے۔ فکر نہ کر میری رانی۔ تیری رخصتی کے لیے بھی گانے تیار کر رہی ہوں۔ (گا کر) ساجن گھونگھرو باجیں گے کہ ہم تم ناچا کریں گے۔"

فجر نے ریسیور کان سے ہٹا کر گھورا۔

"مجھے معاف کریں۔ بس ماموں کو پیشگی مبارکباد دے دیں۔ اللہ کرے لڑکی ہو۔ انہیں بھی احساس ہو کہ بیٹی کیا ہوتی ہے۔"

جل کر فون بند کر کے دادی کے پاس آ گئی۔ پورا گانا سنا دیا۔ انہیں زور کی ہنسی آئی۔ ان کو ہنستا دیکھ کر فجر کو تسلی ہوئی۔

چچی کو بھی بی اماں نے گانا سنا دیا۔ ان کی ہنسی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

گھنٹی پھر ہوئی۔ فجر نے ریسیور اٹھایا۔ حسب توقع اماں جان۔ "میرے لاڈلے اثر کا حال تو نہ میں نے پوچھا۔ نہ تم نے بتایا۔ کیسا ہے میرا لال۔ وہ بھی مجھے بھول گیا۔ وہاں کے پانی کی تاثیر میں بے وفائی ہے۔ آزما چکی ہوں۔"

"پتا نہیں۔ بھولنے کی عادت بے وفائی نہیں۔ بڑھاپے کی علامت ہے۔ کیا اس منزل کو پہنچ گئے موصوف۔" (شیطان کو یاد کرو۔ وہ آجاتا ہے۔)

اثر نے بلند آواز میں سلام کر کے کہا "یہ کس موصوف کا ذکر ہے۔"

چچی کھلکھلائیں۔ "تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔"

"اچھا۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔" فجر نے فون رکھ دیا۔

اثر نے سنجیدہ ہو کر بتایا۔ "انکل فوت ہو گئے۔ امی کا فون آیا تھا۔"

فون بند کرتے ہی فجر کو تاسف سا ہوا۔ "میں بات کرا ہی دیتی۔ مگر نہیں اچھا ہی ہوا۔ انکل کی وفات کی خبر سن کر۔ اماں جان نہ جانے کس جذبے کا اظہار کرتیں۔"

"میں تو ابھی جا نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ۔ وہاں انکل کے بھائی بہن ہیں۔ جاؤں گا لیکن شاید کچھ وقت لگ جائے۔" وہ بی اماں سے مخاطب تھا۔ چچی بھی شریک گفتگو تھیں۔

"فجر! ایک چائے کی پیالی ملے گی؟ اسٹرانگ سی۔" یوں مخاطب تھا جیسے کوئی عام حالات ہوں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چچی چائے لے آئیں پھر اثر سے کہا۔

"اس دن.... سفینہ آپا کے گھر کیا ہوا تھا؟" بی اماں باتھ روم میں تھیں۔

بہت حیرانی سے اثر نے کہا۔ "کیا کچھ ہونا چاہیے تھا۔"

"میرا مطلب ہے۔ حمزہ کو چوٹ کیسے لگی۔ کس

نے زینے سے دھکا دیا۔ پیر مڑ گیا ہے اور بازو فریکچر ہے۔ سر میں ٹانکے لگے ہیں۔ ہاسپٹل میں ہے۔"

"آپ کیا وہاں گئی تھیں۔"

"نا بابا میں تو بہت کم جاتی ہوں وہاں۔ عشا کی کلاس فیلو کا بھائی حمزہ کا دوست ہے۔ اس نے عشا کو بتایا تھا۔" چچی نے وضاحت کی۔

"تو آپ کا خیال ہے میں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ پھر تو مجھے لاک اپ میں ہونا چاہیے تھا پولیس کی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ تمہارے ماموں کہہ رہے تھے۔ کیا نئی بات ہے۔ روزانہ ہی کسی لڑکی کے چکر میں کبھی کسی کا سر پھاڑ دیتا ہے۔ کبھی اپنا سر تڑواتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہوا ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے۔ لڑکی کا ہی.... کوئی معاملہ ہو۔ اچھا جاؤں گا۔"

چچی کے جانے کے بعد بی اماں کو بتایا۔ لاڈلی بیگم نے جعلی کاغذات بنوا کر۔ گھر اپنے نام کروانے کی درخواست دی ہے۔ گویا ان کے سسر نے یہ بہو لاڈلی بیگم کے نام گھر کر دیا تھا۔"

"اچھا ہے۔ کاغذات بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔" فجر نے چڑ کر کہا۔ "قبضہ ان ہی کا ہے۔ لے بھی لیں۔ مجھے گھر لے کر کیا کرنا ہے۔" دنیا سے 'لوگوں سے بیزاری ہو رہی تھی۔ فضول دنیا۔

"اپنا جائز حق کسی ضرورت مند کو اپنی مرضی سے خوشی سے دینا جائز ہے۔ مگر بے ایمانی سے ہتھیانا تو ناجائز عمل ہے۔ میں کم از کم اس معاملے میں مختلف خیال رکھتا ہوں۔ مالکہ بن کر تو لاڈلی بیگم کے پر لگ جائیں گے۔" اثر کے کہنے پر۔ فجر نے تصور میں لاڈلی کے بازوؤں پر بڑے بڑے پر لگے دیکھے۔ اڑنے کی کوشش میں وہ دھڑام سے زمین پر جا گریں۔ فجر ہنسی روک نہ سکی۔

"کیا میں نے لطیفہ سنایا ہے؟" اثر برا مان گیا۔ ویسے بھی فجر کا مکان بخش دینے کا سن کر غصہ میں تھا۔

"نہیں میں نے خود بنا لیا پر لگا کر لاڈلی بیگم کو اڑتے دیکھنا۔ پھر دھم سے گرنا۔ اچھا لطیفہ ہے۔"

کئی دن بعد عشا نے اپنی سہیلی کے بھائی کی زبانی سن کر بتایا۔

"حمزہ بھائی کا علاج اب یورپ میں ہو گا۔ ان کا فریکچر صحیح نہیں ہو رہا اور پیر کی ہڈی مڑ گئی ہے۔"

ایک دن سفینہ پھپو آ گئیں۔ اماں سے معافی مانگنے۔ انہیں منانے۔ انہوں نے فجر سے بھی معافی مانگی۔ بی اماں ان سے بدستور ناراض تھیں۔ انہوں نے سفینہ پھپو سے بات کی نہ معاف کیا۔ چپ سادھے رہیں۔ وہ روتی ہوئی آ گئیں۔ چچی کو آج سارا قصہ معلوم ہوا۔ اثر ہاسپٹل گیا تھا۔ حمزہ نے اس سے صدق دل سے معافی مانگی۔ اس نے کہا۔

"تم فجر کے مجرم ہو۔ فجر معاف کر دے تو.... مجھے تو تمہاری بکواس پر پہلے بھی یقین نہ تھا۔ مگر تم نے ایک پاکدامن لڑکی پر تہمت لگائی۔ اللہ بھی اس فعل کو معاف نہیں کرتا۔"

سفینہ پھپو نے چچی کو ہر بات بتا دی۔ وہ دم بخود حیران رہ گئیں۔ تاسف اور تکلیف ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ چند دن بعد اثر آیا۔ وہ اپنی ماں کے پاس جا رہا تھا۔ ماں بہنوں کی دلدہی کے لیے۔ فجر کے قریب آ کر رکا۔ مسکرایا۔

"جلدی آ جاؤں گا۔ انتظار کرنا۔" اور چلا گیا لیکن اسے وہاں رکنا پڑا۔ فجر کو غیر ارادی طور پر انتظار رہنے لگا۔ آجاتا تھا۔ کچھ باتیں بی اماں سے کرتا۔ عشا' ندا سے مذاق کرتا۔ چچی اس کی خاطر تواضع کرتیں۔ گھر میں کچھ دیر ہلچل سی ہو جاتی۔

ہلچل ہاں ہلچل ضرور ہوئی۔ چچا نے فجر کو اپنی مجبوریاں۔ کاروبار میں خسارہ۔ قرض کا انبار۔ کچھ ایسی ٹیکنیکل تلمیحات۔ جو وہ سمجھ نہ سکی۔ فجر کی دو کانیں۔ فروخت کر کے وہ ڈوبا ہوا کاروبار بچا سکتے ہیں۔ قرض کے بوجھ سے چھٹکارا.... کاروبار سیٹ ہو جانے پر قسطوں میں فجر کی رقم ادا کر دیں گے۔ دادی تو راضی نہ تھیں۔ مگر چار بچوں کی تعلیم۔ لڑکیوں کی شادیاں' چچا کی فکر.... چچا کو پریشان دیکھنا اور خود دل کھول کر خرچ کرنا۔ اسے ہرگز پسند نہ تھا۔

"مجھے دو وقت کی روٹی چاہیے بی اماں۔ پیسے ہوتے تھے۔ تو خرچ کر لیتی تھی۔ نہیں ہوں گے۔ تو نہیں کروں گی۔ میرے ذریعے چچا کی پریشانی ختم ہو جائے۔ اس سے زیادہ اچھا اور کیا ہو گا میرے لیے۔" اس نے انہیں راضی کر لیا۔

پھر سب طرح درست ہو گیا۔ چچا بے حد مصروف ہو گئے۔ وہ دعا کرتی کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ کئی دن ہو گئے۔ ایک دن پتا چلا۔ چچا شہر سے باہر گئے ہیں۔

اثر کا فون آیا۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک۔"

"تم نے پھر من مانی کر ڈالی۔ وہ دکانیں فروخت کر دیں۔ کتنے موقع کی۔ بے حد قیمتی تھیں۔"

"اسی لیے تو... چچا کا قرض اور کاروبار ٹھیک ہو گا۔ انہیں ضرورت تھی۔"

"تمہیں ضرورت نہ تھی؟"

"میرے پاس زندگی ہے۔ اور یہ کافی ہے۔"

"زندگی کو بھی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہر حق سے دست برداری کو ایمان سمجھ لیا ہے۔"

وہ سمجھ نہ سکی۔ اثر کیوں ناراض ہو رہا ہے۔ "میرے چچا... مجھ سے الگ نہیں ہیں۔"

"ہاں' اسی لیے دوبئی میں اپنا کاروبار سیٹ کر رہے ہیں۔ تمہارے پیسے کو یہاں لگا رہے ہیں۔ اور کچھ عرصہ بعد فیملی کے ساتھ ادھر ہی شفٹ بھی ہو رہے ہیں۔ مجھے فون کیا تھا۔ تمہاری جائیداد کا بتایا۔ فجر عقل بھی کام میں لینی چاہیے۔" نہ لکھا پڑھی' نہ کوئی معاہدہ' میں تم پر بہت برا وقت آتا دیکھ رہا ہوں۔ بہر حال کچھ اصول بھی ہوتے ہیں زندگی گزارنے کے لیے' میرا تو انتظار کر لیتیں۔ خیر اللہ رحم کرے۔ میرا گھر دیکھا ہے ناں۔ تم نے۔ ٹھیک ہے۔ ادھر ادھر بھٹکنا نہیں۔"

یوں بول رہا تھا۔ جیسے برسوں کے لیے گیا ہے۔ اور میں بے آسرا ہوں۔ کئی دن بعد چچا نظر آئے۔ خاصے خوش تھے۔

"چچا آپ دوبئی گئے تھے؟" پوچھنا ضروری تھا۔ مگر بس ایک سوال۔

"کس نے بتایا تمہیں۔ اثر نے؟ ہاں میں نے اسے بتایا تھا۔ تمہاری جائیداد کے بارے میں اس سے رائے لی تھی۔ بھئی اس کے علم میں ہونا چاہیے۔ کل کو وہ عدالت میں گھسیٹے پھر کیا کہہ رہا تھا؟" فکر مند ہو گئے۔

"نہیں بس بتایا تھا آپ کا۔ چچا جب مجھے ضرورت ہو گی۔ آپ کچھ رقم تو دے سکیں گے مجھے؟"

"ہاں' ہاں لے لینا اور تمہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ اچھا خیر لے لینا۔" مگر چہرہ الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اقصیٰ کی شادی بھی ہو گئی۔ عشا نے آ کر بتایا۔ چچا چچی۔ دادی کسی کو کارڈ نہیں ملا تھا۔ اس صبح اٹھی۔ تو آسمان پر بادل تھے۔ دادی ابھی سو رہی تھیں۔ مگر اتنی دیر وہ سو گئی تھیں۔ ابدی نیند نہ جانے رات کے کس پہر۔ کسی کو بتائے بغیر۔ رحمت کے فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر۔ آخری منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پرسکون سکوت۔ ابدی سکوت۔ فجر کو لگا۔ اس پر بھی ویسا ہی سکوت طاری ہو گیا ہے۔ وہ یوں کب تنہا ہوئی تھی۔ ہمیشہ بی اماں اس کا سایہ بنی رہیں۔ اب گھنٹوں ایک جگہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی رہی۔ باہر خاموش ہلچل تھی۔ پھر سفینہ پھپو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اسی کی طرح خاموش۔ جیسے.... دونوں کا ایک ہی غم ہو۔ شاید۔

اماں جان عمر کی۔ کمزوری کی پروا کیے بغیر نوید ماموں کے ساتھ آ گئیں۔ زندگی میں خفگی تھی۔ زندگی ختم۔ ناراضگی ختم۔ مستقل آنسو بہاتی۔ قرآن پاک پڑھتی رہیں۔ تیسرے دن فجر سے کہا۔

"چلو فجر۔ اب یہاں کیا رکھا ہے؟"

فجر حیران ہو گئی۔ کیا رکھا ہے؟ ابھی تو کمرے میں بی اماں کے وجود کی حرارت تھی۔ مہک تھی۔ آہٹیں تھیں۔ ان کا نماز کا دوپٹہ تہہ کیا رکھا تھا۔ جو فجر منہ پر رکھ سوتی تھی۔ ان کے وجود کی خوشبو اس میں تھی۔ اماں جان نہ جانے کیا کہتی ہوئی چلی گئیں۔ بعد میں

خیال آیا۔ اماں جان۔ اب ان کو بھی بھلا کب دیکھوں گی۔ چلی ہی جاتی ساری انا۔ اور لاڈلی سے خفگی کو دور کر کے۔ وہ بہت کم روتی تھی۔ مگر اب رات بھر تکیہ بھیگتا۔ دن بھر دامن۔ آنسو کہاں کہاں سے نکل کر برس جاتے۔

چچی نے بتایا۔ اثر کو کچھ وقت اور لگ جائے گا۔
جان سے زیادہ پیاری نانی کو رخصت ہوتے نہ دیکھا۔ پھر دن گزرنے لگے اور وقت بدلنے لگا۔ موسم بدلا رویے بدل گئے۔ گھر اجنبی ہو گیا۔ لوگ اجنبی ہونے لگے۔ کسی کو فجر سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ پھر سب بیگانہ ہو گئے۔ کسی کو یاد نہ رہتا کہ فجر اسی گھر میں رہتی ہے۔ کبھی کھانے پر بلانا یاد نہ رہتا۔ کبھی ناشتہ دینا بھول جاتا۔ بی اماں اپنے کمرے میں دالان میں چلتی پھرتی۔ نظر آتیں۔ خاموش۔

ایک دن دادی کی پرانی ملازمہ آ گئی۔ تعزیت کے لیے آئی تھی۔ حسب عادت فجر نے پرس کھولا۔ دھک سے رہ گئی۔ پھر یاد آیا۔ دو ماہ سے کرایہ نہیں آیا۔ بنک جانے کا موقعہ نہ ملا۔

"چچی! مجھے چار پانچ سو روپے دے سکتی ہیں آپ؟" بڑی لجاجت سے کہا۔ "میں کل بنک سے۔"

"سوری فجر۔ میں نہیں دے سکتی۔" صاف جواب۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہارے چچا نے منع کیا ہے۔ تمہاری عادت ہے ہر کسی کو دل کھول کر دے دیتی ہو۔ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جب سے پتا چلا کہ تم نے عنبرین کی اماں کو دس ہزار روپے آرام سے نکال کر دے دیے۔ وہ خفا ہیں۔ اور اب تمہارے پاس بچا بھی کیا ہے۔ اثر کو دو ڈھائی مہینے ہو گئے۔ غائب ہے۔ اماں کے انتقال پر۔ شنو آپا کا اور اثر کا فون آیا تھا اور بس۔"

"اثر کا یہاں کیا ذکر؟" وہ چکرا گئی۔ اس تفصیل کی بھلا یہاں کیا ضرورت تھی۔ یہ کون سا موقعہ تھا بھلا۔

"تو اور کس کا ذکر ہے۔ اس کے سوا اور ہے کون تمہارا۔ اگر وہ چاہے تو۔۔۔ ورنہ۔"

جانے چچی کیا سمجھانا چاہتی تھیں۔ وہ احمقوں کی طرح انہیں دیکھتی رہ گئی۔ بنک بھی گئی۔ اف نہ جانے کب چچا نے۔۔۔ رقم نکلوالی تھی۔ کس طرح ایک معمولی رقم جو اکاؤنٹ رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ وہی باقی تھی۔ وہ بھاری دل بھاری قدموں سے گھر آئی۔ چچا نظر آئے۔

"چچا! مجھے کچھ رقم چاہیے۔" کہتے ہوئے سانس پھول گیا۔ "اصل میں۔ بنک گئی۔ تو وہاں بھی کچھ نہیں پہلے دکانوں کا کرایہ آتا تھا۔ تو مجھے مشکل نہیں ہوتی تھی۔" وضاحت دینی بھی بہت مشکل تھی۔ شرم آ رہی تھی۔

"جب دونوں ہاتھوں سے لٹاؤ گی۔ تو یہ تو ہو گا۔ مجھے ضرورت تھی۔ اس لیے نکلوا لیے تم سے چیک بک لی تھی نا۔۔۔ ابھی کسی طرح کام چلاؤ۔ پیسہ درخت پر نہیں لگتا کہ جب چاہا توڑ لیا۔" چلے گئے۔ وہ ہکا بکا۔ میں بھکارن ہوں۔ یہ اوقات ہے اب۔۔۔ ایسا ٹکا سا جواب کب سوچا تھا۔ جی چاہا ابھی مر جائے۔ مگر موت بھی کب تھی اختیار میں۔ ایک ایک پیسے کو ترسنا کسے کہتے ہیں اب علم ہوا۔ بالآخر چچی کو ہی قاصد بنایا۔

"فجی' چچا نے کہا تھا۔ کام چل جائے تو قسط وار کچھ رقم دے دیا کریں گے۔ اب تو کام شروع ہو گیا ہے اور مجھے سخت ضرورت ہے۔ پانچ ہزار ہی دے دیں۔"

"میں کہہ دوں گی مگر یقین نہیں ہے۔ اچھا دیکھو۔"

صبح اس نے چچا کی چنگھاڑ سنی۔ "کیا کہا؟ قسط کون سی قسط۔ میرے بھائی کی جائداد تھی۔ جتنا اس کا حصہ بنتا تھا۔ وہ کھا پی چکی خرچ کر چکی۔ بھائی بھتیجوں کا شرعی حصہ باقی تھا جو میں نے لے لیا۔ اس میں اس کا کوئی شرعی حصہ نہیں۔ کہہ دو۔ ہم نے بہت زیادہ ڈھیل دی۔ اتنے عرصے اپنے پاس رکھا۔ اب یہ ہم پر احسان جتائے گی۔ نہ جانے کیا کر کے بیٹھی ہے۔ جو اثر امریکہ جا کر جم گیا ہے۔ کونسا اہم کام کر رہا ہے۔ کہ آنے میں عذر بھی۔ لے جائے اپنی بیوی۔ مجھے تو لگتا ہے وہیں شفٹ ہو گیا ہے۔ آئے وائے گا نہیں اب۔۔۔"

اثر کا کیا ذکر؟ پتا نہیں سب فجر کے معاملے میں اثر کو کیوں گھسیٹ لیتے ہیں۔ رقم مجھے چاہیے۔ اپنی رقم

چچی کچھ آہستہ سے بولی تھیں۔ مگر چچا کی چیخیں۔
"اچھا اصرار کر رہی ہے؟ تو کہہ دو۔ اس کا حصہ باقی نہیں اور بہت کرلی ہم نے اس کی قدر۔ اپنی بہن تک کو اس کی خاطر چھوڑ دیا۔ کہہ دو کہ اب وہ اپنا انتظام کر لے۔ جہاں مرضی نانی کے پاس جائے۔ یہاں اب نہ دیکھوں۔" حکم دیا تھا۔

میں کیا ہوں۔ کسی کی کچھ نہیں۔ محبت میں حصہ نہیں۔ خون کا تعلق نہیں۔ دادی سے جو واسطہ تھا۔ ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جنون کی کیفیت میں کپڑوں کی الماری تلپٹ کردی۔ بالا خر ادھر ادھر ہاتھ مارنے سے یہاں وہاں رکھے کچھ نوٹ سو کے پانچ سو کے مل گئے۔

اس سے پہلے کہ چچا ہاتھ پکڑ کر نکالیں۔ وہ خود وہاں سے نکل گئی۔ عنبرین کی ماں کو یہی اندیشہ تھا ناں۔ انہوں نے ایک چھت کا انتخاب کرلیا۔ چلو وہ کچھ ناہموار سہی۔ چار دیواری کا تحفظ تو تھا۔ آج میں عنبرین بن گئی۔ وہ چلتی جا رہی تھی۔ کوئی چھت ملے۔ اماں جان۔ وہاں تو لاڈلی بیگم کا حکم ہو گا۔ ادھر سے نکالی گئی تو ..... سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ سب کام ہو رہے تھے۔ ٹھیلے پر کیلے والا چڑھا بیٹھا تھا۔

"بی بی! کچھ لے لو۔ صبح سے بونی نہیں ہوئی۔"

رک گئی۔ دو درجن کیلے لے لیے۔ رقم بھی زیادہ دے دی۔ "بچوں کے لیے کچھ لے جانا۔" شاید اس کی دعا لگ جائے۔ نوٹ گن کر اسے ممنون نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دعا۔ باریاب ہو گئی۔ کچھ لوگ۔ خضر کی صورت دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھانے۔ تو بابا رمضان رکشہ لے کر آ کھڑا ہوا۔

"بی بی۔ کدھر جانا ہے۔ چلو بیٹھو۔" وہ بیٹھ گئی۔ راستہ کہاں تھا۔ رکشہ چل پڑا۔ نہ بابا نے پوچھا۔ نہ اس نے منزل کا بتایا اور اسے وہیں پہنچا دیا۔ جہاں جانا ہی تھا۔

"بی بی گڈی گرم ہو گئی ہے۔ پانی ڈال لوں سامنے کے نلکے سے۔" وہ اتر کے بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔

"گڈی۔ پرانا رکشہ۔ بابے رمضان جیسا۔" اسے ہنسی آ گئی۔ خود حیران ہو گئی۔ کب سے ہنسی نہ تھی اور آج ..... سب بدل گئے تھے۔ وہ آج بھی نہ بدلی۔ ہنسی روک لیتی۔ یا بدل گئی ہوتی تو.....

"بی بی ..... چلتی کا نام گڈی ہوتا ہے۔ یہ میرا روزگار ہے۔ میرا رکشہ۔ میری گڈی۔" رمضان نلکے کے پاس جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی اتر گئی۔ پانچ سو کا نوٹ اس کی سیٹ پر رکھا۔ "یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اندر سے چائے بھجواتی ہوں۔ انتظار کرو۔"

"بی بی! میرے پاس ٹوٹے پیسے نہیں ہیں۔ صبح سے سواری نہ ملی۔" لجاجت تھی لہجے میں۔

"سب رکھ لو اور ابھی رکے رہو۔" مالکانہ خو بو تو کبھی نہ تھی۔ آج کیوں مزاج بدل گیا۔ بلقیس دانت چمکاتی اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔

"تم لوگ گیٹ بند کیوں نہیں کرتے۔ اس دن بھی کھلا ہوا تھا۔ آج بھی کوئی چور چکار آجائے تو۔ اور اچھا۔ رکشہ والے بابا کو چائے اور کچھ کھانے کو دے دو۔"

لان ویسا ہی سرسبز تھا۔ پھول اسی طرح مہک رہے تھے۔ بلقیس اسے لاؤنج میں لے آئی۔ نرم صوفے میں دھنس کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سامنے ہی دیوار پر اس کی اپنی ہنستی تصویر لگی تھی۔ وہ اچک کر کھڑی ہو گئی۔ اثر اور وہ۔ دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ یہ؟ یہ کب کی تصویر تھی..... یاد نہ آیا۔ بلقیس جا چکی تھی۔ پھر آ کر اپنی کارگزاری جتاتی۔

"رکشہ ..... والے بابا کو کھانا بھی دے دیا۔ چائے بھی پکڑا آئی۔ اور کل کا بچا ہوا سالن شاپر میں کر کے اس کے بچوں کے لیے دے دیا۔ کل کی ڈبل روٹی بھی دے دی۔ آپ کے لیے کھانا لے آؤں؟"

دوپہر ہو گئی۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ صبح سے سڑکوں پر کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔ کھانا آ گیا کھا لیا۔ پھر احساس ہوا۔ خاصی بھوک تھی۔

"بی بی۔ آپ لاؤنج میں رہ لیں گی؟ کمرے تو سب بند ہیں اسٹور کھلا ہوا ہے۔ بستر وغیرہ سب ہے۔"

ارے اسے کس نے بتایا کہ وہ رہنے آئی ہے۔

"صاحب نے فون پر کہا تھا۔ آپ کسی وقت بھی آ

سکتی ہیں۔ ہم روز کھانا پکاتے تھے۔ پھر فقیروں کو دے دیتے تھے۔ صاحب کہتے ہیں گیٹ کھلا رکھو۔ کبھی کسی فقیر ضرورت مند کو گھنٹی بجا کر انتظار نہ کرنا پڑے۔" گیٹ کھلے رہنے کی توجیہہ پیش کی۔ ارے ہائیں یہ اثر چیز کیا ہے۔

"وہ خود کب آئیں گے۔" چچا کی اطلاع کی تصدیق کرنی ضروری تھی۔ پسینہ آگیا تھا پر۔

"کچھ بتاتے نہیں ..... ہم تو خود پریشان ہیں۔" پسینہ پورے جسم کو تر کرنے لگا۔ وہ اکیلی۔

"کہہ رہے تھے۔ کسی دن بھی ..... آجاؤں گا۔" بارے کچھ امید افزا خبر ملی۔ صوفے پر دھنس کر ایسی بے خبر سوئی۔ جیسے کب کی جاگی ہوئی ہو۔

"تم نے مجھے پہچانا کیسے کہ میں۔" صبح ہی سوال کر ڈالا۔ اور اپنی حماقت پر پچھتائی۔ جب اس نے تصویر کی طرف انگلی اٹھائی۔ کئی دن نیندیں پوری کرنے میں گزار دیں۔ افوہ۔ بس سونا' کھانا' لان میں چہل قدمی۔ کبھی گیٹ سے باہر جھانکنا۔ کب تک یہ مشغلہ رہے گا۔ کپڑے میلے ہو گئے۔

پائپ لے کر لان میں آگئی۔ ڈرائیوے تو دھویا۔ آئیوی کی کیاری پانی سے بھر دی۔ ساری کیاریاں۔ لان میں پانی دیتے ہوئی خود بھی بھیگی۔ غور نہیں کیا۔ گاڑیاں آگے پیچھے کب آکر کھڑی ہو گئیں۔ بلقیس کی کھلکھلاہٹ اور پھر چیخیں ..... خوشی سے بھرپور نہ جانے کون ..... کیا ..... دو حسین پریاں اس کے بھیگے بدن سے چمٹ گئیں۔ (زندگی کتنی حسین ہے۔) ریحا اور فروا۔ اثر کی بہنیں ..... شنو پھپو۔

وہ پائپ پھینک کر ان کی طرف بڑھی اور چیخیں مارتی روتی ہوئی لپٹ گئی۔ اس کے گلے سے درد بھری فریاد۔

"پھپو۔ بی اماں گئیں۔ میں اکیلی رہ گئی۔" دونوں پھوپھی بھتیجی ..... بچھڑی ماں کی تعزیت کر رہی تھیں۔ اثر ٹیکسی سے سامان اتار رہا تھا۔

شنو پھپو کو دو صدمے تھے۔ ماں اور شوہر سے جدائی تو فجر بھی کئی صدموں سے گزر رہی تھی۔ دادی پیاری دادی اور رشتوں سے جدائی کا۔

اثر بہت دلچسپی سے اس کا حلیہ دیکھ رہا تھا۔ الجھے بال میلے کپڑے۔ اجڑی ہوئی کیفیت۔ مگر پہلے سے زیادہ مضبوط کم از کم راستے متعین کرنے کی عقل آگئی تھی۔

لاؤنج میں شنو پھپو کے ساتھ آئے ہوئے اثر کو دیکھا۔ بہنوں کے ساتھ گھر دکھاتا پھر رہا تھا۔

"آپ نے پوچھا نہیں۔ میں یہاں کیسے ..... کیوں آ گئی؟" ہچکچائی۔

"بہت ہی اچھا فیصلہ کیا۔ جہاں آنا چاہیے تھا۔ محفوظ راستہ یہی تھا۔"

"دراصل مجھے ساہیوال جانا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو لاڈلی نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ مجھے وہاں گھسنے بھی نہ دیتیں۔ پھپو۔ اب میں کہاں جاؤں۔"

ہائے بے چارگی۔ شنو نے اس کو پیار کیا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ امریکہ جانے سے پہلے۔ اثر وہاں جا کر سب معاملات درست کر آیا۔ اپنے حصے کا آدھا حصہ ان کو۔ نوید کو دے دیا۔ دو کمرے صحن وغیرہ۔ اس طرح خالہ جان بھی ..... وہیں ہیں۔ اب میں تم کو لے کر پرسوں ساہیوال جاؤں گی۔ عدت کے ختم ہونے پر عورت میکے جاتی ہے۔ اب میرا میکہ وہی ہے۔ پھر ہم ان کو لے کر آجائیں گے۔ مجھے' میری بچیوں کو خالہ جان کی ضرورت ہے اور ہمیں اور اثر کو بھی ..... اثر سے وعدہ کر چکی ہیں۔ انکار نہیں کریں گی۔ تمہاری رخصتی بھی کرنی ہے آخر!"

وہ سٹپٹا کر کھڑی ہو گئی۔ بے بسی سے اپنے میلے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے اثر۔ ریحا اور فروا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ انہوں نے امی کی بات سن لی۔ سمجھ لی تھی۔ پھر قہقہہ لگانے لگے۔

فجر پر کسی نے گھڑوں پانی ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی بڑھتی گئی اور پہلی بار ایک حسین نظارہ دیکھنے کو ملا۔ اثر مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اثر کی موجودگی محسوس کر کے۔ پہلی بار اس نے اثر کی دل کی گہرائی میں موجودگی کا احساس کیا تھا۔ آمادگی کے ساتھ۔ دل اور دماغ کی گواہی کے ساتھ۔

☆

زرنین آرزو

# مسکرا دے زندگی

مکمل ناول

پچھلے دو تین دنوں سے وہ کالج سے جلد لوٹ آتا تھا۔ مایوسیوں اور شکستگی نے جیسے اسے بے حال کردیا تھا۔

یہ شکستگی اور مایوسی اسے ایک دن مار ڈالے گی۔ شاید وہ اچھی طرح سمجھا نہیں تھا شیرل کو۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا اسے، لیکن کبھی بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ نہ اس کے پل پل بدلتے موڈ کو، نہ اس کی طبیعت کو۔ سیف کند ذہن نہیں تھا اور نہ ہی کم فہم تھا، لیکن جس منزل کا تعین کردیا گیا تھا، وہ بے تحاشا پرپیچ راہوں سے مزین تھی، یہ بزرگ بھی کبھی کبھی عجیب عجیب امتحان میں ڈال دیتے ہیں، چاہے اس امتحان میں سرخرو ہونے کی اہلیت ایک فیصد بھی نہ ہو۔ وہ بھی کسی نالائق شاگرد کی طرح خوف زدہ تھا۔

یہ سیف کے بچپن کی بات تھی۔

بابا جان اور سعید انکل نے شیرل کو اس سے منسوب کردیا تھا۔ اسے سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی شیرل اچھی لگا کرتی۔ دونوں کا بچپن نہایت دوستانہ ماحول میں ہنستے کھیلتے گزرا تھا۔ شعور کی منزلوں میں قدم رکھتے ہوئے سیف کو وہ دل کے قریب محسوس ہوئی۔ وہ بارہا اسے گھر آتے، اپنی ذاتی زندگی میں دلچسپی لیتے اور اس کے چھوٹے چھوٹے کام پاگلوں کی طرح کرتے دیکھا کرتا، لیکن اس کے کام ہوتے بھی کیا تھے۔ اس

کے کمرے کی طرف جاتی رسولن سے وہ خود کافی کا کپ لے کر اس کے سر پر پہنچ جایا کرتی یا پھر اس کی وارڈ روب سے استری کیے خوب صورت تراش خراش کے سوٹ اپنی پسند سے نکال دیا کرتی۔ اسے یہ سب کرتے دیکھ کر سیف کا دل خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز ہو جاتا۔ اسے اپنی منزل بے حد شفاف اور قریب محسوس ہوتی۔

دونوں نے ایف ایس سی کے بعد اکٹھے ہی میڈیکل

کالج جوائن کیا تھا' تب وہ کتنے فخر سے اپنی دوستوں کو بتایا کرتی کہ یہ بے انتہا سجیلا سا خوبرو بندہ اس کا تایا زاد ہونے کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی ہے۔ اس کی شدید چاہتوں کو محسوس کرتے ہوئے وہ خود کو بہت معتبر' بہت اونچا جانتا' اسے لگتا جیسے وہ اس روئے زمین کا خوش نصیب ترین شخص ہے۔

مگر یہ سب اس کی خام خیالی تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور شیرل بھی سونا نہیں تھی۔ بابا جان کی موت کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ بہت مقروض ہو چکے ہیں۔ نام نہاد کاروبار ٹھپ ہو چکا ہے' اور اتنا بڑا محل نما بنگلہ بھی رہن تھا۔ حقیقت میں پیروں تلے سے زمین تب کھسکی' جب سیٹھ کریم بنگلے کی نیلامی کے کاغذات لے آیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ سارا کچھ بیچ کر بھی قرض سے نجات نہیں ملی تو سعید انکل اس موقع پر بڑے کام آئے۔ انہیں اپنے گھر میں رکھ لیا اور باقی قرضہ بھی چکا دیا' لیکن سیف بجھ کر رہ گیا۔ اس کی غیرت مند طبیعت کو یہ سب قطعی گوارا نہیں تھا۔ مگر وہ مجبور تھا' جب تک کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا۔

لیکن جانے اچانک کیا ہوا؟

وہ پروانہ وار نثار ہونے والی آنکھیں ایک دم ہی بدل گئیں۔ ہمہ وقت ناراض سی رہنے لگیں' تمسخر اڑانے لگیں۔

اگر کوئی آپ کو اپنے التفات اور اپنی چاہتوں سے بہت بلندیوں پر پہنچا دے اور پھر عین اس وقت' جب آپ بہت اوپر' بہت بلندی پر پرواز کر رہے ہوں اور وہ ایک دم سے آپ کو دھکا دے کر اپنا تعلق قطع کر لے تو آپ اپنا دم گھٹتا محسوس کریں گے۔ بلندی سے گرنے کے خوف سے آنکھیں سختی سے میچ لیں گے۔ وہ بھی گرنے کے خوف سے آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔

شیرل کے غیر محسوس انداز میں بدلتے رویے سے اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ شیرل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ جلد از جلد کچھ بن کر اپنی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتا تھا۔

مگر وہ دو سال تک مزید اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے معذور تھا۔ اس کی پڑھائی کے اخراجات بھی سعید انکل برداشت کر رہے تھے۔ سیف باشعور و سمجھ دار تھا اور بہت کچھ کر گزرنے کے لیے پرعزم بھی' لیکن شیرل کی بدلتی آنکھوں اور بدلتے رویے نے اسے حد سے زیادہ مایوس اور شکستہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بدلتی قسمت اور تقدیر کی ستم ظریفی سے مایوس نہیں ہوا' لیکن شیرل کے وقتاً"فوقتاً" بدلتے موڈ سے دل شکستہ ہو گیا تھا۔ اس کی دبے دبے انداز میں کی گئی باتیں اسے بہت کچھ سمجھانا چاہ رہی تھیں۔

"اوہ سیف پلیز' اپنی پرسنالٹی میں ذرا تو گلیمر پیدا کرو۔ تم جانتے ہو' مجھے گھٹیا اور کمتر چیزوں سے سخت چڑ ہے۔"

یہ فقرہ وہ دن میں کوئی دس پندرہ بار تو ضرور اس کے کانوں میں انڈیلتی تھی۔ اس کے لہجے کی ساری شیرینی جیسے کہیں اڑنچھو ہو چکی تھی۔ سیف دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کی پرسنالٹی میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہاں البتہ تبدیلی شیرل کی نگاہوں میں واقع ہوئی تھی۔ شیرل نے اپنے سوچنے کا انداز بدل لیا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔

خوشحالی کے دنوں میں جب وہ ملگجے سے لباس میں بھی پھرتا تو وہ اسے اس حلیے میں بھی بے پناہ اچھا لگتا تھا۔ تب وہ تنقید نہیں کیا کرتی تھی' بلکہ اسے بے نیازی اور ایک لاابالی سا دلفریب انداز جانا کرتی تھی اور کہیں باہر ڈنر کے لیے وہ اسے ایک منٹ انتظار کر کے کپڑے بدل آنے کا کہتا تو شیرل نہایت اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیتی۔

"اوہ کم آن سیفو۔ تم اس حلیے میں کسی پرنس سے کم نہیں لگ رہے' شخصیت کپڑوں کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔" اور وہ حیرت سے پلکیں جھپکے بنا' اس کے لہجے میں چھپی شدتوں اور اس کی آنکھوں سے چھلکتے پیار کو محسوس کیے جاتا۔

لیکن تب اور اب میں جیسے بہت فرق آگیا تھا۔
تب وہ بے انتہا رئیس باپ کا بیٹا تھا۔
اور
اب ایک سفید پوش ماں کا واحد سہارا' جو دوسروں کے در پر پڑی تھی۔
وہ کالج بھی الگ سے آنے جانے لگا تھا۔ شیرل کی بات اس کے دل میں انی کی طرح چبھ گئی تھی۔
اس دن وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ اس کے برابر کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے لگا تو شیرل نے دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔
"پہلے جب میں تمہاری گاڑی میں تمہارے برابر بیٹھتی تھی تو مجھے بہت فخر محسوس ہوتا تھا۔ مگر اب جب تم میری ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھتے ہو تو مجھے ندامت ہوتی ہے۔" شیرل کے انداز میں رہی سہی مروّت بھی معدوم ہوگئی تھی۔
"اور ویسے بھی مرد' خواتین سے لفٹ لیتے ہرگز اچھے نہیں لگتے۔" شیرل کا انداز روز بروز کاٹ دار ہوتا جارہا تھا۔
اس کی بات پر سیف نے لب بھینچ لیے۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ وقت کے کینوس پر دو متضاد تصویریں اس کے سامنے یک لخت ابھر آئیں' جب وہ اس کی بی ایم ڈبلیو میں اس کے برابر بیٹھتے اپنی خواہش کا اظہار کرتی تھی۔
"سیفو! میرا دل کرتا ہے تمہاری اس گاڑی میں یہ سفر کبھی تمام نہ ہو۔ بولو سیف۔ زندگی کا یہ سفر تم میرے ساتھ ہی طے کروگے نا۔"
"کیا تمہیں ابھی بھی شک ہے۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے مسکراتے پوچھتا تھا۔
"تم پر تو خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے سیفو! مگر پھر بھی میں یقین چاہتی ہوں۔"
"بس اتنا یقین کرلو شیرل! جس دن تمہارا خیال بھلا دوں گا' وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

"سچ..." وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔
"بالکل سچ..."
ایک وہ دن تھا اور ایک یہ دن ہے۔ جب وہ اس کے ساتھ بیٹھنے پر ندامت محسوس کررہی تھی۔ اس دن کے بعد سے وہ بس سے کالج چلا جاتا تھا۔ شیرل کو اس کی پروا نہیں تھی' لیکن کبھی کبھار جب وہ موڈ میں آتی تو اسے زبردستی کار میں بٹھالیتی اور کنگ ایڈورڈ تک کا سفر اس کی لچھے دار باتوں میں گزر جاتا۔ کبھی دوستوں کی موجودگی میں اسے منہ تک نہ لگاتی' خود کو اجنبی ظاہر کرتی اور کبھی شہد آگیں لہجے میں اس کے اور اپنے تعلق کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کردیا کرتی۔
وہ اس کے اسی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ مزاج سے الجھا ہوا تھا۔ حد سے زیادہ خائف تھا۔
وہ جھنجلا جاتا۔
وہ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی تھی کہ جا بھئی' تو اپنا راستہ ناپ' تیرا میرا گزارا نہیں ہوسکتا۔ مگر
وہ یہ سب نہیں کہتی تھی اور اس کا دل اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور اس کی باتوں' اس کے انداز اور رویے سے خائف اور دل برداشتہ بھی تھا۔
درمیان کا کوئی راستہ نہیں تھا۔
اس دن کالج کے سرسبز شاداب گراؤنڈ میں بیٹھتے ہوئے ردا نے کہا۔
"سیف! آپ کسی دن اپنے محل نما بنگلے کی سیر کروائیں۔ شیرل بہت تعریف کیا کرتی ہے۔"
"اپنی اپنی کرلو ردا۔ میں تعریف کیا کرتی تھی' مگر اب نہیں۔" اس نے لاپروائی سے کہا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا جس کے لہجے اور چہرے پر تحقیر آمیز پرچھائیاں تھیں۔
"کیا مطلب؟" ردا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"مطلب یہ کہ حضرت آج کل خانہ بندوش ہیں۔ فی الحال تو ہمارے گھر پڑاؤ ہے۔ مستقبل میں جانے کہاں ہوگا۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی۔" ردا بالکل ہی کند ذہن بن گئی۔

"بھئی۔ بات یہ ہے کہ موصوف دیوالیہ ہو چکے۔ محل نما بنگلہ ' بی ایم ڈبلیو' شاندار کاروبار سب تباہ ہو چکا۔ قسمت نے بلندیوں سے پستیوں میں دھکیل دیا ہے اس لیے تم محترم کی دکھتی رگ پر ہاتھ نہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

"وہ سچ سچ۔ کب ہوا یہ سب؟ اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" ردا افسوس کرنے لگی۔

"یہ کوئی اشتہار لگانے جیسا معاملہ تو نہیں تھا' جو ہر ایک کو بتاتی پھرتی' شرم کی بات تھی اس لیے خاموش رہنے میں ہی بہتری جانی۔"

شیرل کی بات پر وہ سرخ ہوتا چہرہ جھکا کر رہ گیا۔ ویسے بھی وہ آج کل قسمت کے عطا کردہ نتائج سے کون سا خوش گوار اثر قبول کر رہا تھا۔

اس دن وہ شکستہ دل اور مایوس جلد ہی گھر لوٹ آیا۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

امی نے اسے — خاموش اور چپ دیکھ کر تیسری مرتبہ پوچھا۔ وہ اس کے الجھے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں امی!" اس نے اپنی جلتی آنکھیں نیم وا کر کے انہیں دیکھا۔

"مجھے تو ٹھیک نظر نہیں آرہے۔ تمہارا ماتھا بھی گرم ہو رہا ہے۔" انہوں نے اس کی جلتی پیشانی کو چھوا۔

"بخار کی کوئی دوا لے لیتے۔ تم روز بروز خود سے لاپروا ہوتے جارہے ہو سیفو۔"

"اور جو قسمت مجھ سے لاپروا ہوگئی؟ جو دوسروں نے اپنا مزاج بدل لیا۔" اس کے لہجے میں برسوں کی تھکن تھی۔

"بہت تھکے ہوئے نظر آرہے ہو۔ شیرل سے جھگڑا ہو گیا کیا؟"

"یہ جھگڑا تو صدیوں سے چلا آرہا ہے' اس دنیا کا یہی تو پرابلم ہے۔ یہاں سب ہی دولت کے پجاری ہیں اور غریب بے چارے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ اس کی ذات' ان کی ہستی کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

"تم جانتے ہو سیفو! تمہارے بابا کیا تھے؟" امی نے اس کے چہرے پر پھیلی شکستگی کو دور کرنے کے لیے کہا۔

"وہ ماضی کی بات ہے امی جان! اور ماضی چاہے کتنا بھی شاندار رہا ہو' یہ دنیا تو حال پر نظر رکھی ہے' میرے خیال میں امی یہ بندھن زیادہ دیر نہیں نبھ سکے گا۔"

"پتا نہیں لڑکے تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

"میں شیرل کی بات کر رہا ہوں امی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ رشتے جوڑنا اور توڑنا کوئی گڑیوں کا کھیل ہے۔ شیرل اگر کوئی ایسی ویسی بات کر جاتی ہے تو معاف کر دیا کرو اسے۔ اس کی باتوں کو در گزر کر دیا کرو۔ وہ بچی ہے۔ ناسمجھ ہے۔ دنیا کی اونچ نیچ کو نہیں جانتی۔" امی اسے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

"میں اسے کب تک معاف کرتا رہوں۔ کب تک اپنی شخصیت اور خودداری کو کچلتا رہوں۔"

"دیکھو سیفو! ہماری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جس سے سعید بھائی کو دھچکا پہنچے۔ یا انہیں کسی قسم کا کوئی دکھ ہو۔ انہوں نے مشکل وقت میں ہمیں سہارا دیا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

"سہارا دے کر انہوں نے ہمیں خرید تو نہیں لیا امی۔ اور پھر جو کچھ بھی انہوں نے کیا' وہ ان کا فرض تھا۔"

"سیف!" امی نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

وہ کبھی بھی اس طرح امی کے سامنے نہیں بولا تھا۔

وہ بے حد فرماں بردار اور ان کا دل رکھنے والا تھا۔ اس نے صرف ماں کی خواہش پر اپنی برسوں کی انجینئر بننے کی خواہش کو خیرباد کہہ کر میڈیکل جوائن کیا تھا۔ اس نے ماں کی خواہش کو سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔

اس نے اپنے اندر جھانکا۔

وہ سیرل سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اس سے دور رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کا اذیت ناک رویہ اور کٹھلی باتیں اسے اندر تک چھید ڈالتیں۔ لیکن وہ برداشت کر رہا تھا۔

کیوں کہ امی کے بقول' یہ بات اسے ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ سعید بھائی نے انہیں مشکل میں سہارا دیا تھا۔

لیکن سعید انکل نے انہیں مشکل میں سہارا دے کر اسے مزید مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس کا ذکر کئی بار اس نے اپنے جگری یار ظفری سے بھی کیا۔ تب ظفری نے مشورہ دیا۔

"یار! تو صاف صاف اس سے بات کیوں نہیں کر لیتا۔"

"تو نہیں سمجھے گا ببر شیر' میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے ہیں۔ بقول امی۔ ہمارا بال بال ان کے احسان تلے جکڑا ہوا ہے' یار اس احسان سے رہائی ممکن نہیں۔"

"ممکن ہے۔" ظفری کا لہجہ پرسوچ تھا۔

"وہ کیا؟"

"تم سر منڈوا لو۔ نہ رہیں گے بال اور نہ رہے گا احسان۔"

"بہت ذلیل ہو یار' کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔"

"یہ زندگی بہت تلخ اور کڑوی ہے بھیا' اس لیے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھنا سراسر احمقانہ پن ہے۔" ظفری مسکرایا۔

"اور اگر کوئی میری طرح سے ازل سے سنجیدہ مزاج ہو تو؟"

"تو سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرلی جائیں۔ زندگی مزے سے کٹ جائے گی۔ بنا فیس کے بڑا نادر مشورہ ہے' میری مانو تو آج ہی سے عمل شروع کر دو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور فاقہ ہو گا۔"

"فاقہ نہیں بے وقوف۔ افاقہ۔" سیف نے مسکراتے ہوئے تردید کی۔

"اردو کو تم نے بالکل لنگڑا کر چھوڑا ہے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا میاں۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ اسٹریچر پر لٹا کر دوبارہ آپریشن کر دیں گے۔ اور......"

ظفری بڑی سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کرنا چاہ رہا تھا تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔ ایمان کا نمبر اسکرین پر روشن تھا۔

"کہو ایمان؟"

"بھیا۔ وہ شمیم آپا آئی ہیں۔ اماں کہہ رہی ہیں کہ آتے ہوئے آپ سموسے اور جلیبیاں لیتے آیئے گا۔"

ایمان کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

"اوہ تو شمیم آپا پھر ٹپک پڑیں۔ ان کا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا کیا؟" وہ بے چاری بھلا اپنی ہونے والی ساس کے بارے میں کیا کہتی۔

شمیم آپا کے بیٹے سے ایمان کی منگنی کو دو سال ہونے کو آئے تھے' مگر وہ شادی کا نام تک نہیں لیتی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ان کے یہاں اپنی مہمان نوازی کرانے چلی آتی تھیں۔ خوب خاطر تواضع کروا کر چلتی بنتی تھیں' مگر زبان پر بیٹے کی شادی کا ذکر تک نہیں لاتی تھیں۔

وہ ہر بار یہی کہتیں۔

"زبیر کی اچھی نوکری لگتے ہی ایمان کو بیاہ لے جاؤں گی۔"

اور پتا نہیں زبیر کو کس اچھی نوکری کی تلاش تھی۔ پچھلے دو سالوں سے وہ کسی ایک جگہ بھی ٹک کر کام نہیں کر سکا تھا۔ پہلے ملازمت حاصل کرنے کے لیے جوتیاں چٹخاتا اور پھر دو تین مہینوں بعد نوکری کو خیرباد کہہ دیتا۔ کبھی تنخواہ من پسند نہیں ہوتی اور کبھی اس کا مزاج' باس کے مزاج سے میل نہ کھاتا اور کبھی

ملازمت کی نوعیت اس قسم کی ہوتی کہ اسے رات گئے تک کام کرنا پڑتا۔ وہ اتنی سخت کوشی کا عادی نہیں تھا۔ وہ مزاجاً" سہل پسند تھا۔ اس لیے وہ نوکری کو لات مارنے سے پہلے ایک لمحہ کو بھی نہیں سوچتا تھا۔

"زبیر تو کسی جگہ ٹک کر نوکری کرے تو میں تیری شادی کے بارے میں سوچوں۔" شمیم آپا اسے سمجھاتی تھیں۔

"دیکھ تیری اسی لاپروائی کی وجہ سے اس بے چاری بچی کے ساتھ بھی زیادتی ہو رہی ہے۔ پچھلے دو سالوں سے وہ تیرے نام کی انگوٹھی پہنے بیٹھی ہے۔ وہ بھلے لوگ اور کب تک تیرا انتظار کریں۔"

"وہ میرا انتظار کرنے پر مجبور ہیں اماں۔ بھلا مجھ جیسا اچھا رشتہ انہیں دوبارہ ملے گا اور اگر انہیں شادی کی جلدی ہے تو میں تیار ہوں۔ مگر میری نوکری نہ ہونے کی صورت میں ان کی بیٹی کو نوکری کر کے اس گھر کو چلانا ہوگا۔ آخر کو وہ بی اے پاس ہے۔ کسی بھی اسکول میں اسے آسانی سے ملازمت مل جائے گی۔"

"تو عورت کی کمائی کھائے گا کیا؟" شمیم آپا کو اس کی سوچ پر حیرت ہوئی۔

"آج کل کے زمانے میں لڑکیاں بھی اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ اپنی کمائی سے اپنے شوہر اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔ تو کیا حرج ہے اگر وہ بھی مہنگائی کے اس دور میں میرا بوجھ بانٹ لے۔۔۔۔ اور پھر میں اسے مستقل ملازمت کا تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ جب تک میری ملازمت نہ لگے' وہ نوکری کر سکتی ہے۔" زبیر بڑی ڈھٹائی سے اپنا موقف بیان کرتا۔

مگر اس کی اس سوچ کا ذکر شمیم آپا نے کبھی ایمان کے گھر والوں سے نہیں کیا تھا۔ اگر وہ یہ ذکر کر دیتیں تو ہو سکتا ہے ظفری اس رشتے کو ختم کرنے میں پل بھر بھی نہ سوچتا۔ کون بھائی گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی بہن کو ایک ایسے شخص سے بیاہے' جو اپنے گھر کا بوجھ اپنی بیوی سے اٹھوانا چاہتا ہو۔

بس وہ ہر بار ایمان کی ماں جی سے یہی کہہ دیتیں۔

"زبیر کی اچھی نوکری لگتے ہی ایمان کو بیاہ لے جاؤں گی۔"

"مگر پچھلے دنوں تو زبیر اچھی بھلی نوکری کر رہا تھا۔" ماں جی کو سب خبر تھی۔

"وہ نوکری تو اس نے پچھلے ہفتے ہی چھوڑ دی۔ دراصل ایک تو تنخواہ اچھی نہیں تھی۔ دوسرے مالک بھی بہت سخت گیر تھا۔ تیسرے رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔"

شمیم آپا' زبیر کے ملازمت چھوڑنے کی ایک نہیں' کئی وجوہات بتا دیتی تھیں۔

"لیکن آپ فکر نہ کریں۔ زبیر بہت جلد دوسری نوکری ڈھونڈ لے گا۔ ماشاءاللہ سے میرا بچہ اتنا قابل' اتنا لائق ہے کہ اسے نوکری کی کیا فکر۔۔۔۔ اچھا آپ یہ بات چھوڑیں اور یہ بتائیں کیا آپ نے بچی کا جہیز مکمل کر لیا؟"

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھتیں۔

چھوٹے سے گھر میں جہیز کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نہ فریج' نہ ٹی وی نہ واشنگ مشین۔ نہ ڈیپ فریزر۔ انہوں نے تو۔۔۔۔ اچھے خاصے جہیز کی توقع لگائی تھی۔ خیر سے ظفری ڈاکٹر بن رہا تھا اور ساتھ ساتھ ٹیوشنز بھی کرتا تھا۔ ایک ڈاکٹر اپنی بہن کو اچھا جہیز تو دے ہی سکتا تھا۔

"ہم سفید پوش لوگ ہیں شمیم! اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بیٹی کو کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے۔ ظاہر ہے بچی کو خالی ہاتھ تو نہیں بیاہیں گے نا۔" ماں جی بات کرتے ہوئے اپنی سفید پوشی کا ذکر بھی کر ڈالتی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ مگر ذہن میں رکھیے گا۔ ہمارے بھی چار رشتے دار ہیں اور سب ہی کی نظریں زبیر پر ہیں کہ وہ کس خاندان میں شادی کر رہا ہے اور اس کی بیوی اپنے ساتھ کتنا جہیز لائے گی۔"

شمیم آپا کی بات پر ماں جی کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں ابھر آتیں۔

شمیم آپا کی باتیں ایمان کو ناگوار گزرتی تھیں۔ اس لیے ان کے جاتے ہی وہ ماں جی کے سامنے آ جاتی۔

"ماں جی۔ آپ شمیم آپا کو کھل کر کیوں نہیں بتا
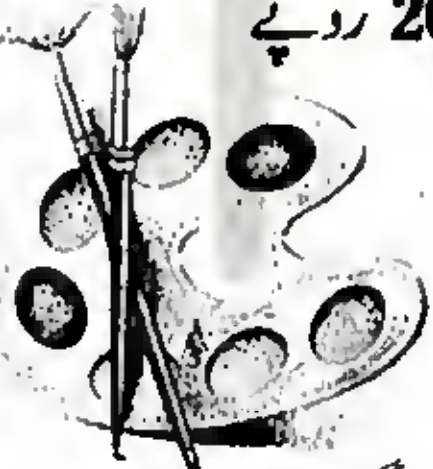
دیتیں کہ وہ ہم سے جہیز کی توقع مت لگائیں۔"
"کیسے کہہ دوں۔ اپنی حیثیت کے مطابق تو تجھے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا نا۔"
"آپ کو ان کی باتوں سے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کچھ نہ کچھ کی توقع نہیں، بلکہ "بہت کچھ" کی توقع لگائے بیٹھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو شادی کے قریب وہ ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے منہ کھول کر اپنی ڈیمانڈز بتا دیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ پہلے سے ہی ان سے کھل کر بات کرلیں۔"
ماں جی کو ایمان کا مشورہ درست معلوم ہوتا۔
"ٹھیک ہے۔ پہلے میں ظفری سے مشورہ کروں گی۔"

☆ ☆ ☆

سیف نے ان دنوں شیرل سے بات کرنا بہت کم کردیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اس سے جتنا دور رہے گا' اس کی زبان اور آنکھوں سے اتنا ہی محفوظ ہو جائے گا۔
وہ طے کرچکا تھا وہ واقعی اس گھر سے اور اس لڑکی کی زندگی سے چلا ہو جائے گا۔ وہ کہیں اور اپنے رہنے کا بندوبست کرلے گا' جب اس گھر سے نکلنا ٹھہرا تو انتظار کس بات کا۔ وہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلا جائے گا۔ ظفری تو اسے بارہا اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکا تھا۔
"اتنے پریشان کیوں ہو۔ میرا گھر بھی تمہارا ہے۔ بلا جھجک چلے آؤ۔"
"میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتا یار۔" اس نے اپنی پیشانی کو انگوٹھے سے رگڑا تھا۔
"غیروں والی باتیں مت کرو۔ دونوں بھائی مل کر اس چھوٹے سے گھر میں رہیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گھر تمہارے شایان شان نہیں۔ تم محلوں میں رہنے والے اور میں ایک جھونپڑی کا باسی اور....."
"بکو مت۔" ظفری کی بات پر وہ تپ گیا۔ "وقعت انسان کی ہوتی ہے۔ اونچے محلوں کی نہیں۔"

"تو پھر سوچنا کیسا؟ تم گھر آجاؤ گے تو مجھے بڑا سہارا مل جائے گا۔ ایمان کی شادی آنے والے دنوں میں طے ہو جائے گی تو دونوں بھائی مل کر اس کی شادی کی ارینجمنٹ کریں گے۔ میں اکیلا کہاں بھاگ دوڑ کرتا پھروں گا۔"

"بے فکر ہو جاؤ۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں سارا انتظام سنبھال لوں گا۔" اس نے ظفری کو تسلی دی تھی۔

تیزی سے ادھر ادھر ٹہلتے وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا۔ وارڈ روب کھول کر اس نے نچلے خانے سے بیگ گھسیٹا اور کپڑوں کے گولے بنا بنا کر بیگ میں ٹھونسنے لگا۔ جب ہی پشت پر شیرل کی آواز ابھری۔

"کہیں جا رہے ہو کیا؟"

"معلوم نہیں۔" اس کے ہاتھوں میں مزید تیزی آگئی۔

"یوں عورتوں کی طرح نخرے دکھاتے ہوئے سخت زہر لگ رہے ہو۔"

وہ رک گیا۔ "زہر کو زہر ہی مارتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو شیرل!" وہ آج سارا حساب بے باق کر دینا چاہتا تھا۔

"ایک سرکش گھوڑا' جس کی لگامیں مجھے سونپ دی گئی ہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اس کی یہ ہنسی جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔

"ایک بات یاد رکھیے گا مس' سرکش گھوڑا' خود پر سوار ہونے والے کو زمین پر اتنی زور سے پٹخ دیا کرتا ہے کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ اور جہاں تک رہا سوال لگاموں کا۔ وہ تو کسی وقت بھی چھڑائی جا سکتی ہیں۔"

"مگر تم اپنی لگامیں مجھ سے نہیں چھڑا سکو گے۔" وہ بہت پر یقین تھی۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" وہ دانت پیستے بولا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' تم ذہنی طور پر بیمار ہو' تمہارے اندر کا کمپلیکس تمہیں چین نہیں لینے دیتا۔ تم جس نچلی سطح پر آن رکے ہو' چاہتے ہو کہ باقی سب بھی اسی سطح پر آجائیں۔ تو یاد رکھو سیف علی۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے تمہیں اپنا قد بڑھانا ہو گا۔ تمہیں میرے لیول تک آنا ہو گا۔"

"ونہہ۔۔۔" سیف نے غصے سے ہنکارا بھرا اور بیگ اٹھانے کو مڑا۔

"غالباً" تم کہیں جا رہے ہو؟"

"تم سے مطلب۔"

"جا رہے ہو تو اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہیں روک لوں گی۔۔۔؟" شیرل کی نخوت سے بھرپور آواز نے اس کا امی کے کمرے تک پیچھا کیا۔

"خیریت بیٹا۔" اس کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر امی نے ہول کر پوچھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے امی کہ اس گھر سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔"

"جذباتی نہیں ہوتے بیٹا۔ زندگی جذبات سے نہیں گزرتی۔ اس کے لیے کسی ٹھوس لائحہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس گھر سے نکل کر کہاں جاؤ گے۔ کچھ وقت کی بات ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد سعید بھائی تمہیں کلینک کھول دیں گے اور۔۔۔"

"پلیز امی۔" وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ۔۔۔ ہولے سے چلایا تھا۔ "اب ان سے ایک پیسے کی مدد بھی قبول کرنا میرے لیے حرام ہے۔ آپ کیا چاہتی ہیں اپنے باپ کے احسان کے بدلے میں شیرل ساری زندگی میرا مذاق اڑاتی رہے' مجھے ذلیل کرتی رہے۔۔۔ نہیں امی۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا اور اب آپ مجھے روکیں گی بھی نہیں۔" اس کا لہجہ پتھریلا تھا۔

"کہاں جاؤ گے تم؟"

"ظفری کی طرف۔ یہاں مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہیں تو مجھے مت روکیے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر آپ کو بلوالوں گا۔ اور ان

شاءاللہ کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ یہاں رہتے ہوئے میں بودا اور کمزور ہی رہوں گا۔" اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ میں اس کا عزم پوشیدہ تھا۔

امی چپ رہ گئیں۔

"تو تم فیصلہ کر چکے ہو۔" ان کا لہجہ پست تھا۔

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

امی نے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔ وہ بیٹے کو سمجھ رہی تھیں۔ اس اضطراب سے بھی واقف تھیں جو مسلسل اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہنا۔ اور اپنا خیال رکھنا۔" دل پر صبر کی سل رکھتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

"خدا حافظ امی۔"

وسیع و عریض لان عبور کرنے کے بعد جب وہ پورچ میں کھڑی بائیک کی طرف بڑھا تو شیرل کو مقابل پایا۔

"اس گھر کی ہر چیز سے ناتا توڑ کر جا رہے ہو تو پھر اس بائیک پر حق جمانے سے ـــــ یہ بھی تو میرے پاپا کی عطا کردہ ہے۔"

وہ ایک دو لمحے سن سا کھڑا رہ گیا۔ پھر جیسے بت میں جان پڑ گئی۔

"مائنڈ یو شیرل سعید۔ یہ بائیک میری اپنی ہے۔ میرے بابا کے زمانے کی۔ ان ہی کے پیسوں سے خریدی ہوئی۔۔۔۔"

"اور اس میں ڈالا ہوا پیٹرول' وہ کس کے پیسوں کا ہے۔"

اس کا ـــــ تیکھا لہجہ اسے اندر تک سلگا گیا۔ وہ اپنی بے انتہا روشن سنہری آنکھیں اس پر مرکوز کیے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اس بائیک سے دستبردار ہو رہا ہوں' بالکل اسی طرح' جس طرح میں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حالانکہ میرے بابا اور تمہارے پاپا نے تم پر میرے نام کی **اسٹیمپ** لگائی تھی۔" وہ جیسے بہت چبا چبا کر بولا تھا۔ شیرل کو پتنگے سے لگ گئے۔

"میں کوئی فالتو شے نہیں ہوں جسے تم جیسے اپنی مرضی سے توڑ پھوڑ دیں۔ تمہیں چھوڑنے اور اپنانے کا حق میرا ہے۔۔۔۔"

"اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دو۔" بیگ پر اپنی گرفت مضبوط کیے وہ گیٹ کی جانب بڑھا۔

"سنو۔۔۔" وحشت کے اس پل میں انتہائی تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے سیف علی کا بازو تھام لیا۔

"تم اپنے رویے کی وضاحت کیے بغیر اس طرح نہیں جا سکتے۔"

"کون سا رویہ۔" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ رویہ تو اس نے بدلا تھا۔ انداز تو اس کے تکلیف دہ ہو گئے تھے۔

"تم یوں' اس طرح یہ گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتے اور میں اپنی توہین کسی قیمت پر برداشت نہیں کروں گی۔" وہ چلا رہی تھی۔

"میں نے تمہاری کون سی توہین کی ہے۔"

"تم پر شروع سے میرا حق ہے۔" وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلا رہی تھی۔

سیف نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ رات کے گہرے ہوتے اندھیرے میں وہ اس پر اپنا پورا پورا حق جما رہی تھی' بے اختیار اس کا دل اس کٹھور لڑکی کے لیے پگھل سا گیا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بے حد سنگدلی سے بولا۔

"میں کسی حق کو نہیں مانتا۔"

"سیف۔" وہ چیخی۔

"چلاؤ مت۔" اس نے شیرل کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔"

"جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اور آئندہ اپنی صورت کبھی مت دکھانا۔" وہ وحشت زدہ ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ مگر تم یاد رکھنا' خود پسندی کی آگ بڑی خطرناک ہوتی ہے' جلنے والا جل جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔" وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔

"سنو۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ بے پناہ نفرت۔

آئی ہیٹ یو۔"

سیاہ گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے اس کی غصیلی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ تلخی سے ہنس دیا۔ اسے اندازہ تھا۔ ایک نہ ایک دن اسی قسم کے جملے سننے کو ملیں گے۔

"تم مجھ سے نفرت کرتی ہو' لیکن میں بھی تمہیں بتادوں گا کہ نفرت کیسے کی جاتی ہے؟؟"

محبت تو ہر حال میں دوسرے کو قبول کرلیتی ہے۔

تو پھر یقیناً" اس نے محبت نہیں کی تھی۔ وہ شاید اب تک اس کے جذبات سے کھیلتی رہی تھی۔ اسے بے وقوف بناتی رہی تھی۔

وہ حد سے زیادہ دل برداشتہ تھا۔ اور اس کے یوں بدل جانے پر مایوس بھی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند ہی دھند تھی۔ مگر وہ چلتا چلا جارہا تھا۔ تب ہی سائیڈ سے تیز رفتاری سے اچانک قریب آجانے والی گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے' لیکن وہ پھر بھی دھکا لگنے سے اچھل کر دور جاگرا۔

آخری احساس اس کے ذہن میں' وجود میں اٹھنے والی ٹیسوں کا تھا۔

شدید درد کی ایک تیز لہر بل کھاتی اٹھی تو اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں' چند لمحے خالی الذہن پڑے رہنے کے بعد سارے منظر نگاہوں کے سامنے واضح ہوگئے۔

"سیف۔ ٹھیک تو ہے....." یہ ظفری کی آواز تھی۔ اس نے گردن گھمائی۔ وہ مہربان مسکراہٹ لیے قریب پڑے بنچ پر بیٹھا تھا۔

"ظفری..... میں..... میں....."

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جس گاڑی سے تم ٹکرائے وہ ہاشم کی تھی' تمہیں اسپتال ایڈمٹ کرانے کے بعد وہ مجھے لے آیا۔"

"ہاشم کون؟؟" گھومتے سر سمیت اس نے بدقت تمام پوچھا۔

"تم اسے نہیں جانتے۔ ہمارا جونیئر ہے۔"

"لیکن....." اس نے ٹانگ ہلانا چاہی' مگر پھر ساکت رہ گیا۔ اس کی بے جان ٹانگ۔ کیا کاٹ دی گئی تھی۔ اس خیال نے جیسے اس کے سارے وجود کو برف کی مانند جما سا دیا۔

"میری ٹانگ ظفری..... میری ٹانگ کو کیا ہوا؟" درد کی تمام تر شدتوں کو بھلا کر وہ پوچھنے لگا۔ اس کے لہجے میں اس کے اندر کا خوف جھانک رہا تھا۔

"ڈاکٹر نے پلاستر چڑھا دیا ہے۔ ٹخنے کی ہڈی میں فریکچر ہے۔ کافی دن لگ جائیں گے' ٹھیک ہونے میں....."

اور پھر کئی دن گزر گئے۔ ظفری بلاناغہ حاضری دینے چلا آتا تھا۔ کبھی مرغی کی یخنی لے کر اور کبھی بھنا ہوا قیمہ لے کر' اس کے بیڈ کے ساتھ والی ٹیبل وہ پھلوں سے خالی ہونے نہیں دیتا تھا۔

وہ کئی بار ظفری سے شرمندہ ہوا۔

"یار تو اتنا کچھ مت کیا کر میرے لیے۔ میں شرمندہ ہوتا ہوں۔"

"شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے سیف کہ میں تیرے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرپارہا۔"

"اس سے زیادہ اور کیا کرے گا۔ یار تو یہ یخنی اور قیمہ مت لایا کر۔"

"ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ اس سے زخم جلد بھر جائیں گے۔"

"یار ایک کام کر۔ تو مجھے گھر لے چل۔ اس طرح خرچہ بھی کم ہوجائے گا' اور تو مفت کے چکر لگانے سے بھی بچ جائے گا۔"

"رہا ناں وہی گھامڑ کا گھامڑ۔ پیارے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ تو میرا یار ہے۔ تو مجھ پر بوجھ نہیں ہے اور سن لے..... ایک مرتبہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے تو سب کچھ سود سمیت وصول کرلوں گا۔ خاطر جمع رکھ۔"

"بڑا ذلیل ہے پھر تو۔"

"ابے الو۔ مابدولت کی ذلالت ناپنے کا کوئی آلہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔"

سیف نے حادثے کی اطلاع گھر پر نہیں دی تھی۔

"ایک بات سچ سچ بتائیں۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں' میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔"

"آپ بالکل ٹھیک ہیں سیف صاحب۔ کل انشاء اللہ آپ کی ٹانگ کا ایکسرے ہو جائے۔ پھر بہتر نتائج کی توقع ہے۔"

"اور اگر میں ساری عمر کے لیے معذور ہو گیا تو۔ کبھی چل نہ سکا تو۔۔؟" وہ بے حد خوف زدہ سا ہو گیا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے شیرل کا کھلکھلاتا طنزیہ چہرہ لہرا گیا۔

"یہ شیرل کون ہے۔" وہ غالباً" باآواز بلند سوچ رہا تھا۔ جب ہی اس کے لبوں سے شیرل کا نام سن کر سامنے کھڑی لڑکی پوچھ بیٹھی تھی۔

وہ لمحہ بھر کو ٹھٹک کر ہنس دیا۔

"میری بچپن کی منگیتر۔ اس سے زیادہ مزید میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ بتائیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔۔؟"

"اللہ کی ذات پر کامل بھروسا ہونا چاہیے۔"

"خدا کی ذات پر تو بھروسا ہے لیکن اپنی تقدیر پر نہیں۔" اس کی روشن روشن سنہری آنکھیں مایوسیوں میں ڈوب گئیں۔

"آپ کچھ پڑھنا پسند کریں گے۔ میرا مطلب کوئی کتاب وغیرہ۔"

"کیسی کتاب۔"

"شاعری سے تو دلچسپی ہو گی آپ کو۔"

"ارے کہاں۔ ہم میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والے بے حد خشک مزاج ہوتے ہیں۔"

"ریئلی۔ لیکن آپ کو دیکھ کر معلوم نہیں ہوتا۔"

"وہ کیوں۔" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

مقابل کی گہری آنکھیں خود پر جمی دیکھ کر وہ بے انتہا گڑبڑا سی گئی۔

"بس ایسے ہی۔ اندازہ تھا میرا۔"

اسے اس لڑکی کا یوں گڑبڑانا بہت بھایا۔ پہلی بار اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مجروح اور بے بس حالت میں وہ اسے سکون کا احساس دلا رہی تھی۔

سیف نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

وقت کے کینوس پر دو الگ الگ نظارے ایک ساتھ اس کی نظروں کے سامنے جھلملا گئے۔

ایک وہ تھی۔ جو بچپن کی ساتھی ہونے کا حق رکھتی تھی۔ حسن و جمال کا مرقع' جسے دل کی تمام تر شدتوں سمیت چاہا تھا۔

اور ایک یہ تھی قرینے سے سر پر اوڑھے گئے آنچل کے ہالے میں سانولی ـــ اور سیاہ آنکھوں والی جس کے لہجے کی نزاہت حیا بخش تھی اس نے بے اختیار سوچا۔

☆ ☆ ☆

شمیم آپا آئی تھیں۔ وہ زبیر کی نوکری کی خوشخبری لائی تھیں۔ ماں جی نے سنا تو خوش ہو گئیں۔ اب یقیناً" ایمان کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پچھلے دو سالوں سے منگنی تھی۔ وہ رشتہ داروں اور محلے داروں کو جواب دے دے کر تھک چکی تھیں کہ ایمان کی شادی کی تاخیر کی وجہ کیا ہے۔ "ماشاء اللہ سے اچھی تنخواہ ہے اور دیگر سہولیات الگ۔ اس کے باس کا کہنا ہے کہ اگر وہ دل لگا کر کام کرے گا' تو اسے رہنے کو فلیٹ بھی ملے گا۔ اور آنے جانے کے لیے انہوں نے موٹر سائیکل تو ابھی سے دے دی ہے۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔" ماں جی خوش ہو گئیں۔

"اللہ اسے مزید ترقی دے۔ وہ دن دوگنی' رات چوگنی ترقی کرے۔"

"بس اب میں اپنی امانت جلد ہی لے جاؤں گی۔" شمیم آپا نے جیسے ان کی سوچ پڑھ لی تھی۔

"اب مجھ سے اس عمر میں گھرداری نہیں کی جاتی۔ ایمان آئے اور اپنے گھر کو بھی سنبھالے اور اپنے شوہر کو بھی۔"

اسی دم سر پر دوپٹہ جمائے ایمان چائے کی ٹرے لیے اندر چلی آئی۔ اس نے جلدی سے پکوڑے تل لیے تھے۔ اور محلے کے بچے سے سموسے بھی منگوا لیے تھے۔ ایک تو شمیم آپا پہلے سے اطلاع دے کر آیا کریں

وہ ای کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں اس پر شدید قسم کا ڈیپریشن طاری تھا۔ وہ محض بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ سارے ارادے' سارے منصوبے دھرے رہ گئے تھے۔ وہ بہتر زندگی کی تلاش میں دربدر ہوا تھا' شیرل کی نظروں میں اونچا ہونا چاہتا تھا' لیکن شاید وقت اور قسمت اس کے خلاف تھی۔

جسم ساری پٹیوں سے ایک ایک کر کے آزاد ہو چلا تھا' لیکن ٹانگ... وہ بالکل اپاہج ہو کر رہ گیا ایسے میں کسی ہمدرد اور غمگسار کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ وہ اگر شیرل کو بلا لے تو۔ کئی بار دل نے شدت سے خواہش کی کہ وہ اسے کال کرلے یا پھر اسے موبائل پر ایک ایس ایم ایس ہی کر ڈالے۔

کئی بار اس کی انگلیاں موبائل کے "کی پیڈ" پر تھرکتیں' مگر وہ ہر بار میسج لکھ کر مٹا ڈالتا تھا۔ وہ تو شیرل کو میسج نہ کرسکا البتہ شیرل کی طرف سے دل جلانے والا پیغام موصول ہو گیا۔

"آئی ہیٹ یو۔" اس ظالم لڑکی نے وہی لکھا تھا' جو گھر سے نکلتے وقت اس کے کانوں میں انڈیلا تھا۔

بہت بحث و دلائل کے بعد ظفری اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ دو کمروں اور ایک صحن کا چھوٹا سا گھر تھا۔ بہت صاف ستھرے اور نفاست سے ترتیب شدہ گھر کے چھوٹے سے سیڑھیوں کے قریب واقع اس کمرے میں بستر پر ظفری کی مدد سے دراز ہوتے ہوئے اس نے بے حد طمانیت محسوس کی۔

صبح آنکھ کھلی تو پھر...

مایوسیوں نے جیسے یک لخت اس پر یلغار کر دی۔ اس نے پاؤں کو حرکت دی تو درد کی ایک شدید لہر پورے وجود کو کاٹ کر رہ گئی۔

اس کے لبوں سے کراہ سی نکل گئی۔

ایسا آخر کب تک چلے گا؟ کب تک آخر...؟

بہت دیر بعد سلگتی سوچوں اور مایوسیوں کے اندھیروں سے ابھر کر اس نے سامنے دروازے کی جانب دیکھا' روشنی کی ایک کرن مقابل تھی۔

ایک تابندہ و درخشاں کرن... وہ ہاتھوں میں ٹرے تھامے کھڑی تھی۔ لبوں پر مہربان مسکراہٹ تھی۔

"آپ ناشتا کرلیجیے..." لہجہ بھی بے حد مدھم اور نرم تھا۔

وہ شاید ظفری کی بہن تھی۔

اس نے بے حد شرافت سے' اچھے بچوں کی طرح ناشتا کرنے کے بعد دوا کھالی تو وہ واپس جانے کو مڑی۔

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔"

"ضرور... مجھے ایمان کہتے ہیں۔" یہ لڑکی بھی اپنے بھائی کی طرح سے بے حد نرم خو اور ہمدرد معلوم ہو رہی تھی۔

کھڑکی سے باہر کھیلتے بچوں کی آوازوں پر اس نے اپنے اندر خوشگوار سی کیفیت محسوس کی۔ یہ شور کانوں کو برا نہیں لگ رہا تھا' بلکہ ہمت اور زندگی کی نوید دے رہا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"ہیلو۔ ببر شیر۔ کیا ہو رہا ہے۔" ظفری اندر چلا آیا۔ ہنستا ہوا' کھلکھلاتا' ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش۔

"بستر پر لیٹے لیٹے ہوئے کیا کیا جاسکتا ہے۔" اس نے الٹا سوال داغ دیا۔

"بہت کچھ' مثلاً" مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے جاسکتے ہیں۔"

"پلیز کچھ کرو۔ میں واقعی اس حالت سے تنگ آچکا ہوں۔"

"صبرا" بچہ صبرا"۔ آپ کے ٹخنے کا ایکسرے ہوگا۔ تب ہی صحیح معلوم ہوسکے گا کہ مزید کتنے دن اور آپ کو بستر پر بیٹھ کر چین کا طبلہ بجانا ہے۔"

"چین کی بانسری ہوتی ہے۔" اس نے تصحیح کی۔

"ارے بھئی۔ اردو اپنی ہے اور ہم اردو کے۔ لہٰذا سب چلتا ہے۔ اچھا تم بیٹھ کر مزید مکھیاں مارو۔ میں ذرا روزی روٹی کی فکر کر آؤں۔" وہ جس تیزی سے آیا تھا' اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ اور وہ جھلا کر رہ گیا۔

"ظفری۔ ظفری" ظفری کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی اس نے آواز لگائی۔

"ظفری بھائی ٹیوشن پڑھانے گئے ہیں' کوئی کام ہے تو بتائیں۔" وہ بے حد شائستہ اطوار لڑکی مخاطب تھی۔

تو چائے پانی کی تیاری میں اتنی پریشانی کا سامنا تو نہ کرنا پڑے۔ اسے ان کا وقت بے وقت ٹپک پڑنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

"یہ پکوڑے لیجیے آپا۔" انہیں چائے کی پیالی بنا کر دینے کے بعد ایمان نے پکوڑوں کی پلیٹ ان کی جانب بڑھائی تو دعاؤں کا ایک طویل دورانیہ شروع ہو گیا۔

"جیتی رہ بچی۔ اللہ لمبی حیاتی کرے۔ تیرا آنا ہمارے گھر کے لیے مبارک ثابت ہو۔"

"آمین۔" ماں جی نے کہا۔

"آپ نے کوئی کرایہ دار رکھ لیا ہے کیا؟"

"نہیں ظفری کا کوئی زخمی دوست ہے۔"

ماں جی نے بتایا تو شمیم آپا کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں سی ابھر آئیں۔

"اس زخمی کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے کیا۔؟ مجھے محلے والوں سے ہی پتا چلا ہے کہ جوان جہان لڑکا ہے۔ جسے تم نے گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔ اور بھلا یہ ظفری کی عقل کو کیا ہوا؟ جوان بہن کی موجودگی میں اپنے کسی دوست کو گھر میں گھسا لیا۔"

اس کی باتوں پر ماں جی کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

"بس چند دنوں کی بات ہے۔ صحت یاب ہوتے ہی چلا جائے گا۔ دراصل بیچارے کی ٹانگ ٹوٹی ہے۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اچھا چھوڑو۔ تم بھی کیسی باتوں میں الجھ گئیں۔ مجھے بتاؤ۔ شادی کی کون سی تاریخ تمہارے ذہن میں ہے۔" ماں جی نے شمیم آپا کا دھیان بٹایا تو وہ بولیں۔

"میرے خیال میں دو ماہ کے بعد کی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی ظفری سے مشورہ کرلوں۔"

"ضرور۔"

شام کو ظفری آیا تو ماں جی کا متفکر چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا اور ماتھے پر تردد کی لکیریں۔

"کیا ہوا ماں جی۔"

"تیرا یہ دوست یہاں کب تک پڑا رہے گا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" ظفری چونکا۔

"آج شمیم آئی تھی ایمان کی شادی کی تاریخ لینے۔ وہی کرید کرید کر تیرے دوست کے بارے میں پوچھتی رہی اور کہہ گئی ہے کہ محلے والے تیرے دوست کی موجودگی پر سو طرح کی باتیں بنا رہے ہیں کہ جوان بہن کی موجودگی میں ظفری نے اپنے کسی دوست کو رکھ چھوڑا ہے۔ ہمارے پاس ایک عزت ہی تو ہے ظفری۔ بہتر ہوگا۔ اگر تو اس لڑکے کو کہہ دے کہ وہ اپنا انتظام کہیں اور کرلے۔"

"ماں جی۔ وہ بہت شریف اور اونچے گھرانے کا لڑکا ہے۔ ان دنوں حالات کا مارا ہے اس لیے میری طرف چلا آیا۔ اب یہ مناسب نہیں لگتا کہ مشکل وقت میں میں اپنے دوست کے کام نہ آؤں اور اسے چلتا کروں۔ وہ میرا جگری یار ہے ماں جی۔ پلیز کسی کی فضول بات پر کان نہ دھریں۔"

ہمیں اسی محلے میں رہنا ہے۔ ظفر پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ محلے والوں کی باتوں کا اثر قبول نہ کریں۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینا مسائل کا حل نہیں ہوتا۔"

"اوفوہ ماں جی۔ آپ تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں۔" وہ جھلایا تھا۔

"مجھے اپنی دوستی کے سامنے شرمندہ مت کرائیں۔ مجھے اپنے دوست اور اپنی بہن دونوں پر خود سے زیادہ اعتماد ہے۔ اور پھر سیف منگنی شدہ ہے۔ ایمان کی شادی بھی ہونے والی ہے۔ آپ خواہ مخواہ محلے والوں اور دنیا کی باتوں میں آکر اس نیکی کو برباد نہ کریں۔ میں سیفو کو کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ وہ جب تک چاہے یہاں رہے۔"

وہ اپنی بات کا ردعمل دیکھے بغیر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

سیف کے ٹخنے کا ایکسرے لے لیا گیا تھا۔ فریکچر تقریباً" ٹھیک ہو چکا تھا ڈاکٹرز نے معمولی ایکسرسائز بتائی تھی۔

ظفری نے یہ اطلاع بہم پہنچائی تو اس کا دل چاہا کہ

اٹھ کر خوشی سے ایک ٹانگ پر ناچ لے۔ اس کے دل سے ساری مایوسیاں' ہر قسم کے خدشات رفع ہو گئے۔

ایمان نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر خوشیوں کے اتنے رنگ دیکھے تھے' اس سنجیدہ سے چڑچڑے بندے کو مسکراتے دیکھا تھا' اسے خوش دیکھ کر اس کا اپنا دل بھی خوشی سے بھر گیا' پتا نہیں کیوں۔؟

وہ اداسیوں کے بھنور سے نکل آیا تھا۔ اس میں ظفری اور ایمان دونوں پیش پیش تھے۔ تکیے سے ٹیک لگا کر شہزادوں کی طرح اپنی خدمت کرواتے' وہ بے طرح شرمندہ ہوتا رہتا۔

"میں بہت زیادہ زیر بار ہو رہا ہوں۔" وہ کھانا لے کر آئی تو اس نے احساس تشکر سے مغلوب ہو کر کہا۔

"مت بھولیے۔ آپ بیمار ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ظفری بھائی کے دوست ہیں۔ لہٰذا دونوں طرح سے آپ کی خدمت میرا فرض بن جاتا ہے۔"

"لیکن پھر بھی۔" وہ رک گیا۔

"یہ بتایئے اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ٹخنے میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہوتی۔"

"ارے نہیں۔ اب تو میں آسانی سے اسے ادھر ادھر حرکت دے سکتا ہوں۔ ان شاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر ایک دو قدم چلنے بھی لگوں گا۔"

"اس میں آپ کی ہمت کا زیادہ دخل ہے۔ آپ بہت بہادر ہیں۔"

"ارے کہاں۔ میں تو بہت جلد دل چھوڑ دینے والوں میں سے ہوں۔ بس اچھے اور پُر خلوص دوستوں اور ساتھیوں کی عنایتوں کے طفیل اب تک حوصلہ مند ہوں۔"

"میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" وہ کہہ کر چلی گئی۔

"آپ کو تکلیف ہو گی پلیز۔ اتنے دنوں سے میں آپ پر بوجھ۔" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

ہلکے سے کھٹکے پر اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ ہاتھ میں چائے کے دو مگ لیے کھڑی تھی۔

"آپ چائے پییں۔

میں اتنے میں کمرہ ترتیب دے لوں۔

"میں نے آپ کے کمرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔ آئی مین جگہ کی تنگی کی وجہ سے۔"

"دل کھلے اور کشادہ ہوں تو جگہ بہت سیف صاحب۔" کبھی کبھی وہ بہت گہری باتیں کر جاتی تھی۔ وہ اس کے الفاظ کو معنی کا جامہ پہنانے کی کوشش میں لگا رہ جاتا۔

"میرے خیال میں رسمی جملے استعمال کرنا آپ کی مجبوری ہے۔" وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں اتنا بے ساختہ پن تھا کہ سیف لمحہ بھر کر خاموش رہ گیا۔

"سوری۔" وہ جھینپ گئی۔

"نہیں۔ مجھے آپ کا ہنسنا اچھا لگا۔ یوں جیسے گھرے اندھیرے میں جگنو چمک اٹھیں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"آپ شاعری کرنے لگے۔ میرے خیال میں یہ نیک شگون ہے۔ آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو رہے ہیں۔"

"آپ دل میں شکر کر رہی ہوں گی کہ بلا سے جلد چھٹکارا مل جائے گا۔"

اس کی بات پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
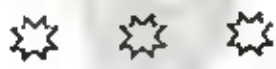
وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ لیکن ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق یہ لنگڑاہٹ آہستہ آہستہ جائے گی۔

اس نے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اس چھوٹے سے گھر کے اندر باہر کئی چکر لگا لیے تھے۔

اس نے کالج جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوا تھا۔ اس لیے دن رات کتابوں میں مغز ماری میں مصروف رہتا۔ یا پھر ظفری اور ماں جی کے ساتھ گپ شپ لگا لیتا۔

ماں جی کو یہ لڑکا بھلا مانس لگا تھا۔ شمیم آپا کی باتوں

نے ان کے دل میں جس قسم کے وسوسے پیدا کردیے تھے' وہ سارے وسوسے اس نوجوان سے مل کر رفع ہوگئے تھے۔ وہ بہت تہذیب یافتہ اور بیبا تھا۔ دھیمے دھیمے انداز میں گفتگو کرتا وہ دل کے بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔ بہت اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ یوں جیسے وہ ازل سے اس گھر میں رہتا چلا آرہا ہو۔ وہ انہیں بالکل ظفری کی طرح سے عزیز ہوگیا تھا۔

''ماں جی۔ آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی امی یاد آجاتی ہیں۔'' وہ ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے کہتا تھا۔

''یہ تم نے اپنی ماں کو کس امتحان میں ڈال دیا ہے پتر۔ کبھی کبھی جاکر اسے مل آیا کر۔ تاکہ اس کی ممتا کی تسکین ہوسکے۔''

ان کی بات پر لمحہ بھر کو ایک تاریک سا سایہ اس کے چہرے پر لہراگیا۔

''جس دن کچھ بن جاؤں گا' تب ہی انہیں اپنی صورت دکھاؤں گا۔ میں گھر سے یہی عزم لے کر نکلا تھا۔ اور خصوصاً'' وہ لڑکی شیرل۔''

''وہ تمہاری منگیتر ہے پتر۔'' ماں جی کو ظفری نے سب بتادیا تھا۔

مگر اس دن کالج میں شیرل سے سامنا ہوتے ہی جیسے یقین کا دیا بجھ سا گیا۔

وہ کلاس سے باہر نکل کر کاریڈور میں آیا تھا' جب شیرل اس کے سامنے آگئی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ تروتازہ ہشاش بشاش اور حسین تھی۔

اسے اتنے عرصہ بعد دیکھ کر نہ وہ چونکی تھی اور نہ ہی کسی لگاوٹ کا اظہار کیا تھا۔ البتہ اس کی چال کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

''تم اتنے دن کہاں غائب رہے اور یہ تمہاری چال کو کیا ہوا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

''اونچی اڑان بھرنے کے چکر میں کیا زمین پر آرہے اور اپنی ٹانگ تڑوالی۔'' وہ کچوکے لگارہی تھی۔

ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور پیشانی کی سبز رگ ابھر آئی تھی۔

''اس طرح چپ کیوں کھڑے ہو۔ پہلے تو خوب بولتے تھے۔ چند دنوں کی ٹھوکروں نے کیا سارے کس بل نکال دیے۔'' وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

وہ خاموشی سے ہولے ہولے کاریڈور کے انتہائی سرے پر آگیا' شدت ضبط سے اس کی سنہری آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

یہ محض آج کی بات نہیں ہے۔ جب تک اس کا فائنل نہیں ہوجاتا۔ اس سے اس کا سامنا روز ہوگا۔ اسے اس کی بدتمیزی کو پس پشت ڈال کر صرف اور صرف اپنے مقصد پر توجہ دینی چاہیے۔

وہ گھر لوٹا تو بہت بددل تھا۔ شکر ہے ماں جی سے سامنا نہیں ہوا۔ ورنہ وہ اس کا چہرہ پڑھ لیتیں۔ وہ کسی رشتے دار سے ملنے گئی تھیں۔

وہ افسردہ تھا اور مضطرب بھی۔

تب ہی ایمان کھانے کی ٹرے اٹھائے سامنے آگئی۔

''آپ جلدی گھر لوٹ آئے۔''

''ہوں۔'' وہ انگلی سے کنپٹیاں دباتے بولا۔

''یہ کھانا کھالیں۔''

''نہیں۔ میرے سر میں درد ہے۔''

''تو پھر چائے لے آؤں۔؟'' وہ مدھم لہجے میں پوچھنے لگی۔

اسے اس لڑکی کے خدمت گزار انداز سے جیسے چڑ سی ہونے لگی۔ یہ لڑکی اتنی نرم گفتار اور ویل مینرڈ کیوں ہے اور۔ اور۔ وہ کانونٹ میں پڑھنے والی لڑکی شیرل اتنی بددماغ' بدتمیز اور جنگلی کیوں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایمان کا وجود' شیرل کے وجود میں ڈھل جائے۔ اور وہ اپنی تمام اذیتوں سے چھٹکارا حاصل کرلے۔

''آپ سردرد کی ٹیبلٹ کھاکر ذرا دیر آرام کرلیں۔ ضرور افاقہ ہوگا۔''

وہ اپنی بات کا ردعمل جانے بغیر باہر نکل گئی اور اگلے ہی لمحے سردرد کی ٹیبلٹ اس کی پھیلی ہتھیلی پر رکھ دی۔ بنا حجت کیے سیف نے گولی کھالی اور چائے پی کر

آنکھیں موند لیں۔ واقعی تھوڑی دیر سو لینے کے بعد طبیعت سنبھل جائے گی۔

وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

"ہیلو بھئی، کہاں گم ہو؟" ظفری کی آواز بوجھل فضاؤں میں چہکار کی مانند گونجی۔

"اور یہ تم کالج سے جلدی کیوں لوٹ آئے تھے۔ احسن بتا رہا تھا کہ تم آدھے دن بعد ہی روپوش ہو گئے تھے۔"

ظفری کی باتوں پر اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

"سیف... کیا ہوا ہے؟ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے۔"

ظفری کی بات پر سیف پلٹا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں اضطراب کی پرچھائیاں تھیں۔ "بتاؤ نا سیفو کیا ہوا ہے؟"

"کالج میں شیرل سے سامنا ہوا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس پر میری دوری نے کچھ تو اثر ڈالا ہو گا۔ مگر اس کی زبان ہنوز زہر اگلتی ہے۔"

"اوہ..." اس کی بات پر ظفری نے جیسے ایک طویل سانس لی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہمارا شان دار کاروبار تباہ ہو گیا۔ محل نما بنگلہ بک گیا۔ میں اس کے باپ کے در پر جا پڑا۔ کیا اس سب میں میری مرضی کا دخل تھا۔ وہ اتنا کیوں نہیں سمجھتی کہ قسمت کے سامنے سب مجبور ہوتے ہیں۔" اس کی آواز جیسے بہت بھاری ہو رہی تھی۔

"ہمت سے کام لو یار..." ظفری نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم گھر جا کر اس سے ملو۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے گھر چھوڑ دینے پر زیادہ بگڑی ہے۔ اسے تمہارے گھر چھوڑ دینے کا زیادہ رنج ہے۔ اس لیے وہ تمہاری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ تمہیں گھر چھوڑنے سے منع کر رہی تھی۔"

"ہاں... ایسی ہی بات ہے۔" اس کا انداز ڈھیلا پڑ گیا۔

"بس تو پھر اس سے جا کر ملو اور اسے منالو۔ محبتوں میں انا اور خودداری نہیں ہوا کرتی میرے یار... تم دونوں میں سے ہی کسی کو قدم آگے بڑھانا ہو گا۔"

"تمہاری باتوں میں وزن ہے ظفری۔" اس نے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔

"اور پھر بہت دن ہو گئے امی سے ملے۔"

"امی سے ملے یا امی کی بھتیجی سے ملے ہوئے۔"

ظفری نے ایک آنکھ دبائی تو وہ جھینپ گیا۔ اس دم دروازے پر کھڑی ایمان نے اس شخص کی جانب دیکھا، جس کا چہرہ اندرونی مسرت کے تحت تمتما رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ یوں ہی تصویر کی طرح ساکت جمی رہی۔

"ویسے کب ملنے جا رہے ہو اس سے" ظفری نے اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔

"کل ہی جاؤں گا، جب انا کو پس پشت ڈالنا ٹھہرا تو نیک کام میں دیر کیسی؟ روٹھے ہوؤں کو جتنی جلدی منا لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔" وہ پُرسوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"گڈ... پہلی بار عقل مندوں کی طرح سوچا ہے تم نے۔"

"عقل مند تو میں شروع سے ہی ہوں۔"

"عقل مند یا عقل بند۔"

"تم سے باتوں میں جیتنا کم از کم میرے لیے بہت ناممکن ہے۔"

اس کا چہرہ تروتازہ تھا۔ شگفتہ اور ہشاش بشاش... اور بے تحاشا روشن روشن گہری آنکھوں میں دنیا جیت لینے کی تمنا اور خواہش... وہ بے حد سستی اور کاہلی سے اسی طرح دروازے میں جمی رہی۔

"کیا بات ہے باگڑ بلی، کوئی کام تھا کیا۔"

اس کی موجودگی کا احساس کرتے ظفری نے گردن گھمائی۔

"وہ ماں جی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"او کے... اور ذرا یہ بتاؤ، کھانا پکا لیا کیا؟"

"نہیں، ماں جی... گھر پر نہیں تھیں اور مجھے میتھی چنتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی۔"

وہ یوں شرمندہ تھی جیسے کوئی نالائق شاگرد حساب کا

سوال حل نہ کرپایا ہو۔

"تم میٹھی رہنے دو' اسے پکانے میں بہت دیر لگے گی اور یہاں بھوک سے جان نکل رہی ہے' تم یوں کرو آملیٹ بنالو۔" ظفری نے دوپٹے سے الجھتی ایمان سے کہا۔

"جی بہتر....." وہ جانے کو پلٹی۔ سیف نے واضح طور پر اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس کیا۔ صبح سے وہ بہت بجھی بجھی سی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں کتنی مرتبہ واضح انداز میں پانی کی ایک تہ بھی ابھری تھی۔ اسے لگتا تھا وہ کسی بھی لمحہ رو دے گی۔

"کیوں ظفری' کیا خیال ہے۔ آج کھانا خود نہ پکالیا جائے۔ ایمان کی چھٹی' ذرا اماں جی اور ایمان پر یہ واضح نہ کردیا جائے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں اور....."

"اور مستقبل قریب میں بہت ہی سگھڑ شوہر ثابت ہوں گے۔" ظفری نے جملہ اچک لیا۔

"بالکل..... بالکل آج فیصلہ ہو جائے گا۔ چلو ایمان بی بی تم آرام کرو۔ آج تمہیں ہمارے ہاتھ کا پکا کھانا ہو گا۔"

آستینیں چڑھا کر وہ سیڑھیاں اتر گیا اور کچن کی جانب چلا۔ ظفری نے بھی پیروی کی۔

"اور اگر میرے پیٹ میں درد ہو گیا تو....." وہ رک کر مسکرائی۔ اس نے چہرے پر طاری افسردگی کو نوچ کر پھینک دیا۔

"تو اپنی ڈاکٹری کس دن کام آئے گی۔ تم پر اپنے سارے گر آزمالیں گے۔"

"گویا آپ لوگوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچنے والی میں پہلی ہستی ہوں گی۔" وہ ان کی حرکات کا معائنہ کرنے ان کے سر پر کچن میں جم گئی۔

سیف نے ہنڈیا چولہے پر چڑھا دی تھی۔ ظفری نے سگھڑ بیبیوں کی طرح آٹا گوندھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ کھانا پکانے کے دوران ان دونوں سے سرزد ہوتی بوکھلاہٹوں سے وہ محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ہنستی بھی رہی۔ اس کی ہنسی نے کتنی ہی بار سیف کو چونکایا۔ یوں ہنستی ہوئی وہ بہت معصوم لگتی تھی۔

"اب تو تمہیں یقین ہو گیا نا کہ ہم بہترین شوہر ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے بے حد پیاری بھابھیوں کا جلدی سے انتخاب کر ڈالو۔" کھانا معدے میں منتقل کرنے کے بعد ظفری نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"بھئی' میں تو ریزرو ہوں۔ تم اپنے لیے کہو۔" سیف مسکرایا۔

"ارے یار تمہاری ریزرویشن بھی بس ایویں ہی ہے' مبہم' مشکوک اور غیر یقینی سی۔"

"تم دیکھنا میرے جاتے ہی سارا معاملہ فٹ ہو جائے گا۔ تمہارے لیے خوش خبری لاؤں گا۔" وہ بہت پر عزم لگ رہا تھا۔

"انتظار رہے گا۔" ظفری نے اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔

کتنے بہت سے رنگ اس کے چہرے پر آئے۔ اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ ایمان نے بڑی گہرائی سے اس کی آنکھیں پڑھیں۔ بہت کچھ پالینے کی خوشی میں وہ سرشار تھا۔

☆ ☆ ☆

شام کے ملگجے اندھیروں میں امی سے گلے ملنے اور بہت ساری باتیں کرنے کے بعد وہ شیرل کے کمرے میں چلا آیا۔

"ہیلو شیرل۔" دل کی گہرائیوں سے نکلی آواز خاصی گونج دار تھی۔

"تم....." اسے سامنے دیکھ کر شیرل کی پیشانی پر ناگواری کی کتنی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ لیپ ٹاپ پر اپنے کسی فرینڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی مداخلت اسے بہت ناگوار گزری۔

"تم اتنے ان کلچرڈ اور ال مینرڈ کب سے ہو گئے' یہ تک بھول گئے کہ کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ناک کیا جاتا ہے۔"

وہ ویسی ہی تھی' اکھڑ مزاج اور مغرور سی۔ نخوت سے ناک سکوڑے اسے گھور رہی تھی۔

اس کے مزاج میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ سنہری آنکھوں میں جلتی مشعلیں بجھنے کو تھیں کہ وہ سنبھل گیا۔

"تمہارے کمرے میں داخل ہونے کے لیے مجھے کسی تکلف اور فارملیٹی کی ضرورت نہیں۔"

"اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔ کیسے یاد آ گئی۔ کوئی ضرورت کھینچ لائی کیا؟" انداز تیکھا تھا اور اہانت آمیز بھی۔

"ہاں تمہاری ضرورت کھینچ لائی ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سارے جھگڑے بھلا کر صلح کرلیں۔"

"جھگڑے برابر کے لوگوں سے کیے جاتے ہیں۔" اس کے لہجے کی کاٹ اندر تک چھید کر رکھ دیتی تھی۔ وہ پہلو بدل گیا۔

"شیرل ہم نے ایک مدت ایک دوسرے کو دیکھا ہے' پرکھا ہے' ہم ایک دوسرے کے بچپن کے ساتھی ہیں۔"

"جملے خوب صورت استعمال کرنے لگے ہو۔"

"میں سنجیدہ ہوں شیرل۔" وہ جھنجلا سا گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' میں تم سے بے خبر رہی ہوں' تم اب تک کہاں تھے۔ مجھے سب علم ہے۔" وہ خوش ہو گیا۔ اس کے جملے اسے زندگی کی نوید دے گئے۔

"میں جہاں بھی رہا ہوں شیرل' تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا۔ میں نے ہر ہر موڑ پر تمہیں پکارا ہے' تمہارا انتظار کیا ہے۔"

"میرا انتظار....." وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "سیف علی صاحب میں دن میں خواب دیکھنے کی عادی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سمجھ نہ سکا۔

"کیا تم اپنے دوست کی بہن سے محبت کی پینگیں نہیں بڑھا رہے۔"

"شیرل....." وہ بے حد صبر و تحمل سے بولا۔ "میرا خیال ہے تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"جی نہیں۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔" وہ چلائی۔

"کیا تم اس دو ٹکے کی لڑکی کو پسند نہیں کرتے۔"

"شٹ اپ!" معطل ہوتے حواسوں کو یکجا کر کے وہ دھاڑا۔ "اس معصوم لڑکی کے لیے ایسے بے ہودہ الفاظ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اوہ!" لمحہ بھر کو شیرل نے اپنے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکوڑے' پھر جیسے ہولے سے پھنکاری تھی۔

"تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے اور اس لڑکی کی چند دنوں کی رفاقت نے اسے میرے مقابل لا کھڑا کیا ہے' کیا گھول کر پلا دیا ہے۔ اس لڑکی نے تمہیں۔" اس کا دل چاہا' طمانچوں سے اس کا منہ لال کر دے۔

"اگر میں یہ کہوں کہ میں بقول تمہارے اسے پسند کرتا ہوں تو....."

"تو میں اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔"

"یہ دھمکی تم مجھے پہلے بھی دے چکی ہو۔" وہ چڑ سا گیا۔ اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو چکا تھا۔ چند لمحے اس بدتمیز لڑکی کو گھورتے رہنے کے بعد وہ ایک دم ایڑیوں پر گھوما اور دروازے کی طرف چلا۔

"تم مجھے ٹھکرا نہیں سکتے۔" وہ حد سے زیادہ پراعتماد تھی۔

"کیوں..... تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے' تم مجھے بے انتہا چاہتے ہو اور دوسرے میرے پاپا کی ——— دولت لوگوں کے لیے بے پناہ اٹریکشن کا باعث ہے۔" اس کے لہجے میں نخوت تھی۔

اس کی بکواس پر وہ لمحہ بھر کو رکا تھا اور پھر پیچھے دیکھے بنا باہر نکل آیا۔

اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ یہاں آ کر بات گنوانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ وہ واپس نہ آنے کا عہد کر کے نکلا تھا۔ تو پھر دوبارہ ذلیل ہونے کے لیے لوٹنے کی کیا تک تھی۔

جب وہ اس دو کمروں والے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا تو وہ سلونی رنگت والی لڑکی اسے

نہایت حیرت سے تک رہی تھی۔ وہ تو ایک ہفتے کے لیے گیا تھا۔ لیکن اسی دن ہی لوٹ آیا تھا۔

بہرحال جو بھی تھا وہ خوش تھی۔ جانے کیوں؟ شاید اتنے دنوں میں وہ اس کے وجود کی عادی ہو چکی تھی۔ تب ہی تو آج کا سارا دن ایک صدی بن کر گزرا تھا۔ شمیم آپا نے جس قسم کی بکواس کی تھی' اس کے بعد اس شخص کے چلے جانے پر اس نے سکھ کا سانس بھر لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایک نامعلوم سی بے چینی اور اضطراب بھی تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد وہ سارا دن چپ چپ رہی تھی۔ مگر شمیم آپا جب ماں جی سے ملنے آئیں تو دروازہ کھولتے وہ خوف زدہ بھی ہو گئی۔ خوف سے پیلے پڑتے چہرے سمیت بمشکل اس کے لبوں سے سلام پھسلا تھا۔

"دروازے پر کون ہے ایمان؟" ماں جی کی آواز آئی تو شمیم آپا اس کے سائیڈ سے ہو کر خود ہی اندر چلی گئیں۔

"میں ہوں... اتنے دن ہو گئے تھے ملاقات کیے۔ اداس ہو رہی تھی۔ اس لیے ملنے چلی آئی اور ساتھ میں ایمان کے کپڑوں کا ناپ بھی دے دیجیے۔ ابھی سے کپڑے سلوانے لگوں گی تو شادی تک تیاری ہو سکے گی۔"

شمیم آپا نان اسٹاپ بولتی گئیں۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ماں جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ایمان کو آواز دی۔

"ایمان چائے بنا لاؤ اور ساتھ میں کوئی اچھا سا ناپ والا سوٹ دے دو۔"

"میں نے شادی کا جوڑا سرخ رنگ کا پسند کیا ہے۔ ولیمہ کا جوڑا چونکہ آپ کی طرف سے ہو گا۔ اس لیے جیسا چاہے بنوا لیں۔ ویسے زبیر کو ہرا رنگ پسند ہے۔ کہہ رہا تھا کہ آپ لوگوں سے کہہ دوں کہ دلہن کے ولیمہ کا جوڑا ہرے رنگ کا ہونا چاہیے۔"

"اے ہرا رنگ بھی کوئی ولیمہ کا رنگ ہوتا ہے۔" ماں جی نے منہ بنایا۔

"یہ رنگ تو بایوں' مہندی کا ہوتا ہے۔"

"چلیے... پھر آپ اپنی پسند کا بنا لیجیے گا۔ ویسے یہ بتائیں' وہ لڑکا چلا گیا کیا؟"

شمیم آپا کو نہ تو پروین کی بات پر اعتبار تھا اور نہ ہی ایمان کی گواہی کا یقین۔ اس لیے ماں جی سے تصدیق کرنے کی خاطر دوبارہ پوچھنے لگیں۔ "ہوں..." ماں جی نے مبہم سا جواب دیا۔

"چلو اچھا ہے جان چھٹی۔" شمیم آپا کھل گئیں۔

شکر ہے وہ شمیم آپا کے جانے کے بعد آیا تھا۔ وہ اگر ان کی موجودگی میں آجاتا تو جانے کون سا طوفان بپا ہو جاتا۔

وہ سامنے کھڑا تھا اور وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ جمی رہ گئی تھی۔

"اندر آنے کی اجازت نہیں۔" تھکن زدہ آواز کو اس نے بشاشت میں بدلا۔

وہ سٹپٹا کر ایک طرف ہو گئی۔

"آپ اتنی جلدی لوٹ آئے؟ میرا مطلب وہاں سب خیریت تھی نا اور شیرل۔"

"ظفری کہاں ہے؟" اس کی بات کا جواب نہ دینے کی خاطر اس نے موضوع بدلا تھا۔

"گھر پر نہیں ہیں۔"

وہ پلٹ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور ٹرے میں کافی کے دو مگ بنا لائی۔ "ہاں واقعی... اس وقت سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ آپ نے بن کہے کیسے سمجھ لیا۔"

وہ خاموش رہی۔

"کیا بات ہے' بہت چپ ہو۔"

وہ کتنی دیر اس کی سیاہ آنکھیں پڑھتا رہا تھا۔

"نہیں تو..."

"کچھ ہوا ہے کیا؟"

وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

وہ سر نہوڑائے کافی کے مگ میں چمچہ گھماتی رہی۔ شمیم آپا کی کھوجتی نظریں اسے اپنے وجود کا گھیراؤ کیے محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سے جھانکتی ہوئی دیوار

سے دروازے سے اور... اور...

"سب آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے ہوں گے۔" وہ گویا بر سبیل تذکرہ ہی پوچھ رہی تھی۔

"ہاں... ظاہر ہے۔ میری امی مجھ پر جان دیتی ہیں۔"

"اور شیرل..." سیف نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہوں..." وہ سمجھ نہ سکی۔ جانے سے پہلے وہ کتنا خوش، کتنا پُرجوش تھا۔ شیرل کا باربار ذکر کر رہا تھا۔ ظفری بھائی سے بھی چھیڑ چھاڑ ہوئی تھی۔

لیکن...

واپسی پر وہ قطعاً" مختلف تھا۔ پژمردہ اور افسردہ سا۔ اس کا دل چاہا وجہ پوچھ لے۔

ماں جی کو ہلکی سی حرارت تھی۔ اس لیے وہ دوا کھا کر سو گئی تھیں۔ اس نے ایک نظر در و دیوار پر ڈالی اور لمبا سانس کھینچ لیا۔

"اس گھر سے جانے کیوں بے حد انس ہو چلا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی سیف کے لبوں سے پھسل گیا۔

"حالانکہ ہر مسافر کو لوٹنا ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹنے پر مجبور ہے۔" جواباً" وہ بے حد مدھم لہجے میں بولی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہی رہ گیا۔ روشن سنہری آنکھوں کا اضطراب دوچند ہو گیا۔

"ایمان..." بہت دیر بعد اس نے پکارا۔

"اگر بندہ دو لمحے کسی کا دل رکھ لے تو کیا حرج ہے۔ چاہے جھوٹ بول کر ہی سہی۔" ایمان سے اس کی آنکھوں کی تکلیف چھپی نہ رہ سکی۔

"حقیقت سے فرار بزدلوں کا کام ہے۔" اس کی بات کاٹ کر وہ بے حد رسان سے بولی۔

"انسان زندگی کی حقیقتوں سے نہیں بلکہ تلخیوں سے فرار چاہتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یقیناً" لمحہ بھر کو بھی کھل کر سانس نہ لے سکے۔"

"فلسفی بن رہے ہیں۔"

"فلسفی..." وہ سر اٹھا کر ہنسا۔

"سنو... تھوڑی سی کافی اور بنا دو۔ اب کے چینی نہ ڈالنا۔" وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ظفری کے آجانے پر دونوں کے قہقہے بلند ہوتے رہے اور وہ اپنے بستر میں دبکی خالی الذہن پڑی رہی۔

"یار یہ بتا... اتنی جلدی کیسے لوٹ آیا؟ جانے سے پہلے تو بہت ایکسائٹڈ تھا۔" ظفری نے حسب عادت اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔

"پاگل تھا نا۔"

"خیر یہ تو میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ یہ بتا وقت کیسا گزرا۔" ظفری نے شرارت سے ایک آنکھ دبائی۔

"غارت ہو گیا۔" جواباً" اس نے سرد آہ بھری۔

"کون... محبت کا جنون یا وہ تیز و طرار خاتون۔"

"ارے نہیں... میں وقت کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ... پھر تو ٹھیک ہے۔" ظفری مطمئن ہو گیا۔

"اب ذرا واضح کر دو کہ وقت کس طرح غارت ہوا۔ مثالوں سے واضح کرنا۔"

"میں سنجیدہ ہوں یار۔" وہ جھنجلا گیا۔

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ خاتون کا دماغ ساتویں آسمان سے نیچے اترا یا نہیں۔"

"نہیں۔"

"بس ٹھیک ہے جب اسے تیری پروا، تیری قدر نہیں تو، تو بھی خود کو بے وقعت مت کر۔ میں مانتا ہوں میرے کہنے پر تو گیا تھا۔ مگر اب جبکہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ان تلوں میں تیل نہیں تو دوبارہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔"

وہ ظفر کی بات سے اتفاق کرتا تھا۔ اگر دوسری طرف اتنی سرد مہری تھی۔ اتنی لاتعلقی تھی تو پھر وہ کیوں پروا کرتا۔ اس نے مصمم ارادہ باندھ لیا کہ وہ کبھی بھی مڑ کر اس سمت نہیں دیکھے گا۔ جہاں منزلوں کے بجائے راکھ اڑتی ہے۔

صبح ناشتے پر وہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔ اس نے ذہن پر چھائی ساری افسردگی کو نوچ کر پھینک دیا تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچ جانے سے کتنی تسلی ملتی ہے۔

ظفری ناشتے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے چلا گیا تو اس نے چائے کے گرم گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔
"ایمان... کل آپ نے کہا تھا نا کہ ہر مسافر کو لوٹنا ہوتا ہے۔"
وہ حیرت سے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"لیکن اگر کسی مسافر کا گھر ہی نہ ہو۔ کوئی اس کا انتظار نہ کرتا ہو تو پھر وہ اس بات پر قادر ہے نا کہ جہاں چاہے پڑاؤ ڈال دے۔" وہ کچھ بول نہ سکی۔
وہ کیسے کہہ دیتی کہ بعض پڑاؤ عارضی اور لمحہ بھر کے ہوتے ہیں۔
ماں جی ناشتا کر کے نجانے باورچی خانے میں کیا کر رہی تھیں۔ وہ سکون سے ناشتا کرتا رہا۔ پھر تیار ہونے چلا گیا۔ اسے آج کالج جانا تھا' فائنل ایر تھا۔ اس لیے وہ صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دینا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن سے سیف پر جو قنوطیت طاری ہوئی تھی وہ ایمان کی شادی کے دن تک برقرار رہی۔ خود ایمان بھی بہت گم صم تھی۔ نہ اس نے اپنی شادی کی تیاریوں میں حصہ لیا تھا اور نہ ہی اپنی خریداری میں ماں جی اور ظفری کا ساتھ دیا تھا۔ ظفری' سیف کو اپنے ساتھ ہر جگہ گھسیٹ کر لے جاتا تھا۔ سیف بازاروں کے اتنے دھکے کھانے کا عادی نہیں تھا۔ مگر ظفری دوست ہونے کے ساتھ ساتھ محسن بھی تھا۔ اس لیے اس کے ہر کام میں پیش پیش تھا۔
جس دن بارات تھی' وہ شدید ڈپریشن اور اضمحلال میں رہی۔ وہ رات بہت وحشت ناک تھی۔ آسمان کالا سیاہ اور تاریک تھا۔ چاند غائب تھا اور ستارے سیاہ گھٹاؤں کے پیچھے پوشیدہ۔ بارات کے آنے کا شور ہوا تو ایک عجیب سے خوف نے اس کے وجود پر اپنا تسلط جما لیا۔ شاں شاں کرتی ہوائیں بہت ہیبت ناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔

وہ دلہن بن کر تیار تھی اور اس سارے عرصہ میں اس نے ایک بار بھی سیف کو نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا؟ باہر مولوی صاحب نکاح پڑھانے کو تیار تھے۔ تب ہی اسے کسی ہلچل کا گمان گزرا۔ باہر کوئی گڑبڑ تھی۔ تب ہی یک لخت خاموشی چھا گئی تھی۔ ٹینٹ گلی میں لگا تھا۔ مگر یہ باہر صحن میں شمیم آپا اپنی چند رشتہ دار خواتین کے ساتھ کیوں چلی آئی تھیں۔ اس نے بند دروازے کی ذرا سی جھری بنا کر باہر جھانکا۔
دولہا کی پگڑی بھی خواتین میں نظر آ رہی تھی۔
"مگر یہ سب کیسے ممکن ہے۔ اب جبکہ نکاح ہونے جا رہا ہے تو آپ نے اپنی ڈیمانڈز سامنے رکھ دی ہیں۔ یہ انتہائی نامعقول اور نامناسب بات ہے۔" یہ ظفری بھائی کی آواز تھی۔
"آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ ہماری مالی حیثیت کیا ہے۔ ہم نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ پھر یہ جہیز کی لمبی سی لسٹ اور موٹر سائیکل کی فرمائش۔"
"آئے ہائے تو ہم نے کون سی بڑی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آج کل تو سب ہی لڑکے والوں کو اتنا کچھ دے کر لڑکی کو رخصت کرتے ہیں۔" شمیم آپا بولیں۔
"مگر اپنی اس خواہش کا اظہار تمہیں پہلے کرنا چاہیے تھا' تاکہ میں تم پر اچھی طرح واضح کر دیتی کہ یہ سب ممکن نہیں۔ اب جبکہ سارے رشتہ دار جمع ہیں' نکاح ہونے جا رہا ہے تو ایسی فرمائش۔" ماں جی جیسے صدمہ کے زیر اثر بولی تھیں۔
"جب تک موٹر سائیکل نہیں ملے گی' کوئی نکاح نہیں ہو گا۔" شمیم آپا نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔
ماں جی کو غش آ گیا۔
رشتہ داروں' مہمانوں اور محلے والوں کے سامنے ایسی سبکی۔ موٹر سائیکل کی ڈیمانڈ وہ پوری نہیں کر سکتے' تو کیا ان کی ایمان کی بارات یوں ہی لوٹ جائے گی' ہائے ایمان۔ ان کے کلیجے پر گھونسا سا پڑا۔
"دیکھیے' یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہیں۔" سیف آگے بڑھا اور شمیم آپا کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ "اگر کوئی آپ کی بیٹی کے ساتھ عین بارات والے دن یہ سلوک

کرتا تو آپ کے دل پر کیا گزرتی۔ جنہوں نے آپ کو اپنی بیٹی سونپ دی، مجھو سب کچھ دے دیا۔ زبیر صاحب! آپ کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑے ہیں۔ آپ ہی اپنی والدہ کو کچھ سمجھا بیٹے۔" وہ زبیر کی طرف گھوما۔

"اے یہ کیوں کچھ بولے اور تم وہی ہونا' جس نے اتنے دنوں سے اس گھر میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ایک تو ہم نے اس معاملے کو بھی نظرانداز کردیا۔ محلے والوں اور دنیا کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔" شمیم آپا غصے سے بولیں تو سیف چونکا۔

"کون سی باتیں۔"

"اے میرا منہ نہ کھلواؤ۔ یہ ایمان کو بھی پتا ہے۔ اس کی ماں اور بھائی کو بھی پتا ہے۔ ایک تم ہی انجان ہو۔ انہوں نے تو شرم گھول کر پی لی ہے۔ جوان لڑکی کی موجودگی میں تمہیں یہاں رکھ چھوڑا۔ کسے بے وقوف بناتے ہو۔ کیا ہم نہیں جانتے تم کس وجہ سے یہاں جمے ہو۔ اندر ہی اندر کون سا معاملہ ہے۔"

شمیم آپا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں سے کچھ ملنے والا نہیں۔ اس لیے وہ کھل کر سامنے آگئیں۔ انہوں نے تو سوچا تھا۔ عین بارات والے دن وہ اپنی ڈیمانڈز رکھیں گی تو رشتہ داروں کے درمیان ان لوگوں میں انکار کی ہمت نہیں ہوگی اور پھر کون چاہے گا کہ در پر آئی بارات خالی لوٹ جائے۔ لہٰذا انہیں ان کی شرائط ماننا ہوں گی۔ مگر یہ لوگ تو اصل میں کنگلے تھے۔ وہ جو سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے اندر ہی اندر لڑکی کے لیے بہت کچھ جوڑ رکھا ہوگا۔ سب خام خیالی نکلا۔

"فضول بکواس نہ کریں۔" ظفری سے برداشت نہ ہوسکا۔

"آپ ہماری زبان نہ کھلوائیں' ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔" زبیر والا۔

"بالکل چپ.... ورنہ زبان گدی سے باہر کھینچ لوں گا۔" سیف کو تاؤ آگیا اور اس نے زبیر کو گریبان سے پکڑ کر دو تین جھٹکے دے ڈالے۔

"ارے اس لڑکے کی ہمت تو دیکھو۔" شمیم آپا نے سیف کی کمر پر دو ہتڑ رسید کیے۔ "اس گھر کے سب ہی لوگوں کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ نہ بھیا.... ہمیں زمانے بھر کی بدنامی سمیٹ کر اپنے گھر نہیں لے جانی.... تو بیٹھ یہیں۔ اڑا گلچھرے اپنے دوست کی بہن کے ساتھ۔ ہماری طرف سے رشتہ ختم.... بارات واپس جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک.... ہمیں بھی ضرورت نہیں تم جیسے بدذات' لالچی اور کم ظرف لوگوں میں اپنی لڑکی بیاہنے کا۔" ظفری غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ چہرہ لال سرخ تھا۔

ماں جی بے ہوش ہو چکی تھیں۔

اتنے رشتہ داروں میں ایسی سبکی' ایسی تذلیل' ان کی جوان لڑکی کی وہ عزت اچھلی کہ اب کوئی اس کا طلب گار بن کر نہیں آئے گا۔ ہائے انہوں نے ظفری کو آنے والے اس خطرے سے خبردار بھی کیا تھا۔ مگر ظفری کو دوستی عزیز تھی۔ بہن کی عزت نہیں۔

طوفان آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ ایمان سن ہوتے حواسوں کے ساتھ سب کچھ دیکھتی رہی۔ مگر کچھ نہ کر سکی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے' زبان نہیں۔

کتنی دیر وہ دروازے کے ساتھ نڈھال' بے دم سی پڑی رہی۔

زمانے کے خوف اور رسوائی نے اسے ادھ موا کردیا تھا۔ پھر اپنے ٹھکرائے جانے کا دھچکا بھی شدید تھا۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر موت کا سناٹا طاری تھا۔ اس نے دروازے کی جھری سے دوبارہ باہر دیکھا۔ بارات جا چکی تھی۔ صرف ان کے رشتے دار باہر پنڈال میں موجود تھے۔ تب ہی ظفری چلا آیا۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔

"ایمان...." وہ قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔

"بھیا.... میں بے قصور ہوں۔" یک لخت اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یمان!" ظفری کا لہجہ سخت ہوگیا۔ "تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ مجھے تم پر اور سیف پر پورا یقین ہے۔ چند کم ظرف لوگوں کی باتوں میں آکر میں اپنی بہن پر شک نہیں کر سکتا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔

"اچھا ہوا ان لوگوں کے لالچ اور ذہنیت کا پہلے سے اندازہ ہوگیا۔ ورنہ تمہارے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتی۔" بھائی اس کا عظیم بھائی۔۔۔ اس نے ظفری کے ہاتھ تھام لیے اور انہیں آنکھوں سے لگا کر ایک بار پھر بے قراری سے رو دی۔

ظفری کی آنکھیں بھی جھلملا گئیں۔

"ماں جی کہاں ہیں؟"

"ماں جی۔۔۔ باہر پنڈال میں ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"ماں جی ٹھیک تو ہیں۔" کسی نامعلوم خیال نے اسے لرزا دیا۔

"وہ اب بہتر ہیں۔ میں سیف کا تاحیات ممنون رہوں گا۔ اس مشکل وقت میں اس نے صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں مانتا ہوں۔ یہ فیصلہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ مگر اس نے بہادری سے اس کٹھن ساعت کو جھیل لیا۔"

ظفری بھائی کس فیصلے کی بات کر رہے تھے۔ ان کی بات کا سر پیر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

وہ پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھتی رہی۔

"اور اس بات کو تسلیم کرنا یقیناً" تمہارے لیے بھی مشکل ہوگا۔ مگر یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ ماں جی اور میرا بھی یہ ہی فیصلہ ہے کہ مشکل کی اس گھڑی میں سیف کی بات مان لی جائے۔ ہم تمہارا اس سے نکاح کر رہے ہیں۔"

اس کے پیروں میں کوئی گولا سا پھٹا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

تو کیا اب وہ زبردستی اس شخص کے سر منڈھ دی جائے گی۔ جس کی ذات اس کی کزن' اس کی منگیتر کے گرد گھومتی ہے۔ جس کی پور پور اس لڑکی کی محبت میں سرشار ہے اور اس کے لیے اس کی بے چینیاں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔

"کیا وہ اتنی کم ظرف اور بے حس ہے کہ اپنی عزت بچانے کے لیے اس شخص کی زندگی اور پیار پر نقب لگا ڈالے گی۔"

"یہ۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے بھائی۔" وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔

"دیکھو اس وقت یہ ہی مناسب ہے اور پھر ہم نے سیف پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ اس نے خود یہ کہا ہے۔ اس کی اس بات پر ماں جی کا سانس بحال ہوا ہے۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ کتنی جگ ہنسائی ہوتی۔ بارات لوٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

ظفری کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

وہ سب ہی اندر چلے آئے تھے۔ نکاح خواں' گواہان' ماں جی اور رشتہ دار بھی۔۔۔ وہ سمٹ گئی' گھونگھٹ چہرے تک لٹکایا۔

مولوی صاحب نے کیا پڑھا۔ کیا قبول کروایا۔ اس نے دستخط کہاں کیے۔ ماؤف ہوتے ذہن اور آندھیوں میں گھرے وجود سمیت اسے اندازہ کیوں کر ہوتا۔ وہ تو پھٹتے دل سے ادھ موئی ہو رہی تھی۔

وہ شخص جو کہیں ذہن کے کسی کونے میں براجمان تھا۔ اچانک اس کے لیے بہت اہم ہوگیا تھا۔ اپنے جگمگاتے وجود سمیت۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

وہ اپنے اندر جھانکتے گھبرا رہی تھی۔

یہ مقدر کی ستم ظریفی تھی یا اس کے اندر کے کسی جذبے کی سچائی۔۔۔ وہ اس بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ یہ اس شریف النفس بندے کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔

وہ کسی اور کے ساتھ کا خواہاں تھا اور قسمت نے اس پر ایک اور وار کر کے اسے کسی اور کا بنا دیا تھا۔

نکاح کے بعد ظفری کے گلے لگتے سیف نے اتنا کہا۔

"مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ دوست۔۔۔ مانتا ہوں' ابھی میں بے گھر ہوں۔۔۔ کسی کام دھندے پر بھی

نہیں۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں۔ بہت جلد تمہاری بہن کو دنیا کی ساری خوشیاں دوں گا۔"
"یہ باتیں کر کے مجھے چھوٹا مت کرو یار۔" ظفری کتنی دیر اسے گلے سے لگائے رہا۔ "تمہارا احسان تو میں مر کر بھی نہیں چکا سکتا۔"
"مقدر یہ ہی ہے دوست' کہیں کی راہیں' کہیں اور آن ملیں۔ دو مختلف سمتوں کے راہی اس طرح بھی ہم سفر بن جاتے ہیں۔"
اس ٹھٹھرتی سیاہ رات میں وہ اپنی وحشت دور کرنے کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ گزشتہ لمحات اس کی آنکھوں کے سامنے تھرک رہے تھے۔ شمیم آپا کی بدزبانی ظفری اور زبیر کا دست و گریبان ہونا۔ سیف کی مداخلت اور پھر بارات کا لوٹ جانا اور سب سے بڑھ کر اس کا سیف سے نکاح اور اب وہ اس کمرے میں تھی' جس کمرے میں سیف کا ڈیرا تھا۔
پتا نہیں سیف نے اسے کس دل سے قبول کیا ہوگا۔ نکاح کے بعد وہ... گھر سے باہر چلا گیا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں وہ جذبات میں آکر اٹھائے ہوئے اس قدم پر پچھتا رہا ہو۔
آسمان پر برستا پانی تیز ہو گیا تو وہ مرے قدموں سے سیڑھیاں اتر آئی۔ ٹین کی چھت پر تیزی سے پڑتی بوندوں کی زوردار آواز رونگٹے کھڑے کیے دے رہی تھی۔ وہ جاگتی رہی۔ کھلی آنکھوں سے اس کی منتظر رہی جو اس سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔
رات کے جانے کون سے پہر کواڑ بجا تو وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ دوڑتے ہوئے صحن عبور کیا۔
"کک... کون؟" اس کے لرزتے لبوں سے گھٹے گھٹے انداز میں نکلا۔
"سیف ہوں۔"
اس نے کنڈا کھول دیا۔
"کیا بات ہے۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں۔ سردی سے میں تو اکڑ گیا۔"
وہ اس لہجے کی کھنک سے نامانوس نہیں تھی۔ اس کے آجانے سے تحفظ کا کیسا انوکھا احساس ہو رہا تھا۔ نکاح کے دو بول میں اتنی طاقت تھی کہ ایک عجیب سی اپنائیت نے دل و دماغ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔
وہ چند قدم اس کے قریب بڑھ آئی۔
"آپ بھیگ گئے ہیں' جلدی سے کپڑے بدل لیں۔"
"تم بھی تو بھیگ رہی ہو۔"
وہ ویسا ہی تھا۔ نرم لہجے والا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے کسی پچھتاوے اور رنج کا اظہار بھی نہیں ہو رہا تھا۔
پتا نہیں وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے اور چہرے کو پڑھتے کیا کھوجنا چاہ رہی تھی۔
"میری بات دوسری ہے۔ آپ کپڑے تبدیل کرلیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔"
"نہیں... مجھے بھوک نہیں' اور پھر تم کہاں اتنی رات کو تردد کرو گی۔"
وہ بڑی تیزی سے باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ تردد تو اجنبیوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ جبکہ وہ بھول گیا کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے ہیں۔
باورچی خانے کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے وہ لمحہ بھر کو اس کی طرف پشت کیے کھڑی رہی۔ بادلوں کا شور اور بوندوں کی جھنکار شدت لیے ہوئے تھی۔
"کافی تو ضرور چلے گی اس موسم میں... وہ بنا دو۔"
وہ تیزی سے کپڑے بدلنے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ باورچی خانے میں چلی آئی۔ وہ ٹرے میں کافی لیے کمرے میں آئی تو وہ کمبل میں دبکا ٹھٹھر رہا تھا۔
"بہت ٹھنڈ ہے بھئی۔"
اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ یوں جیسے اس کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا۔ یوں جیسے... کسی انہونی نے اسے امتحان میں نہیں ڈالا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ وہ صرف اس کے دوست کی بہن ہے اور بس...؟
"بارش نے اس میں اضافہ کر دیا ہے۔"

وہ بھی بظاہر نارمل رہ کر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ گزشتہ واقعہ نے ہرگز اس کے اعصاب پر برا اثر نہیں ڈالا۔

"تمہیں رنج تو ہوا ہو گا۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت کے بدلنے کا۔ یقیناً" زبیر کے حوالے سے تم نے خواب دیکھے ہوں گے اور پھر یکلخت تمہاری آنکھوں سے وہ خواب نوچ لیے گئے اور میں..."

"زبیر سراسر ماں جی کا انتخاب تھا۔"

اس نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئی پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"بے شک وہ ماں جی کی پسند تھا۔ لیکن یہ انسانی فطرت ہے۔ وہ جس سے منسوب ہو جاتا ہے۔ اس کے حوالے سے بہت کچھ سوچتا ہے۔"

اس کا سانس بند ہونے لگا۔

"نہیں' یہ صحیح نہیں ہے۔"

وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کبھی... زبیر کے لیے پاگل نہیں رہی۔ پاگل تو وہ اپنی کزن شیرل کے لیے رہا ہے۔ اس نے شیرل کے لیے اس کی بے تابیاں اور بے چینیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔

"زبیر سے متعلق تمہاری غلط فہمی اور بدگمانی میرے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک ہوگی۔"

بڑی تکلیف دہ خاموشی تھی۔ اس نے کئی بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے مخاطب کرنا چاہا مگر آواز حلق میں پھنس گئی۔ وہ کہے بھی تو کیا؟

سیف نے اس لڑکی کی جانب دیکھا جو ہنوز عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔ وہ بہت اداس اداس اور مایوس لگ رہی تھی۔

"بہتر تھا تم کپڑے بدل کر ایزی ہو جاتیں۔ ویسے بھی تم بھیگ چکی ہو۔" وہ بولا۔

"ویسے بھی مجھے تم سادہ اور سمپل (Simple) زیادہ اچھی لگتی ہو۔"

اس کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے کسی دوست کو مشورہ دے رہا ہو۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ... نے ایمان کے لبوں کو چھوا۔

یہ لڑکی آخر اتنی اداس اور خاموش کیوں ہے۔ وہ یقیناً" زبیر سے شادی نہ ہونے کی وجہ سے اداس ہے۔ یا پھر اس کے ساتھ نئے تعلق کے بندھنے نے اسے بیزار کر دیا ہو۔ وہ تو شروع ہی سے بد قسمت تھا اس معاملے میں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

سیف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔"

"مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری پریشانی دور کر سکوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اتنا بے حس نہیں ہوں۔ جتنا تم خیال کرتی ہو۔"

ایمان نے اس کی طرف دیکھا۔

جانے وہ اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

☆ ☆ ☆
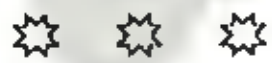
ان دونوں کی روٹین اور زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ وہی عام سی روٹین تھی۔ وہ باقاعدگی سے ... کالج جا رہا تھا اور اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ رات گئے تک پڑھتا تھا۔ اس کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے ایمان نیچے ماں جی کے ساتھ سوتی تھی۔ البتہ رات کو وقفے وقفے سے اٹھ کر کبھی اسے نیم گرم دودھ کا گلاس دے جاتی اور کبھی چائے... مقابل کی نظروں میں اس کے لیے ممنونیت کے تاثرات ابھر آتے تھے۔

اس دن صحن میں جھاڑو لگاتے لگاتے وہ ٹھٹک گئی۔ وہ جانے کون تھی جو بلا جھجک اندر چلی آئی تھی۔ اس نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ وہ دھپ دھپ کرتی اندر گئی اور دھپ دھپ کرتی ہی باہر آگئی۔

"سنو... مفو کہاں ہے؟"

"کالج گئے ہیں۔"

آنے والی کی کلف زدہ گردن ذرا سی ترچھی ہوئی تھی۔ وہ تیکھی نظروں سے سامنے ہاتھ میں جھاڑو لیے

اس عام سی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔
"مجھے کالج میں ہی اسے پکڑ لینا چاہیے تھا۔ لیکن اگر یہاں نہ آتی تو مجھے کیسے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی پستیوں میں جا گرا ہے۔ ویسے تم کون ہو۔"
اس نے در و دیوار پر ایک نظر ڈال کر ناک بھوں چڑھائی۔
"یہی وہ جگہ ہے۔ جس کے لیے اتنے شاندار محل کو ٹھکرا دیا۔ اوہ گاڈ۔ سیف کا اسٹینڈرڈ کس قدر گھٹیا ہو چلا ہے۔ چھوٹے لوگوں کے ساتھ رہنے سے ذہنیت انہی کی طرح ہو جایا کرتی ہے۔ اس میں اس بے چارے کا بھی کوئی قصور نہیں۔" وہ حیرت سے آنکھیں کھولے اس فیشن زدہ لڑکی کو ہاتھ لہراتے دیکھتی رہی۔
"ارے.... تم نے بتایا نہیں۔ تم کون ہو؟ گونگی ہو کیا؟"
"میں 'میں ایمان ہوں۔"
"ایمان کون؟ تمہارا سیف سے کیا رشتہ ہے۔"
"میں ظفری کی بہن ہوں۔"
"اوہ...."
تیکھے انداز میں اوہ کو لمبا کرتے ہوئے اس نے خونخوار نظروں سے اسے سر سے پیر تک گھورا۔
"تم ہی وہ بلا ہو جو میرے منگیتر کو چمٹ گئی ہے۔ مگر کان کھول کر سن رکھو۔" تم مجھ سے نہیں جیت سکتیں۔"
"جی۔" اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔
تو یہ سیف کی منگیتر ہے۔ وہ تو بہت خوب صورت ہے۔ اسی لیے تو سیف اب تک اس کے سحر سے آزاد نہیں ہو پایا۔ وہ اگر اس کی زلفوں کا اسیر ہے تو کچھ غلط نہیں ہے.... وہ تھی ہی ایسی کہ اسے چاہا جاتا۔ اپنی شخصیت کے دلنواز ہونے کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا' جبھی وہ لوگوں کو ٹھوکروں پر رکھتی تھی اور کسی کو گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔
اور وہ خود کیا ہے۔ ایک عام سی لڑکی۔ اس کا اس ماڈرن لڑکی سے کیا مقابلہ۔ اس میں ایسا کیا تھا جو سیف اس کے ساتھ کو ہنسی خوشی قبول کر لیتا۔
وہ خود کو اس کے مقابلہ پر ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ایک ہی شخص کی زندگی میں ان دونوں.... کا عمل دخل تھا۔ لہٰذا مقابلہ بازی کی.... صورت حال از خود پیدا ہو جاتی تھی۔
"تمہاری معصومیت سیف کو امپریس کر سکتی ہے مجھے نہیں۔ اف توبہ 'بو کتنی ہے اس گھر میں' مجھ سے تو سانس بھی نہیں لیا جا رہا۔"
وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔
غریبی کا مذاق اڑانے والی اس لڑکی کی زبان تو نہیں پکڑ سکتی تھی۔ وہ لوگ جیسے بھی تھے' جس حال میں بھی تھے' خوش تھے۔ اسے اپنے بھائی کی توجہ اور محبت نصیب تھی۔ وہ اپنی ماں جی کی شفقت سے مالا مال تھی۔ یہی بہت کافی تھا اس کے لیے۔
وہ بیرونی دروازے تک گئی ہی تھی کہ پھر واپس آ گئی۔
"سنو۔ وہ آئے تو کہہ دینا کہ گھر لوٹ آئے۔ میں انتظار کروں گی۔"
اس نے دروازے سے قدم باہر نکالا' لیکن اندر جھانک کر دوبارہ نخوت بھرے انداز میں بولی۔
"سیف کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانے کی کوشش مت کرنا۔ وہ تمہارے ہتھکنڈوں میں آنے والا نہیں۔ وہ چند دنوں تمہارے ہاں کیا آ رہا' تم لوگوں نے اس پر اپنا حق ہی سمجھ لیا۔ یاد رکھنا۔ اس کے دل پر میری محبت کے نقش اتنے گہرے ہیں کہ وہ چاہ کر بھی کہیں اور کا رخ نہیں کر سکتا اور خصوصاً" تم جیسی لڑکی کی طرف۔ لہٰذا تم اس سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔"
اونہہ۔ سیف جیسے بچہ ہی تو تھا۔ کم عقل اور معصوم' جو اس کے سکھانے میں آ جاتا۔ وہ اپنا اچھا برا خوب سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنے کا محتاج نہیں تھا۔
وہ سلگتا ذہن لیے اپنی جگہ جمی اس کنڈے پر نظریں جمائے رہی جو دروازہ زور سے بند ہو جانے کے سبب تیزی سے ہل رہا تھا۔

شکر ہے ماں جی گھر پر نہیں تھیں۔ پڑوس میں گئی تھیں۔ اگر ان کے سامنے یہ سب تماشا ہوتا تو انہیں کتنا صدمہ ہوتا اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

ابھی شام پوری طرح در و دیوار پر چھائی بھی نہیں تھی کہ سیف لوٹ آیا۔ اور اس کی سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر چونک پڑا۔

"تم..... تم رو رہی ہو؟"

اس کے استفسار پر آنکھیں پھر چھلکنے کو بے تاب ہو گئیں۔ یہ بے چارہ۔ کیا معلوم تھا اسے کہ اس کی منگیتر کیا کچھ سنا کر گئی ہے۔ کیسے ان دونوں کے تعلق کے بخیے ادھیڑ کر گئی ہے۔

"مجھے بتاؤ ایمان۔ کیا ہوا ہے۔"

وہ تیزی سے کمرے میں چلی آئی۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے آ گیا اور دروازے پر رک گیا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب..... تم اب تک مجھ پر اعتماد نہیں کر پائیں..... حالات نے جس تعلق میں ہمیں باندھا ہے' تم اس تعلق کو قبول نہیں کر پائیں۔ اس لیے تم اپنی کوئی پریشانی مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتیں۔"

وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی ستا چہرہ لیے بیٹھی رہی۔ ظفری اور سیف دونوں میں نوک جھونک چلتی رہی۔ ماں جی تہجد کے لیے جلدی سو چکی تھیں۔

رات کو اس نے سونے سے پہلے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ پہلے وہ اسے اپنے دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ پھر ادھر ادھر کی ہانکتا رہا۔ لیکن اسے ٹس سے مس نہ پا کر پھر شاید اس میں برداشت کا یارا نہ رہا۔

"ایمان ادھر دیکھو میری طرف۔"

اس نے جھجکتے ہوئے پلکیں اٹھائیں جن کی نوک پر ابھی تک موتی اٹکے تھے۔

"کیا میں تمہیں صورت سے گدھا دکھائی دیتا ہوں؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

وہ مسکرا دیا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔

"مجھے بتاؤ کیا ہوا جو تم رو رہی ہو؟"

"شیرل آئی تھی۔ وہ بلا کر گئی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے سے برستے سکون نے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ وہ سنبھل جانے کی ہمت رکھتی ہے۔ کہ اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔

اس نے کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ وہ اس جگہ پر تھی جہاں آنکھیں سچ جھوٹ پر بے اختیار رہ جاتی ہیں۔

کتنے بہت سے رنگ اس کے چہرے پر آئے۔ وہ انگوٹھے سے کنپٹی دباتے ہوئے کچھ سوچتا لگ رہا تھا۔

"تم نے ہمارے تعلق کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا اسے۔"

وہ یوں..... پوچھ رہا تھا جیسے اگر وہ اس تعلق کو بتا چکی تو یہ بہت بڑی غلطی ہو گی۔

"میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

وہ لبوں پہ زبان پھیرتے پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"یہ بہت عقل مندی کی تم نے....."

اس کے جواب پر اس نے کب کا رکا سانس بحال کیا۔

"اور..... اور وہ تو تم سے کچھ کہہ کر نہیں گئی....؟"

سیف کا دوسرا سوال اسے پھر مصیبت میں ڈال گیا۔

"نن..... نہیں۔"

اس کے چور لہجے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔

"میں مان ہی نہیں سکتا۔"

"کیا۔"

"یہی کہ وہ آئی ہو اور اس نے کچھ کہا نہ ہو۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

وہ شاید کوئی پیام سننے کو بے تاب تھا۔ کوئی گلاب پیام۔ اس کی بے تحاشا جگمگاتی آنکھوں میں کتنے رنگ مچل رہے تھے۔ وہ مایوس کھڑی رہ گئی۔

"میں گھر جا رہا ہوں۔ تم..... میرے بغیر گھبراؤ گی تو نہیں؟"

وہ کون سا اس کا مضبوط سہارا تھا۔

چہرے پر چھائی زردی کو چھپانے کے لیے وہ مسکرا دی۔ یونہی بنا کسی خوشی کے اس کو مسکرانے کی عادت تھی۔ اسے کسی خاص محنت کی ضرورت نہ ہوتی۔

"میں لوٹ آؤں گا۔"

"جیسے آپ کی خوشی۔"

اس نے ایمان کا پر سکون چہرہ بھی دیکھا اور آنکھوں میں انگڑائیاں لیتا اضطراب بھی۔ پھر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔

"او کے چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

وہ تیز تیز قدم سے باہر نکل گیا۔ اس کے تیزی سے اٹھتے قدم اس کے جذبات کے غماز تھے۔ وہ چلا گیا اور اسے مایوسیوں کے اندھیروں میں چھوڑ گیا۔

تو یہ ہے اس کا اور سیف کا بے نام سا تعلق۔ جس کی کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں۔ وہ پہلے دن سے ہی اسے ادھورا ملا تھا۔ کسی اور کی امانت تو تھی یا وہ بدنیت ہو گئی تھی اور اس بدنیتی کی سزا۔ اسے اپنی بارات کے لوٹنے کی صورت میں ملی تھی۔ شاید اس کے دل میں شروع دن سے ہی۔ کوئی چور دروازے سے اندر چلا آیا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف رہی۔

وہ اپنا تماشا نہیں بنوائے گی۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گی۔ اس نے ابھی سے اپنے ہتھیار پھینک دیے تھے اور شیرل کے حق میں دستبردار ہو گئی تھی۔

یہ گھٹن کیسی تھی۔

یہ درد کیسا تھا۔ ہڈیوں کو کھا جانے والا۔

وہ اپنی منگیتر کو چاہتا تھا۔ اس کے ایک پیغام پر دوڑا دوڑا چلا گیا تھا۔ اس بات کا خیال کیے بغیر کہ وہ اب اس کی بیوی ہے۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سیف کہاں گیا ہے؟"

ماں جی نے بھی اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔

"وہ اپنے گھر گئے ہیں۔"

اس نے صاف گوئی سے کہا۔ بھلا سچائی چھپانے سے فائدہ۔ ماں جی نے چونک کر اس کے ستے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"اور تجھے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ اسے اپنی ماں کو بتا دینا چاہیے۔ وہ کسی اور سے سنے گی تو اسے بہت دکھ ہو گا۔"

"ان کی مرضی۔" وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ بولی تھی۔ وہ خود کو پر سکون ظاہر کرنا چاہ رہی تھی جیسے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔

وہ اٹھ کر اوپر کمرے کی صفائی کرنے آ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلی شام ظفری اور سیف ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ وہ کچن میں مصروف تھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی سے اس نے جھانکا۔ وہ بے حد تھکا تھکا اور مضمحل تھا۔ سنہری آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔

"بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے سیف۔ بہت عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔" ظفری بھائی کہہ رہے تھے۔

"اگر اس حقیقت کو واضح نہ کرتا تو وہ میرے لیے درد سر کا باعث بنی رہتی۔" وہ آہستگی سے بولا۔

وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک دم سے اس نے سر جھکا لیا اور پھر ایک گہرا سانس بھر کے ادھر ادھر دیکھا۔

"کیا بات ہے۔ آج چائے نہیں ملے گی؟"

اس سے پہلے کہ ظفری اسے آواز لگاتا۔ وہ ٹرے اٹھا لائی۔ چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے اس نے دیکھا۔ وہ کہیں اور گم تھا۔

"چائے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

اس نے نظریں نہیں اٹھائیں اور کپ تھام لیا۔

ایمان کو اس کا یہ نیا انداز اذیت دیتا لگ رہا تھا۔

اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور پیالی واپس رکھ دی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں ہمیشہ پھیکی پیتا ہوں۔ میری یہ معمولی سی عادت بھی تم دو دنوں میں بھول گئیں۔"

"سوری میں ابھی بنا لاتی ہوں۔"

"نہیں۔ اب یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے.... اور ایک بات اور.... امی تم سے ملنا چاہ رہی ہیں.... لہٰذا چلنے کی تیاری کرو۔"

"کب؟" اس کا منہ حیرت سے کھل سا گیا۔

"ابھی میں نے ظفری اور ماں جی کو بتا دیا ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ اگر تمہیں اعتراض ہو تو بتاؤ۔"

وہ لمحہ بھر کو اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر اندر ظفری کے پاس چلا گیا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا۔

وہ بڑا سا محل نما بنگلہ تھا۔ جس کے آرام دہ کمرے میں وہ مہربان وجود تھا' جس کا لرزتا ہاتھ کتنی دیر اس کے سر پر کانپتا رہا تھا۔

"سیفو نے اگر تمہارا انتخاب کیا ہے تو سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ مجھے اس کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔ بس اتنا افسوس ضرور ہے کہ اس کے بچپن کا رشتہ جو اس کا باپ جوڑ گیا تھا پروان نہ چڑھ سکا۔ پتا نہیں غلطی شیرل کی ہے یا سیفو کی.... بہرحال جو بھی ہوا ان دونوں کی زندگی کی راہیں الگ الگ ہو گئیں جس کا قلق مجھے تاحیات رہے گا۔"

وہ بہت آہستگی سے جھلملاتی آنکھوں سمیت کہہ رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

سیف نے اس کے ساتھ نکاح کر کے غلطی کی۔ وہ اپنی ماں کی دیرینہ خواہش کا احترام کر لیتا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی جیسے سارا قصور اس کا ہے۔

"تم ملیں شیرل سے؟" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"جی شیرل ہی اس سے ملنے آئی تھی۔" اس کے بجائے سیف نے جواب دیا۔

"اچھا کب....؟" امی چونکیں۔

"پچھلے دنوں.... اور وہ ملاقات کچھ اتنی خوشگوار نہیں تھی۔"

"یہ تمہیں کیسے پتا....؟" دروازے سے شیرل کی آواز ابھری۔

ایمان اندر سے لرز گئی۔ سیف نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے آنے والی کو دیکھا اور پھر گردن دوبارہ اسی زاویے پر کر لی۔

وہ بکھرے بالوں اور ملگجے حلیے سمیت کچھ بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ پچھلے دنوں والی ناراضی اور غرور اس وقت غائب تھا۔ وہ کھلے دروازے سے تیر کی طرح سیف کے بالکل سامنے آن کھڑی ہوئی' اس نے سامنے بیٹھی بے وقعت لڑکی پر دھیان نہیں دیا۔

"تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟" وہ ہولے سے جیسے غرائی تھی۔

"او شیرل۔ تم ملیں ایمان سے۔ یہ ایمان ہیں۔ اس دن تم ان ہی پر اپنا زلزلہ گرا کر گئی تھیں۔"

وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے قدرے خوش دلی سے بولا تھا۔

"تو اور کیا کرتی' کوئی تمہیں مجھ سے چھین لے' یہ مجھے قطعی گوارا نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے سامنے بیٹھی ناپسندیدہ لڑکی کے وجود کو یکسر بھول گئی۔

"میں اپنے گزشتہ رویے پر شرمندہ ہوں سیفو۔"

"اچھا۔"

"تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟ پچھلے دنوں جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ وہ میری نادانی تھی۔ میں تمہارے لوٹ آنے پر خوش ہوں۔ بہت خوش۔"

"تعجب ہے۔ مگر اتنا بتاؤ پچھلی تلخ یادیں بھلانا کیا اتنا ہی آسان ہے۔"

"اگر دل میں محبت ہو تو ممکن ہے۔"

تیز روشنی کی زد میں دھواں دھواں ہوتے چہرے پر سیف کی ایک نظر پڑی۔ وہ کسی پتھر کی طرح ساکت و جامد تھی۔

وہ کانپتے دل ــــ اور لرزتے وجود سمیت اپنی ذات کے بے وقعت اور کم مایہ ہونے پر غور کر رہی تھی۔ اپنی دیرینہ محبت کو سامنے پا کر وہ یقیناً" اپنی جلد بازی اور جذباتی پن پر افسوس کر رہا ہوگا۔

"ایمان' ایمان۔"

وہ سلگتی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اس کی درشت آواز بھی نہ سن پائی۔

"بہری ہو چکی ہو کیا؟" وہ جھلا رہا تھا۔

"تم باہر چلو.... میں آ رہا ہوں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ اس کے سخت لہجے پر وہ آنکھوں میں اترتے آنسو اندر اتار گئی۔

"تم اسے گھر چھوڑ آؤ تو بہتر ہے۔"

شیرل.... فتح کے نشے میں سرشار بولی۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔" وہ بولا۔

شیرل کسی فاتح کے انداز میں کھڑی تھی۔ وہ اسے خود بہت اونچی، بہت بلند دکھائی دی۔ آسمان کے درخشاں ستارے کو چھوڑ کر زمین کے معمولی سے ذرے کی خواہش کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔

"اچھا بھئی۔ خدا حافظ۔" شیرل نے اکڑی گردن سمیت ایمان کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے کہہ رہی ہو اب بیٹھی کیوں ہو۔ دفع کیوں نہیں ہو جاتیں۔

ایمان نے شکست خوردہ نظروں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا' اور پھر مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر چلی آئی' سیف کی بے رخی بے حد اذیت ناک تھی۔

تو پھر سیف کی منگیتر جیت ہی گئی ناں۔

اور

وہ اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی ہار گئی۔

اور کچھ نہیں تو اپنے دوست کی بہن ہونے کے ناتے ہی اس کا کچھ لحاظ کر لیتا۔ آنسو اس کے گالوں پر دائیں بائیں لڑھکتے رہے۔

"رو رہی ہو کیا....؟"

اس کی آواز پر آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔ وہ اس کے بالکل سامنے شان سے ایستادہ تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ آ گئے؟"

"ہاں آ گیا ہوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "ایک بات سن رکھو' نہ تو مجھے کوئی تم تک آنے سے روک سکتا ہے اور نہ ہی تم مجھے اپنے دل سے نکال سکتی ہو۔"

"مگر وہ شیرل؟"

"اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر کے آ رہا ہوں۔ اسے صاف بتا دیا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ اور اس کے علاوہ میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں۔"

دھندلائی آنکھوں سے وہ گرنے کو تھی۔ لیکن سنبھل گئی۔

"دیکھو سنبھل کے۔ ابھی ہم نے بہت سا سفر اکٹھے طے کرنا ہے۔"

اس کی بے تحاشا روشن آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ اس کا دل بھی مسکرا دیا۔

"آؤ اب چلیں۔"

"کہاں۔"

"اپنا گھر مل کر بنائیں گے۔"

"اور یہ گھر۔"

"یہ گھر نہ پہلے میری منزل تھا اور نہ اب.... فی الحال.... واپس تمہاری ماں جی کی طرف چلتے ہیں.... میری جاب لگتے ہی ہم اپنا گھر لے لیں گے اور پھر میں یہاں سے امی کو بھی لے جاؤں گا۔"

اس نے ساری پلاننگ کر لی تھی۔

"اس دن جب شیرل تمہاری بے عزتی کر گئی تھی میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ اب میں اپنی شادی کے بارے میں بتا دوں گا۔ تاکہ اس پر ثابت ہو جائے کہ میری زندگی میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔"

اس نے اپنی نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔ اس کی آنکھوں میں اس ساتھ پر سکون کی پرچھائیاں تھیں۔

ایمان کو اس احساس نے تقویت دے دی کہ اس کی حیات میں شہد آگیں مٹھاس گھل گئی تھی۔ اور اس کی راہوں کے تمام کانٹے پھول بن گئے تھے۔

## یہ بستیاں ویراں نہیں

نہیں یہ بستیاں ویراں نہیں
اب بھی یہاں کچھ لوگ رہتے ہیں
یہ وہ ہیں جو کبھی
زخمِ وفا بازار تک آنے نہیں دیتے
یہاں کچھ خواب ہیں
جو سانسیں لیتے ہیں
جوان خوابوں کو تم دیکھو تو ڈر جاؤ
فلک آثار، بام و در
یہاں وقعت نہیں رکھتے
کلاہ و زر یہاں قیمت نہیں رکھتے
یہ جتنے لوگ ہیں
بے نام ہیں، بے لاگ ہیں
بے ساختہ جینے کے طالب ہیں
یہ دل کے بوجھ کا احوال
اپنے حرف خود لکھنے کے طالب ہیں
اجالے کی سنہری کرنوں کو
زنداں سے رہائی دو

ادا جعفری

---

تب سے سوچ رہا ہوں، میری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے
کیسے بُرے دنوں میں کیسا اچھا چہرہ دیکھا ہے

نیلی نیلی آنکھوں میں حیرت سی کچھ وحشت سی
سبز پہاڑوں کے دامن میں روپ سویرا دیکھا ہے

نگری نگری پھرتے پھرتے اپنے بال سفید ہوئے
تب ان دُکھ کی راتوں میں اک سکھ کا سپنا دیکھا ہے

اس کے پیچھے چلتے چلتے گھر سے نکل جاؤ گے دُور
تم نے کس کی مٹھی میں خوشبو کا جھونکا دیکھا ہے

کتنے دنوں کے بعد عطا نے اپنے بال سنوارے ہیں
آئینے میں اس نے اپنا ہنستا چہرہ دیکھا ہے

عطا الحق قاسمی

رنگ تصویر سے نہیں نکلے
خواب تعبیر سے نہیں نکلے

توڑ ڈالا حصارِ زنداں بھی
پاؤں زنجیر سے نہیں نکلے

جو خزانے ملے خرابوں میں
کسی تعمیر سے نہیں نکلے

گیت نکلے تو اک قلم بن کے
کسی شمشیر سے نہیں نکلے

گھر سے نکلے جو کارِ دُنیا کو
کبھی تاخیر سے نہیں نکلے

تیر تو زخم سے نکل آیا
زخم ہی تیر سے نہیں نکلے

ہے سحر وہ بھی اک طلسم کدہ
سخنِ میر سے نہیں نکلے

سحر انصاری

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

جو زمانے کے ستم ہیں وہ زمانہ جانے
تُو نے دل اتنے ستائے ہیں کہ جی جانتا ہے

مسکراتے ہوئے وہ مجمعِ اغیار کے ساتھ
آج یوں بزم میں آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

سادگی، بانکپن، اغماض، شرارت، شوخی
تُو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

کعبہ و دیر میں پتھرا گئیں دونوں آنکھیں
ایسے جلوے نظر آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

دوستی میں تری درپردہ ہمارے دشمن
اس قدر اپنے پرائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغِ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغ دہلوی

ادارہ

## حادثہ

ایک صاحب ملازمت کے لیے انٹرویو دے رہے تھے' انٹرویو لینے والے صاحب نے پوچھا۔
"آپ کبھی بیمار رہے ہیں؟"
"جی نہیں۔"
"کوئی حادثہ وغیرہ پیش آیا؟"
"ہرگز نہیں۔"
"لیکن انٹرویو دینے کے لیے آپ بیساکھیوں کے سہارے تشریف لائے ہیں۔"
انٹرویو دینے والا۔ "دراصل میں کل آیا تھا اور زبردستی اندر آنا چاہ رہا تھا' آپ کے چپڑاسی نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا تھا۔"
انٹرویو لینے والا۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ کو حادثہ پیش آچکا ہے۔"
انٹرویو دینے والا "جی نہیں یہ حادثہ نہیں تھا' آپ کے چپڑاسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔"
صدف عمران۔ کراچی

## رزلٹ

باپ نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ "اپنے رزلٹ کے بارے میں بتاؤ؟"
"وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا فیل ہوگیا ہے۔" بیٹے نے جواب دیا۔
"اپنے بارے میں سناؤ۔" باپ نے پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب کا بیٹا بھی فیل ہوگیا ہے۔" بیٹے نے جواب دیا۔
"بدتمیز! میں کہہ رہا ہوں کہ تم اپنے نتیجے کے بارے میں بتاؤ۔" باپ نے غصے میں کہا۔
بیٹے نے برجستہ جواب دیا۔ "تو آپ کون سے علامہ ہیں' جو آپ کا بیٹا پاس ہوجائے گا۔"
ظہیر مجتبیٰ۔۔۔ فیصل آباد

## ظلم

دو ہم شکل جڑواں بچے سردی کے موسم میں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے' ان میں سے ایک ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہورہا تھا اور دوسرا اداس کونے میں بیٹھا کانپ رہا تھا۔
باپ نے پوچھا "تم اتنا کیوں ہنس رہے ہو؟"
وہ بولا "کچھ نہیں پاپا' آج امی نے دونوں بار اسی کو نہلا دیا ہے۔"

## ذرا سی بات

ایک بچہ روتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ ماں نے رونے کی وجہ پوچھی تو بچے نے کہا۔ "ابا جان دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے تو ان کے ہاتھ پر ہتھوڑی لگ گئی۔"
ماں۔ بولی۔ "بیٹا بہادر بچے ذرا ذرا سی بات پر روتے نہیں ہیں' تمہیں تو ہنسنا چاہیے تھا۔"
بچے نے کہا۔ "امی جان میں ہنسا ہی تو تھا۔"

## عمل

ایک سردار صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے اور کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔"
ڈاکٹر صاحب نے کہا "آپ رات کو دو ہزار تک گنتی گنا کریں۔ نیند آجائے گی۔" دو دن کے بعد سردار صاحب پریشان شکل لیے پھر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔
ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "جی سردار صاحب نیند آئی' عمل کیا آپ نے؟" سردار بولا "جی ہاں کیا تھا بہت مشکل کام تھا' ایک ہزار تک گنا تو نیند آنے لگی' پھر تیز

پتی ڈال جائے پی اور دو ہزار گنتی پوری کی۔"

## دھیان

ماں نے بیٹے سے پوچھا "ٹیپو سلطان کون ہے؟"
"پتا نہیں۔" بیٹے نے جواب دیا "پڑھائی پر دھیان دو۔" ماں نے غصہ سے کہا' پھر بیٹے نے پوچھا۔
"ماما! یہ نوشین آنٹی کون ہیں؟"
"پتا نہیں۔" ماں نے جواب دیا تو بیٹے نے کہا۔ "ماما! پاپا پر دھیان دیں۔"

## ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے سختی جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں تو صرف تیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔"
"کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟" مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔
"جناب! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے اپنے سسرال جا رہا تھا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔
سارہ ظفر۔ ساہیوال

## انداز بیاں اور

ماں نے دوسرے کمرے سے آواز دے کر بیٹے سے پوچھا۔
"بیٹا تمہارا چھوٹا بھائی کیوں رو رہا ہے؟"
"ممی۔ میں اپنے بسکٹ کھا رہا ہوں اور اسے نہیں دے رہا' اس لیے رو رہا ہے۔" بیٹے نے جواب دیا۔ "تو اس کے پاس اپنے بسکٹ نہیں ہیں کیا؟ میں نے اسے بھی تو دیے تھے۔" ماں نے پوچھا۔
"ممی۔ جب میں اس کے بسکٹ کھا رہا تھا' یہ تب بھی رو رہا تھا۔" بڑے بیٹے نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
مومل آفتاب۔ کراچی

## حفظ ماتقدم

ایک مقام پر پاگل خانے کے پاگلوں سے مشقت لی جا رہی تھی۔ کچھ پاگل ایک پہیے والی ٹرالی میں اینٹیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر مامور تھے۔ سپروائزر نے دیکھا کہ ایک پاگل ٹرالی الٹی کیے گھسیٹتا ہوا لا رہا ہے۔ اس نے پاگل سے پوچھا۔ "تم یہ ٹرالی الٹی کیوں لا رہے ہو؟"
پاگل ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں ایک پاگل کھڑا ہے۔ میں جب بھی ٹرالی لے کر وہاں جاتا ہوں' وہ اسے اینٹوں سے بھر دیتا ہے' میں اس سے بچ رہا ہوں۔"

## باعث افسوس

کرکٹ کے ایک جنونی شائق نے اپنے دوست کو بتایا۔ "میری بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ کو ترک نہ کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"
"ہاں! واقعی۔ یہ تو بہت برا ہوگا۔" دوست نے افسوس سے کہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو' میں اس کمی کی شدت سے محسوس کروں گا۔" کرکٹ کے شائق نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔
وانیہ عامر۔ کراچی

## بے بسی

"تمہاری یہ جرأت کہ تم میرے ڈیڈی کو فضول اور بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو۔" لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔
"تو اور کیا کہوں؟" بوائے فرینڈ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر وہ بولے کہ کوئی بات نہیں۔ تدفین کے اخراجات میں برداشت کرلوں گا۔"
ثمینہ اعجاز۔ جہلم

## رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم جائیداد نہ بناؤ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری رغبت دنیا میں بڑھ جائے گی۔"

(ترمذی)

فائدہ:۔

صنعت، تجارت اور کاروبار میں اتنا زیادہ انہماک اور دلچسپی نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کا مقصد زندگی رضائے الٰہی کے بجائے یہی چیزیں بن جائیں اور اس کے شب و روز اسی تگ و دو میں صرف ہوں، ورنہ حسب ضرورت و کفایت تو زمین، کاروبار اور جائیداد وغیرہ بنانا اور رکھنا سب جائز ہے، ممنوع نہیں۔

## حکمت عملی،

حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت میں ایک صوبے میں چوری اور ڈاکا زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہوگیا۔ صوبے کے گورنر کو تنبیہ کے باوجود حالات ٹھیک نہ ہوئے تو حضرت عمرؓ نے گورنر تبدیل کردیا۔ چند ماہ بعد رپورٹ ملی کہ صورت حال ہنوز ویسی ہی ہے۔

حضرت عمرؓ نے خود وہاں کا خفیہ دورہ کیا تو پتا چلا کہ اس صوبے میں روزگار کے مواقع کم ہیں اور غربت بہت زیادہ ہے۔ اور عوام دو وقت کی روٹی سے بھی تنگ ہیں۔

حضرت عمرؓ نے سزاؤں میں نرمی کی اور روزگار کے مواقع مہیا کرنے کے لیے پالیسیاں بنائیں۔

کچھ ہی عرصے بعد چوری اور ڈاکا زنی کی وارداتوں میں کمی آنا شروع ہوگئی اور بالآخر چند مہینوں کے بعد حالات ٹھیک ہوگئے۔

حضرت عمرؓ نے پھر احکامات جاری کیے کہ اب سزاؤں میں پھر سختی کردی جائے کیونکہ اب وہاں روزگار کے مواقع میسر آگئے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک نے یہ راز جان لیا کہ جرائم میں اضافے کی اصل وجہ بے روزگاری اور غربت ہے اس لیے وہاں ہر بے روزگار شہری کو اسٹیٹ کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

صدف عمران۔ کے ڈی اے سوسائٹی

## سنہری کرنیں،

☆ جو شے ناپسند ہو اس کو پسند اور برداشت کرنا صبر کہلاتا ہے۔

☆ فضول گوئی سے دل سخت ہوجاتا ہے۔

☆ زیادہ ہنسنے سے چہرے کا نور ختم ہوجاتا ہے۔

سونیا قریشی۔ ملتان

## سخاوت،

حضرت علی بن حسین جو امام زین العابدین کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت امام حسین کے صاحبزادے تھے۔ کربلا کے میدان میں اہل بیت میں سے آپ ہی باقی رہے تھے۔ بڑے سخی اور دریا دل تھے۔ رات کی تاریکی میں غلہ کے بورے پشت پر لاد کر غریبوں کے گھر پہنچاتے تھے۔ وفات کے بعد جب غسل دیا جانے لگا تو جسم مبارک پر نیل کے نشان نظر آئے۔ معلوم ہوا آٹے کی بوریوں کے بوجھ کے داغ ہیں جنہیں آپ راتوں کو لاد کر غریبوں کے گھر پہنچاتے تھے۔

## حدیث کا احترام،

امام مالکؒ ایک دفعہ حدیث کا درس دے

رہے تھے۔ بچھو قمیص کے اندر گھس گیا اور گیارہ بار ڈنک مارا مگر آپ نے اُف نہ کی اور برابر اپنا بیان جاری رکھا۔ جب درس ختم ہوا تو آپ نے قمیص اتاری۔ جسم پر گیارہ زخم تھے۔

## بات تو سچ ہے،

- جہاں عزت اور خلوص نظر نہ آئے وہاں سے دوستی کا ہاتھ ہٹالو۔ کیونکہ اس سے بہتر تنہائی ہے۔
- انسان پریشانیوں کی گنتی کا ماہر ہے لیکن نعمتوں کا حساب رکھنا بھول جاتا ہے۔
- انسان انمول نہیں ہوتا، اس کا کردار اسے انمول بناتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کسی بھی چیز کی صرف دو بار قدر کرتا ہے۔ ملنے سے پہلے، کھو دینے کے بعد۔
- دُنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے مگر آج ہماری محنت دُنیا کے لیے ہے اور آخرت کو ہم نے نصیب پر چھوڑ دیا ہے۔
- بہت سے نقصان انسان کو اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا۔
- جس انسان کی سانس نکل جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا اور جس انسان سے احساس نکل جائے تو وہ انسان ہی نہیں رہتا۔
- لوگ کیا کہیں گے، یہ ایک ایسا فقرہ ہے جو روزانہ لاکھوں خواب چکنا چُور کر دیتا ہے۔
- مجھے تنہا رہنے سے نفرت ہے۔ لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ مجھے بار بار تکلیف پہنچے۔
- زندگی میں کبھی خود کو کسی کا عادی مت بناؤ کیونکہ انسان بہت خود غرض ہے جب آپ کو پسند کرتا ہے تو آپ کی بُرائی بھول جاتا ہے۔ اور جب آپ سے نفرت کرتا ہے تو آپ کی اچھائی بھول جاتا ہے۔
- اچھے وقت کی ایک خامی ہے کہ جلدی ختم ہو جاتا ہے اور بُرے وقت کی ایک خوبی ہے کہ ہمیشہ نہیں رہتا۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

## عقل مند،

حضرت عبداللہ بن مبارک کے بیٹے کے انتقال پر ایک مجوسی تعزیت کے لیے آیا۔ اس نے ایک جملہ کہا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کو وہ جملہ اتنا پسند آیا کہ فوراً لکھ لیا، وہ جملہ یہ تھا۔

"عقل مند وہ ہے جو اس کام کو آج کرے جس کو جاہل نادان پانچ دن بعد کرے گا۔"

صبر جاہل، نادان بھی کرتا ہے لیکن وقت نکلنے کے بعد مجبوراً۔

ملیحہ رضوان۔ اسلام آباد

## موتی چنے ہیں،

- اگر آپ سے نیک عمل نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب ہے کہ غلط عمل نے اس کا راستہ روکا ہوا ہے، اس لیے آپ غلط عمل کو نکال دو۔
- اپنے غم کو غصہ نہ بناؤ، کیونکہ غم کو غصہ وہ بناتا ہے جو کسی تقدیر کو نہیں مانتا اور جو کسی خدا کو نہیں مانتا۔
- بدی دُعا پر سے اعتماد اُٹھا دیتی ہے اور جو دُعا کے قریب نہیں جا سکتا، وہ خدا کے قریب نہیں جا سکتا۔
- تقاضا چھوڑ دیں، شکایت کرنا بند کر دیں، گلہ کرنا چھوڑ دیں تو زندگی آسان ہو جائے گی۔

(واصف علی واصف)

## صبر،

صبر کا مفہوم یہ ہے کہ مشکل تو ہو لیکن اس کا بیان نہ ہو۔

## غرور،

امام اصمعیؒ کہتے ہیں۔
ابوعمر بن العلا کی انگوٹھی پر یہ عبارت درج تھی۔
"وہ آدمی جس کی تگ و دو دُنیا ہی ہو تو وہ غرور کی رسّی تھامے ہوئے ہے۔"
میں نے ان سے اس کے نقش کرنے کی وجہ پوچھی،

تو انہوں نے بتایا میں دوپہر کو اپنے مال و اسباب کی
تگ و دو میں گھوم رہا تھا کہ ایک کہنے والے کو سنا،
جو یہ کہہ رہا تھا۔
"یہی گھر ہے۔"
اس کا مطلب تھا یہ مال و اسباب فقط یہیں
کام آئے گا۔ میں نے جب دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ میں
نے پوچھا انسان ہو یا جن؟ کہا جن ہوں۔"
اس وقت سے میں نے اپنی انگوٹھی پر اس عبارت
کو نقش کرایا ہے۔

## سچ،

ایک شیخ نے اپنے مرید کو خرقہ خلافت عطا کیا،
اور اسے کسی بستی میں تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد
شیخ کو اطلاع ملی کہ ان کا مرید بڑا کامیاب ہے۔ سب
لوگ اس سے خوش ہیں۔
شیخ نے مرید کو طلب کیا اور کہا "خرقہ خلافت واپس
کر دے۔"
مرید نے شیخ سے ناراضی کا سبب دریافت کیا۔ شیخ
نے کہا۔
"سنا ہے سب لوگ تجھ سے خوش ہیں۔"
مرید نے کہا "اللہ کی مہربانی ہے۔"
شیخ نے غصے سے کہا "سب لوگوں کا خوش ہونا اس
بات کا ثبوت ہے کہ تو نے سچ بولنا چھوڑ دیا ہے۔"

## حضرت عثمانؓ کا کلام،

جو شخص حرام چیزوں سے لذت اور لطف حاصل
کرتا ہے، اس کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان اشیا
کی لذت تو فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کا گناہ اور زنگ
باقی رہ جاتے ہیں۔
حرام کی لذت ختم ہونے کے بعد اس کے برے
عواقب و نتائج فنا نہیں ہوتے تو پھر اس لذت کا کیا
فائدہ جس کا انجام جہنم کی آگ ہو۔

## ظالم کو سزا،

نوشیرواں کے عہد میں ایک ظالم نے ایک ضعیف
کے طمانچہ مارا۔ نوشیرواں نے اس کی گردن اڑا دی۔
ایک مصاحب نے کہا "تھوڑی سی خطا پر ایسی سخت
سزا؟"
نوشیرواں نے کہا "میں نے آدمی کو نہیں مارا بلکہ
ایک بھیڑیے کو قتل کیا ہے تاکہ بھیڑیں محفوظ رہیں۔"
حکمران کے لیے ظلم کے خاتمے کے لیے ظالم کو سخت
سزا دینا ضروری ہے۔

## بڑے لوگ، بڑی باتیں،

☆ جوش اور ہوش بہت کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن جس میں
یہ دونوں وصف موجود ہوں اس سے کبھی لغزش
نہیں ہوتی۔ (ایمرسن)

☆ آپ سیکھنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو سبق
دے سکتی ہے۔ (والٹر)

☆ دنیا میں کئی عجوبے ہیں لیکن انسان سے بڑا عجوبہ
کوئی نہیں ہے۔ (سوفوکلس)

☆ اپنی نیکیوں کے لیے پوشیدہ جگہ بناؤ، جیسے برائیوں
کے لیے بناتے ہو۔ (یحییٰ برمکی)

☆ خاموش اور کم گو آدمی کا ہر جگہ، ہر وقت استقبال
ہوتا ہے۔ (برنارڈ شا)

☆ ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لیتی ہے۔ (سقراط)

☆ سچی محبت یہ بھی ہے کہ بچھڑ جانے کے بعد بھی
اس کی کسک محسوس کرو۔ (بلراج ساہنی)

☆ محبت کا سبق بارش سے سیکھو جو پھولوں کے ساتھ ساتھ
کانٹوں پر بھی برستی ہے۔ (جارج واشنگٹن)

نمرہ، اقرا۔ کراچی

خالدہ جیلانی

# کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ناہید اصغر آرائیں ــــــــ لالہ موسیٰ

وہ موم میرے عشق کی تاثیر سے ہوا
لیکن یہ واقعہ بڑی تاخیر سے ہوا

مصباح نثار ــــــــ ڈونگہ بونگہ

کیا بتاؤں کتنا مشکل ہے
جس کے لیے جینا اس کے بغیر جینا

عمارہ نثار ــــــــ ڈونگہ بونگہ

لاحاصل ہی سہی مگر محبت
اسی سے تھی اور اسی سے ہے

ملیحہ رضوان ــــــــ اسلام آباد

جس نے جانے کا اس کے وعدوں سے میرا دل یقین
چلیں گی پانی میں کاغذ کی کشتیاں کب تک

ثنا عبدالقیوم ــــــــ بنگہ چیمہ

ہجر کی شب میں قید کرے یا صبح وصال میں رکھے
اچھا مولا! تیری مرضی تو جس حال میں رکھے
کھیل یہ کیسا کھیل رہی ہے دل سے تری محبت
اک پل کی سرشاری دے اور دنوں ملال میں رکھے

نوشابہ منظور ــــــــ مریا روڈ

رات بیتی تو گنے آبلے اور پھر سوچا
کون تھا باعث آغاز سفر شام کے بعد

اسعدیٰ مختار ــــــــ میاں چنوں

اگر بے عیب چاہو، تو فرشتوں سے نباہ کر لو
میں آدم کی نشانی ہوں مجھے انسان ہی رہنے دو

آمنہ اُجالا ــــــــ ڈہرکی

سنا ہے اس کے عہد وفا میں ہوا بھی مفت نہیں ملتی
ان گلیوں میں ہر ہر سانس پہ بھرتے ہیں جرمانے لوگ

انجل ــــــــ ڈہرکی

اگر تم سے کوئی پوچھے، بتاؤ زندگی کیا ہے
ہتھیلی پہ ذرا سی خاک رکھنا اور اڑا دینا

زارا شاہ ــــــــ کوٹ نجیب اللہ

ایک پل نہیں گزرتا تھا جس کے بنا اپنا!
میرے حوصلے کی داد دو کہ اک عمر گزاری ہے اس کے بغیر

اقرار بٹ ــــــــ گوجرانوالہ

محبت پھر اس طرح سے وارد ہوئی ہے میری ذات پر
خزاں کے موسم میں کوئی پھول کھلا ہو جیسے

اقصیٰ ناصر ــــــــ کراچی

اے عشق کے بزدل سپہ سالار آ کر میرا حوصلہ تو دیکھ
تنہا کھڑا ہوں میں تیری یادوں کے لشکر کے سامنے

نمرہ اقرأ ــــــــ کراچی

مرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرۂ بے نشاں
مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے

ملائکہ کوثر ــــــــ بسم اللہ پور

لبوں پہ گیت تو آنکھوں میں خواب رکھتے تھے
کبھی کتابوں میں ہم بھی گلاب رکھتے تھے
کبھی کسی کا جو ہوتا تھا انتظار ہمیں
بڑا ہی شام و سحر کا حساب رکھتے تھے

رافیہ کنول ــــــــ داتڑہ دین پناہ

میں پا نہ سکا آج تک اس کشمکش سے چھٹکارا محسن
وہ مجھے جیت بھی سکتا تھا مگر ہارا کیوں

عائشہ جمیل ــــــــ لاہور

ہاتھوں میں مشعلیں لیے کچھ لوگ رات کو
دے کر فریب زندگی بستی جلا گئے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ سب کی عافیت' سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں!
اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو' ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

**پہلا خط پاک پتن سے فریدہ فرید کا ہے' لکھتی ہیں۔**

دلفریب سرورق پر ماڈل تو جو تھی سو تھی' جیولری غضب کی تھی۔ پہلی شعاع کا بغور مطالعہ کیے جان سے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے فیض حاصل کیے' میری پہلی چھلانگ "خط آپ کے" پر تھی انٹرویوز سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے' شعاع کو جہاں بہترین رائٹرز کا ساتھ حاصل ہے وہیں ہماری قاری بہنوں کا شعور بھی داد کا مستحق ہے' ایک اسٹوری کو پڑھ کر جو بھی پوائنٹس میرے ذہن میں اٹھتے ہیں' وہ سب میرے فرینڈز کے خطوط میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات قلم اٹھانے میں کاہلی آجاتی ہے اور خط کے جواب ارسال کرتی سوبٹ سی ہستی کا کیا ہی کہنا۔

سلسلہ وار ناولز میں نہ بھی لکھوں تو اظہر من الشمس ہے۔ ہماری "یارم" کی تخلیق کار سوپر ڈوپر ہٹ ہیں۔ "ایک تھی مثال" اب مطالعہ میں نہیں رہا۔ "رقص بسمل" کو نظروں سے گزار لیتے ہیں نازیہ جمال میری ناقص معلومات کے تحت شاید نیا نام ہے' مگر تحریر میں پختگی اور دلچسپی کا عنصر کسی منجھی رائٹر سے کم نہیں تھا' شعاع کے دسترخوان پر کوئی بھی کھانا بے لذت ہو ہی نہیں سکتا۔

جویریہ شاہ کے احساسات میں ہر گھر کی کہانی پوشیدہ تھی۔ "غریق رحمت" کی آخری قسط بوجھل دل کے ساتھ پڑھی۔ حق یہ ہے کہ سحر ساجد نے پروردگار گناہگار اور توبہ کے درمیان ربط بیان کرنے کا حق ادا کر دیا۔

ج:۔ پیاری فریدہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی ایک کہانی شائع ہو چکی ہے اور دوسری کہانی موصول ہو گئی ہے۔ ناقابل اشاعت تحریروں کے بارے میں ہم پرچے میں نہیں لکھ سکتے' البتہ یہ ضرور بتا سکتے ہیں کہ کون سی تحریر موصول ہو گئی ہے۔ دن بھر فونز کا تانتا بندھا رہتا ہے اس لیے ہمارا نمبر مشکل سے ملتا ہے۔ آپ جب کہانی بھجوائیں تو اپنا فون نمبر ضرور لکھیں۔ ہم آپ کو خود فون کر کے کہانی کے قابل اشاعت ہونے کے بارے میں بتا دیں گے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

**ثمرہ احمد بٹ نے پتوکی سے لکھا ہے۔**

کافی عرصے کے بعد وجہ حارث قیوم' سحر ساجد غریق رحمت کے ساتھ ایک بہت اچھا قدم۔ عمیرہ' نمرہ اور عنیزہ سید کے بعد ان کی تحریر سمجھ دار سمجھ داری سی ہے۔ اچھی لگی دراصل ایک قاری بہن کا خط پڑھا کہ اب فہم کے بعد بچوں جیسی کہانیاں انسپائر نہیں کرتیں ان کی بات بالکل بجا ہے' لیکن نئی بچیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے' تب ہی تو وہ بھی عمیرہ' نمرہ' عنیزہ' میمونہ' نگہت' ثمرہ' عالیہ' راحت سسٹرز' راشدہ آمنہ بنیں گی۔ دل بڑا کریں قارئین کرام۔

پلیز عالیہ سے کہیں کہ آکر رونق دوبالا کریں بمع راحت سسٹرز' راشدہ اینڈ آمنہ ریاض۔ ذاتی طور پر مجھے بھی محبت

بھری مگر ٹھوس کہانیاں پسند ہیں۔ عشق حقیقی سے مزین عمیرہ احمد کی اور فلسفے بھری عنیزہ سید کی 'رومانٹک باکردار عالیہ' آمنہ اور راحت + میمونہ کی یہ سارے پھول آپ کے گلدستے یعنی (شعاع' خواتین) کو مہکاتے مہکاتے تھک گئے یا پھر لمبی چھٹی پر اپنی زندگی میں گم ہوگئے انہیں تلاشیئے' فی الحال میں نے فرمائشوں کے ساتھ ساتھ سحر ساجد کی بھی حوصلہ افزائی کرنی ہے کہ وہ زینب آپا' حارث قیوم' شفیق بھائی + ڈاکٹر حسنات کے ساتھ اچھی بامعنی کہانی لکھ سکیں۔ خاص طور پر توبہ'' کو سرفہرست رکھا۔ لمحہ ہدایت دیکھنے پڑھنے' سننے میں عام سا لفظ ہے کہ ہر دوسرا شخص اس کو دہراتا رہتا ہے مگر ہاں' جب یہ کسی کی زندگی میں آتا ہے تو ہرگز ہرگز عام نہیں ہوتا۔'' کہانی کی یہ لائن کہانی کی جان ہے قارئین نے ''یارم'' سمیرا حمید کی بہت پسند کی لاسٹ والی قسط مارچ 2015ء شعاع میں ابھی پڑھی تو معلوم ہوا لوگ سچ ہی تعریف کرتے ہیں۔ ''ایک ننھی مثال'' رخسانہ نگار کی باقاعدہ پڑھ رہی ہوں۔

ننھے ننھے افسانے 'اللہ بخشے' جھجک' بامعنی اور باحقیقت رہے' نازیہ جمال یہ تو دل کی بات ہے۔ ایک ہلکی پھلکی پیاری سی تحریر لائیں ''رقص بسمل'' میں نبیلہ عزیز اب اینڈ کس طرح کریں گی' انتظار ہے' فیورٹ اسٹوری ہے کچھ کچھ تجسس لیے۔ مومنہ افتخار کی تحریر قید فلمی فلمی رہی۔ چلیں جناب ایک دو تحریریں فلمی فلمی بھی ہونی چاہئیں۔ ہر کردار کے جذبات و احساسات کو نہایت عمدہ لفظوں میں بیان کیا گیا جس سے ناول کی خوب صورتی مزید بڑھ گئی۔

پیاری ثمرہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ یہ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ وہ شعاع کے لیے لکھیں۔

سمیرا حمید کے ناول کی آپ نے تعریف کی' لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کو آخری قسط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ لوگ سچ تعریف کرتے ہیں۔ کیا آپ نے شروع سے ''یارم'' کی اقساط نہیں پڑھیں؟

### شمائلہ شریف کھڈیاں خاص قصور سے لکھتی ہیں

یارم! یارم! یارم! نو مہینے تک قائم رہنے والا سحر جانے کب ختم ہوگا اب۔ تعریف کے لیے الفاظ ہی ختم ہیں سمیرا۔ اللہ نے بہت محبت سے بہت خاص بنایا ہے آپ کو۔

رشک آیا امرحہ پر جس کے پاس دادا جیسا رشتہ ہے۔ اور دل شدید دکھ سے بھر گیا۔ اپنے لیے جس کے پاس نہ دادا ہے نہ باپ۔ پر بہت خوش ہوں کہ ویرا جیسی بہت پیاری دوست عظمیٰ ہے۔ سادھنا کے جیسی پیاری بہن عذرا ہے۔

پیاری شمائلہ! اللہ آپ کے ان رشتوں کو سلامت رکھے۔ سمیرا تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

### ڈاکٹر ساحرہ تبسم نے اوکاڑہ سے لکھا ہے

روز رفتہ ہانگ کانگ سے بہ میعاد تین برس کے مراجعت ہوئی۔ بذریعہ برٹش ایرویز ہم سرزمین کراچی پر وارد ہوئے اور ریل سے رینگ رینگ کر (کیونکہ وہاں کی ریل کی نسبت یہاں کی ریل رینگتی ہی ہے) اوکاڑہ پہنچے اسٹیشن پر اسٹال پہ شعاع کے سرورق سے متاثر ہو کر مچل گئے۔ سو خریدا اور گھر آئے اوراق کی نکہت دلفریب اور تحریروں کا تنوع و تلون جی لبھا گیا۔ کل شب خط آپ کے' اول تا مکمل ناول' آخر تمام پڑھ ڈالا۔ علی الصباح والا نامہ لکھتی ہوں۔

جدت کے دور حاضر میں جہاں ٹی وی اور انٹرنیٹ علم و ادب کی تنزل پذیری کا موجب ہوئے وہاں شعاع کے اجرا نے ہمارے لٹریچر کو احیا کیا۔ مجھے جس قدر مسرت ہوئی وہ الفاظ میں بیاں و عیاں کرنا ناممکن۔

''یارم'' کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ سمیرا نے واقعی میرے دماغ کے ستون ہلا دیے۔ میں نے اس سے قبل اتنی بہترین منظر کشی گوروں کی تخالیق میں دیکھی تھی' اور ایک لمحے کے لیے تو یوں ہی لگا کہ کسی گورے کی تصنیف کا اردو میں بڑی مہارت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ سمیرا اپنے کام میں مناقب کاملہ اور مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ تحریر میں فصاحت بھی عمدہ رہی۔

''غریق رحمت'' میں سحر نے واقعی سحر کر دیا۔ بہت عمدہ سب افسانے بالخصوص جھجک بہترین گئے۔ موجودہ دور میں ہر گھر میں ایک حریم اور عفرا ہیں۔ انٹرویو پڑھ کر مزہ آیا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ کی شیرینی بھی قابل تحسین ہے۔ باقی

سب بھی عمدہ رہا۔

حرا قریشی نے ملتان سے لکھا "ساڈی ملرفو مبارکاں!"

حرا جی۔ ملرفو اردو لفظ ظرف کی بگڑی شکل ہے' پنجابی میں ولوں استعمال ہوتا ہے۔ خیر میں تنقید نہیں کر رہی۔ آخر میں جاتے جاتے ننھی سی دعا۔

"رب العزت اس عنبر فشاں اور رعنا کار عظیم کو اوج کمال ودیعت کرے۔ آمین

پیاری ساحرہ آپ نے وضاحت نہیں کی کہ یارم کی آخری قسط پڑھی ہے یا آپ ہانگ کانگ میں بھی شعاع پڑھتی رہی ہیں۔ بہرحال تبصرے سے تو لگتا ہے کہ شعاع کا اور آپ کا طویل ساتھ ہے۔

آپ کی تحریر کی فصاحت و بلاغت بھی اپنی جگہ بہت خوب ہے۔ بہت شکریہ آپ نے خط لکھا' اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

**سحرش خان، بھٹو نے کراچی سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں**

مارچ کا شعاع ملا' رنگوں اور خوشبوؤں سے سجی سمیرا حمید کی تحریر "یارم" نے تو ہمیں سیدھا سمیرا اسندری کا ہی دیوانہ بنا ڈالا ۔ ویل ڈن ۔ ویل ڈن ڈیئر سمیرا آپ نے بہت ہی اچھا لکھا۔

آخر میں فرحت آپی سے کہیں کہ وہ جلدی سے ایک اچھی سی تحریر لے کر حاضر ہو جائیں۔

پیاری سحرش! آپ کی تعریف سمیرا تک اور فرمائش فرحت تک پہنچا رہے ہیں۔

**لبنیٰ یوسف نے مراد پور راسہو سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں**

پچھلے آٹھ سالوں سے شعاع ۔ خواتین کی خاموش قاری ہوں' خاموشی توڑنے پہ مجبور کیا "یارم" ۔ سمیرا جی نے پچھلے ماہ جتنا رلایا اس ماہ اتنی ہی خوشی ملی یار آخر کو ہماری امرحہ اور عالیان ایک جو ہو گئے ہیں' یارم کے لیے کوئی بات سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے' آپی میں نے سمیرا حمید کی Pic دیکھی تھی نیٹ پہ مگر مجھے نہیں لگتا کہ یہ سمیرا جی ہیں کیونکہ میں ان کو کوئی ینگ سی گرل سمجھتی تھی اور Pic میں وہ آنٹی ہیں ۔ پلیز مجھے ان کی عمر ای میل کر کے بتا دیں کہ میری غلط فہمی دور ہو کیونکہ Pic میں وہ موٹی سی ہیں اور عینک بھی لگی ہوئی ہے' ان کے نام پہ ایک وہی پک آئی ہے' میں سرچ کر کر کے تھک گئی ہوں اور اس ماہ کی سب سے اچھی بات کہ میں اور زینب میری چھوٹی بہن اس ماہ لڑے نہیں' کیونکہ ہر ماہ ڈائجسٹ کے آتے ہی ہماری لڑائی ہوتی کہ پہلے میں پڑھوں گی مگر اس بار ہم دونوں نے سر جوڑ کر پڑھا یارم کو اور بہت مزا بھی آیا' ہمارے پیارے بھائی ہر ماہ اپنی پاکٹ منی سے خواتین اور شعاع لا کر دیتے ہیں۔

ج : پیاری لبنیٰ! آپ اپنی غلط فہمی دور کرلیں۔ یقیناً" آپ نے کسی اور سمیرا کی تصویر دیکھی ہے سمیرا حمید بالکل بھی موٹی نہیں ہیں' وہ بہت اسمارٹ ہیں۔ کم عمر ہیں اور کم عمر نظر بھی آتی ہیں۔ چشمہ بھی نہیں لگاتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اپنے بھائی کو بھی ہمارا شکریہ پہنچا دیں جو ہر ماہ آپ کو رسالے لا کر دیتے ہیں۔

**خدیجہ فواد نے لاہور سے لکھا ہے**

شعاع اور خواتین کو اتنے عرصے سے پڑھنے اور پسند کرنے کے باوجود یہ ہمارا پہلا خط ہے۔ وہ بھی سمیرا حمید کے شاہکار "یارم" کی بدولت' ورنہ ہم نے اپنی خط لکھنے کی صلاحیت کو زنگ ہی لگا دینا تھا۔

جی تو "یارم" پہلی قسط ہی سے بہت انوکھا' منفرد اور نرالا سا لگا۔ سمیرا نے اسے بہت ہی پیار سے لکھا ہے اور محنت سے' جو کہ اس کی ہر ہر سطر میں نظر آ رہی ہے۔ بعض دفعہ ایسا لگتا تھا کہ سمیرا امرحہ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ہر منظر ہر بات کو اپنے قلم سے قید کرنے کے لیے۔ سب کردار ایسے حقیقی لگتے ہیں۔ تصوراتی تو بالکل بھی نہیں۔

سمیرا حمید نے اتنی خوب صورتی سے ایک بات کو دس دس زاویوں سے پیش کیا کہ پڑھنے والا ان لفظوں کے سحر سے ہی نہ نکل پائے۔ اس تحریر نے بہت ہنسایا اور رلایا بھی۔ خیر سمیرا حمید نے آخری قسط میں سب کے صدمے دور کر دیے۔ بہت تفصیلی قسط تھی۔ اسپیشلی ویڈنگ پرانکس کہ اب ان کے بغیر تو ہمیں شادیاں ادھوری لگیں گی۔

دل چاہ رہا ہے کہ کچھ مہینوں میں ہونے والی اپنے بھائی کی شادی پر میں بھی دو تین ویڈنگ پرانک ترتیب دے ڈالوں۔ لیکن ہمارے ہاں کے بڑے بوڑھے تو چھوڑنے والے نہیں۔ چلو کوئی بات نہیں اپنے بچوں کی شادیوں پر

موقع نہ ملا تو (پوتے پوتیوں) کی دفعہ دل کے ارمان نکال لوں گی۔ آخر تب فیملی کی بڑی بوڑھی میں بن گئی ہوں گی ناں‘ افسانوں میں نبیلہ صدیقی کا افسانہ اچھا لگا۔ ایک تھی مثال بہت ڈیپریس جا رہی ہے۔ پلیز اس میں کچھ اچھا ہونا چاہیے۔ حنا کنول کا شعاع کا ساتھ پسند آیا۔ خطوط بھی سب اچھے تھے۔

شعاع کے باقی سلسلوں میں پیارے نبی کی پیاری باتیں اور تاریخ کے جھروکے میری امی ساس بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ موسم کے پکوان میں زگر پر گر کی ریسپی اچھی لگی اور ضرور ٹرائی بھی کروں گی۔ کیونکہ میری بیٹی بہت شوق سے کھاتی ہے۔

پیاری خدیجہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا پورا خط شائع نہ کرسکے۔ آپ اتنا اچھا خط لکھتی ہیں پھر بھی لکھنے میں اتنی سستی اب ہر ماہ ہمیں خط لکھیے گا۔

## خضریٰ ظفر نے رحیم یار خان سے لکھا ہے

ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ ماڈل کی صرف چوڑیاں اچھی لگ رہی تھیں۔ میں خط صرف اپنے فیورٹ ناول "یارم" کی وجہ سے لکھ رہی ہوں کیونکہ آخری قسط تو بہترین تھی۔ آخر کار ایک اور زبردست ناول اختتام پذیر ہو گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ سمیرا چھوٹی سی عمر میں اتنا عمدہ لکھ لیتی ہیں۔ اور آخر میں ایک ریکویسٹ کہ پلیز میرے پسندیدہ گلوکار عاطف اسلم اور شانو یعنی کہ ماہرہ خان کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔

پیاری خضریٰ! حیرت تو ہمیں بھی ہوئی تھی اور سمیرا سے ملے تھے تو پہلا سوال ان سے یہی کیا تھا۔ انہوں نے انتہائی معصومیت سے کہا "ذہن میں آتا ہے تو لکھ دیتی ہوں۔" یہ واقعی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ خداداد صلاحیت ہے۔

## نور عبدالسلام تواب شاہ سے شریک محفل ہیں‘ لکھا ہے

حمد و نعت پڑھ کر اور پیاری باتیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھ کر آگے بڑھے۔ ساری کہانیاں پڑھ کر آخر میں "یارم" پڑھی۔ زبردست بہت ہی اچھی (توقعات سے بھی بڑھ کر) ڈن سمیرا جی! بہت اچھا اینڈ کیا ہے قید بھی مکمل ناول اچھا لگا باقی سب سلسلے مکمل تھے۔

"یارم" کی سب سے اچھی بات "زندگی کو فیری ٹیل ہماری سوچ بناتی ہے۔ پرنس چارمنگ وہ نہیں جو ایک بڑی سلطنت کا شہزادہ ہے یا جو بہت خوب صورت ہے۔ پرنس چارمنگ ہر وہ انسان ہے جو ایک شفاف دل کا مالک ہے جو بلاامتیاز انسانوں سے محبت کرتا ہے میں "تم" عالیان ' امرحہ "کا دل ہم سب۔"

پیاری نور! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سمیرا اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

## حمیرا نوشین نے منڈی بہاؤالدین سے شرکت کی ہے‘ لکھتی ہیں

آغا علی عباس کی جدوجہد سے پُر زندگی سے متاثر ہو کر سحر ساجد کی "غرق رحمت" کی طرف بڑھے۔ بہت عرصہ کے بعد روح و دل کو جھنجوڑ دینے والی تحریر پڑھنے کو ملی۔ اسے پڑھتے ہوئے کبھی روئے کھڑے ہوئے تو کبھی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ کبھی ملال ہوا تو کبھی نہال ہوئے۔

عمیرہ احمد کا پیر کامل 'نمرہ احمد کا مصحف اور اب سحر ساجد کے غرق رحمت کے سحر سے میں کبھی نکلنا نہیں چاہتی۔ نور عین کے افسانے کو دلچسپی سے پڑھا۔ نبیلہ صدیقی نے لوگوں کی ایک عام برائی کی طرف ہلکے پھلکے انداز میں توجہ مبذول کروائی۔ جویریہ شاہ کا افسانہ بھی ٹھیک ہی لگا۔ مجموعی طور پر رسالہ خوب تھا۔

پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں' آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

## عینی جعفری نے جلال پور جٹاں ضلع خوشاب سے لکھا ہے

"یارم" زندہ دل لوگوں کی زندہ دل داستان جس نے مجھ سے کہا۔ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" "یارم بے چینیوں کو سکون اور مایوسیوں کو امید کی کرن دکھاتا ہے" "بے مثل نگینہ" "ہنت حمید کے لکھے لفظ لفظ نے ہمیں اپنا گرویدہ کرلیا"

بات آج کی نہیں نو ماہ پہلے کی ہے۔ یارم کی پہلی قسط پڑھی۔ واہ! کیا بات ہے۔ زندگی ایسی بھی ہوتی ہے اور جوں جوں یارم اپنی تمام تر خوب صورتیوں سمیت آگے بڑھا' ناو

ایک سحر میں جکڑتا چلا گیا۔ الفاظ ہیں یا کوئی جادو نگری ایسے جادوئی اسم کہ سحر زدہ کردیں۔ اور کردار ایسے جیسے آسمان سے اتاری خاص مخلوق آخر کیا ہیں سمیرا جی....؟ کہاں سے آیا ان کے پاس علم کا یہ وسیع خزانہ۔ یارم کے ساتھ روئے بھی، ہنسے بھی اور افسردہ بھی ہوئے لیکن اختتام پہ سمیرا جی بس سیر کردیا۔ کاش ایک کارل ہمارے پاس بھی ہوتا۔ سمیرا جی پلیز لکھتی رہیے۔

پیاری عینی! آٹھ سال کی طویل مدت اور صرف ایک خط اور صرف ایک کہانی پر تبصرہ.... اتنے خوب صورت الفاظ لکھنے والی عینی کو تو ہر ماہ خط لکھنا چاہیے۔ عینی آپ میں صلاحیت ہے آپ دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیں اور کہانیاں لکھنے پر بھی توجہ دیں۔

## فوزیہ ثمر بٹ اور ام ہانیہ عمران گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل ذرا سا بھی اچھا نہیں تھا۔ نہ ہی اچھی جیولری اور ڈریس تو بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ بدلتے موسم کے لحاظ سے سرورق ہونا چاہیے۔ خیر پہلی شعاع، اچھی باتیں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں دل و جان کو معطر کرتی ہوئیں، آغا علی عباس کی باتیں اچھی لگیں۔

سب سے پہلے یارم کو پڑھا۔ ایک خوب صورت تحریر کا پیارا سا ہیپی اینڈ۔ کارل ہمیشہ ایک اچھی یاد کی صورت ذہن میں نقش ہو گیا۔ مجھے تو یارم کی ہر ہر سطر اچھی لگتی تھی۔ مشعل فیاض، انسان نہ تو الفاظ بھولتا ہے اور نہ ہی کہانی اگر تحریر کو دل کی گہرائیوں سے پڑھا جائے میرے خیال میں سمیرا حمید کے قلم نے ہمیشہ اپنی انفرادیت رکھی ہے۔ اور یہی ان کی تحریروں کی خوب صورتی ہے۔ اور ہاں مختلف آرا سامنے آئیں کہ کہانی کم تھی فلسفہ زیادہ پھر بھی تمام کے تمام کردار مثل بے مثال تھے۔

مستقل ناول رقص بسمل۔ بالکل سلو جا رہا ہے۔ انیسویں قسط ہو گئی اب تو پردہ غائب سے ماورا کا مقصد باہر لائیں۔ ایک تھی مثال بھی روٹین وائز جا رہا ہے۔ غزل رحمت اینڈ اچھا تھا۔ بہت دل دکھا اس تحریر کو پڑھ کر۔ پتا نہیں بھائی جیسی مخلوق اوپر والے نے اتنی بے حس کیوں بنائی ہے۔

یہ تو دل کی بات ہے کمال کی ترجمانی کی ہے رائٹر نے میری زندگی کی۔ عمیر کو بس چار جوتے لگانے کی حسرت رہ گئی۔ اور ہاں یہ بھابیاں (تمام نہیں) کس خاص فارمولے میں رب بناتا ہے۔ جیتی جاگتی شیطان کی ماسیاں (خالائیں)

افسانے سب ہی اچھے لگے۔ جھک یہاں بھی ایک بھابھی صاحبہ براجمان ہو گئیں اف یہ مخلوق.... مارچ کا شمارہ 2 کو ملا تھا۔ آج 5 کو بیٹھی خط لکھ رہی ہوں پلیز، پلیز خط شامل ضرور کیجئے گا اور کیا نادیہ امین شعاع کے لیے ایک پیارا سا ناول نہیں لا سکتیں۔ دستک میں شائستہ جبیں کو ضرور لائیں۔

دعاؤں میں ضرور شامل رکھیے آج کل شدت سے ضرورت ہے ان کی مجھے۔

ہم نے یہ سوچ کر ہنسنے کا ہنر سیکھ لیا
درد رکھنا ہے تو پھر دیدۂ تر کیا رکھنا

پیاری فوزیہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ لیکن بھابھیوں کو شیطان کی ماسیاں کہنے والی بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ نندیں بھی کسی کی بھابھیاں ہوتی ہیں اور پانچوں انگلیاں بھی برابر نہیں ہوتیں۔ آپ کی پیاری بھتیجی ام ہانیہ عمران کو سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔ اگرچہ یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو ام ہانیہ اپنی سالگرہ منا چکی ہوں گی۔

نادیہ امین تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، ہماری بھی خواہش ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔

تبصرہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور تفصیلی ہے۔ تہہ دل سے شکریہ۔

## لاہور سے سبین مغل لکھتی ہیں

سب سے پہلے میں فروری 15ء کے شمارے کا ذکر کروں گی۔ اس میں فرح بخاری کی تحریر "شام خزاں طویل سہی" میں ایک جگہ ہیروئن "خزران" "نماز عصر کے بعد شکرانے کے نوافل ادا کرتی ہے۔ جبکہ میری معلومات کے مطابق عصر کی نماز پڑھنے کے بعد مغرب کی نماز ادا کرنے تک کوئی سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے اس دوران نوافل کی ادائیگی منع ہے۔ اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کون سی بات درست ہے؟

اس ماہ کا سرورق ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسٹار پلس کے

ڈراموں کی کوئی ہیروئن کی تصویر لگا دی گئی ہو۔ (پتا نہیں رسالہ دیکھتے ہی ایسا خیال کیوں آیا.....؟) سب سے پہلے تو سمیرا حمید کا ذکر کروں گی۔ "یارم" لکھ کر انہوں نے ہمیں دوبارہ اس جگہ پہنچا دیا' جہاں آج سے کچھ عرصہ پہلے ہم اپنے تعلیمی اداروں میں تھے۔ میرا خیال ہے کہ سمیرا کارل کے کردار کو ابھی آگے کسی دوسری تحریر میں لائیں گی۔ کیونکہ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اسی قلم سے میں دوبارہ آنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میرا انتظار کیا جائے۔" ہمیں سمیرا سے ایک شکوہ ہے کہ وہ "ویرا" کے ساتھ کچھ تو اچھا کرتیں۔ اتنی پیاری لڑکی کا اگر کارل کے ساتھ جوڑ بنا دیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ افسوس!

سحر ساجد کی تحریر "غریق رحمت" ایک بہترین تحریر تھی۔ حارث کا اس سے بہتر انجام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس میں بدکار عورت کا واقعہ اور پانی کے گلاس میں سیاہی والی مثال بہت ہی اچھی لگی۔ رخسانہ صاحبہ کا ناول اچھا ضرور ہے مگر چیونٹی کی رفتار سے (اوہو! چیونٹی تو تیز چلتی ہے) کچھوے کی چال چل رہا ہے۔ اسے جلد مکمل کریں اور کوئی مکمل ناول لکھیں نا پلیز۔

پیاری سیمین! آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد کوئی سجدہ جائز نہیں یعنی عصر کی نماز کے بعد مغرب تک کوئی نفل نماز نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ سہواً لکھا گیا۔ ہمیں اس کی تصحیح کرنا چاہیے تھی لیکن اکثر پروف پڑھتے ہوئے نظر چوک جاتی ہے اور اس طرح کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

آپ کی بہن فرحین خورشید کو مسز فرحین احتشام بننے پر مبارک باد' آپ ان سے کہیں کہ شعاع کے ساتھ ساتھ وہ دوبارہ لکھ دیں' ویسے بھی وہ اب مسز فرحین احتشام بن گئی ہیں۔ زندگی میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ معمولات بھی تبدیل ہوئے ہوں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## عاتکہ عامر۔ کراچی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

مارچ کا شعاع اچھا تھا نمل 'ایک تھی مثال اور آب حیات یقیناً" زبردست تحریریں ہیں' پلیز رخسانہ جی سے کہیں کہ وہ مثال اور واثق کو ملا دیں۔ میں ان کی یہ پہلی تحریر پڑھ رہی ہوں تو پلیز اس کے علاوہ نمل ایک طرح سے فلمی کہانی ہے پر مزہ دیتی ہے آب حیات سوپر ڈوپر ہٹ ہے اب تک۔ آگے میں نہیں جانتی۔

پیاری عاتکہ! آپ نے ایک ہی خط میں شعاع اور خواتین کی کہانیوں پر تبصرہ کیا ہے' نمل اور "آب حیات" خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو رہی ہیں۔

یہ آپ کا پہلا خط تھا۔ اس لیے شائع کر دیا۔ آئندہ خواتین اور شعاع کے لیے خط لکھیں تو علیحدہ صفحات استعمال کریں۔

## عابدہ بشیر عالی احمد نے گجرات سے لکھا ہے

سب سے پہلے یارم سمیرا آپی کا پڑھا۔ سمیرا آپی کے الفاظ سیپ میں بند خوب صورت موتیوں کی طرح ہیں۔ شاید میرے پاس ایسے نادر و نایاب الفاظ ہی نہیں جو سمیرا آپی کی تعریف میں کہہ سکوں۔ قید ناول بھی اچھا تھا۔ افسانے بھی تینوں بیسٹ تھے۔ نازیہ جمال نیر نے بھی اینڈ تک پکڑے رکھا۔ سارا رسالہ بیسٹ تھا۔ اب بات کروں گی کچھ قاری بہنوں کی' جنہوں نے "یارم" میں فلسفے کی بات کی۔ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔ مجھے شدید تپ چڑھ گئی یار! اگر فلسفہ ہے تو فلسفہ لکھنے والے کو اس فلسفے کی سمجھ بوجھ تھی' تب ہی تو یہ لکھا گیا۔ (معذرت کے ساتھ)

ج:۔ پیاری عابدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا افسانہ ناقابل اشاعت ہے' دوسرا افسانہ پڑھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے۔ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## ندا غوری نے غازی روڈ لاہور سے لکھا ہے

اس ماہ کا سرورق بہت ہی فضول تھا' بلکہ ہر بار ہی تقریباً" ٹائٹل بہت برا ہوتا ہے۔ "یارم" بہت زبردست اور مزے کا ناول تھا' لیکن حقیقت سے کافی دور اور فلسفہ ایکسٹرا آڈرنری تھا۔ "یہ تو دل کی بات ہے" اور "غریق رحمت" بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ میرا روبرو میں سمیرا حمید سے یہ سوال ہے کہ ان کی پہلی کہانی کون سی تھی؟ اور ڈائجسٹ کے آفس میں کہانی بھیجنے کے کتنے عرصے بعد ان کی کہانی شائع ہوئی؟ اور پلیز مجھے کرن ڈائجسٹ میں خط و کتابت کا پتا دیں۔ (آئی مین ایڈریس) نمرہ احمد سے مجھے یہ کہنا تھا کہ وہ برائے مہربانی حد سے زیادہ منظر نگاری' وہ بھی جو سوچی نہ جا سکے پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہے۔ دوسری

بات کہ دیکھنے اور امیجن کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تمام رائٹرز جو آج کل غیر روایتی کہانیاں لکھنے کے چکر میں کہانی کو حقیقت بالکل سے دور لے جاتی ہیں اور لگتا ہے جیسے یہ ناول زمین کے بجائے مریخ پر بیٹھ کر لکھا گیا ہے یعنی ناقابل تصور۔ وہ یہ بات ذہن میں رکھا کریں کہ ہم زمین پہ رہتے ہیں اور وہ بھی پاکستان میں سحر ساجد' فرح بخاری اور صوفیہ چشتی میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔

ج :۔ پیاری ندا! سمیرا حمید اور نمرہ احمد کا شمار اس وقت ہماری مقبول ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ خط لکھنے کا شکریہ۔

## قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

عروج مغل نے للہ ٹاؤن سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سلام عرض ہے کہ باقی شعاع پر تبصرہ بعد میں' ابھی صرف ''یارم'' پر تبصرہ کرنا ہے۔ میں شعاع میں خط لکھوں اور نمرہ احمد کا ذکر نہ ہو' یہ تو ممکن ہی نہیں۔ نمرہ احمد ایک ایسی رائٹر ہے جسے میں استاد کا درجہ دیتی ہوں۔ روحانی استاد۔ سمیرا حمید اور ''یارم'' سمیرا حمید نے میرے سامنے لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ ایسی رائٹرز ہیں جنہوں نے اپنا کیریئر ہی پیک سے شروع کیا ہے۔ انہوں نے پڑھا ہے' بہت پڑھا ہے اور اب اگلنے لگی ہیں تو لکھنا شروع کردیا ہے۔ یہ جملے میں نے کہیں پڑھے تھے اور مجھے ان پر بالکل صادق لگے ہیں۔

ج :۔ پیاری عروج! سمیرا حمید اور نمرہ احمد تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

پارس بنت زاہدہ لکھتی ہیں

میری موسٹ فیورٹ رائٹر... نمرہ احمد ہیں۔ ان کے لیے تو میرے پاس لفظ ہی نہیں ہیں نا۔ سمیرا حمید بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ان کا یہ ناول ''یارم'' بہت ہی فنٹاسٹک تھا۔ بہت بہت مبارک باد جی.... اتنا زبردست ناول تخلیق کرنے پر۔ ''یارم'' ہی پڑھا ہے اب تک۔ باقی رسالہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی' ابھی تک اس کے سحر میں جو جکڑے ہوئے ہیں' اب تک تمام کردار ہی بہت اچھے تھے۔ مجھے کارل کا کردار بہت پسند آیا ہے۔ یہ ناول بھی برسوں شاید تاحیات ''جنت کے پتے'' اور ''پیر کامل'' اور ''مصحف'' کی طرح ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ بنت حمید! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ واقعی ہی ساحرہ ہیں۔

پارس! شعاع کی بزم میں خوش آمدید!

اتنی کم عمری میں اتنا اچھا لکھنا خداداد صلاحیت ہے اور بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔

گل صفر سہیل

## پسند

شمعون عباسی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اپنی عمدہ اداکاری کی وجہ سے شمعون عباسی نئے فلمسازوں کی اولین پسند ہیں۔ آج کل وہ اپنی فلم گدھ اور ڈیبل کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اب ہدایت کار بلال لاشاری نے انہیں اپنی فلم "مولاجٹ 2" میں لے لیا ہے۔ (کوئی اور موضوع نہیں ملا جو.....) اس سے پہلے اس فلم میں حمزہ علی عباسی، صنم جنگ (کیا۔ حمزہ علی عباسی اور صنم جنگ اور جٹ؟) اور عدنان جعفر کے ناموں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اب اس لسٹ میں شمعون بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ اطلاع نہیں مل سکی کہ شمعون اس میں جٹ بنیں گے یا نوری نت" (ہمارا خیال ہے کہ وہ اس میں "نوری نت

## نقصان

اپنے بچوں کو چیونگم کھانے سے روکیے، کیوں کہ طبی ماہرین کہتے ہیں کہ چیونگم کے اجزاء ہمارے خون میں جذب ہو کر متعدد امراض کا باعث بنتے ہیں۔ اس میں پانچ اجزا شامل کیے جاتے ہیں جو کہ صحت کے لیے انتہائی مضر ہیں۔ ماہرین کے مطابق چیونگم چبانے سے جو جسمانی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی وجہ ایسپارٹیم ہے۔ جو چیونگم میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مادہ زہریلی خاصیت رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اعصابی بیماریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ چیونگم میں شامل بی ایچ ٹی کی زیادتی جگر، گردوں کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح چیونگم میں شامل باقی تین اور اجزا سینے کی جلن، بد ہضمی اور الرجی کے ساتھ ساتھ دمے کے مرض میں مبتلا کر سکتے ہیں۔

"کا کردار کریں گے) خیر وہ اس میں جو بھی بنیں ہمیں اور ان کے پرستاروں کو امید ہے کہ وہ اپنا کردار انتہائی خوب صورتی سے ادا کریں گے۔

## حیرت

اریبنا خان کو آپ آج کل ڈراما سیریل "عشق پرست" میں دیکھ رہے ہیں (اور دیکھ کر سر پیٹ رہے ہوں گے کہ کیا ہمارے یہاں فنکاراؤں کا کال پڑ گیا یا ساری کی ساری بھارت کو "پیاری" ہو گئیں) جو اریبنا خان کینیڈا میں پیدا ہوئیں اور یو کے کے بعد یوائے ای میں ہی پلی بڑھیں۔ اریبنا ان دنوں دو فلموں میں بھی کام کر رہی ہیں۔ جن میں ایک تو ہمایوں سعید کی 'دبن روئے' ہے' دوسری فلم "یلغار" ہے جس میں وہ بلال اشرف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ اریبنا خان اس بات پر بہت خوش ہیں کہ وہ مسز عمران خان (بھئی وہی دھرنے والے) یعنی ریحام خان کی پروڈکشن میں بننے والی ایک فلم میں بھی مرکزی کردار کر رہی ہیں۔ ریحام خان کا یہ پہلا فلمی پروجیکٹ ہے جسے وہ عمران کا ظمی (یعنی عمران ہی ہو چاہے خان یا کاظمی...) کے ساتھ مل کر کر رہی ہیں۔ یہ ایک رومینٹک کامیڈی فلم ہے۔ (عمران خان... کی بیگم... فلم... بنا رہی ہیں؟ اور وہ بھی رومینٹک... اور کامیڈی حیرت ہے بھئی۔)

## مشن

جدہ سے تعلق رکھنے والی پہلی خاتون فلمساز سمیرا عزیز جن کے والدین پاکستانی تھے تاہم وہ سعودی شہری ہیں، بھارت میں سعودی پروڈکشن ہاؤس کے بینر تلے فیچر فلم بنا رہی ہیں۔ سمیرا عزیز کہتی ہیں کہ اگر وہ چاہتیں تو ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ وہ عام سعودی خواتین کی طرح عیش و عشرت سے بھری زندگی میں رچ بس جاتیں۔ رات بھر سہیلیوں سے گپیں لگاتیں اور دن بھر سویا کرتیں، خریداری اور سیر و سیاحت میں وقت صرف کرتیں۔ لیکن ان کو ایک مشن کے ساتھ زندگی گزارنا پسند ہے۔ کہ جب وہ اس دنیا سے جائیں تو دنیا میں ان کی شخصیت کو یاد رکھا جائے وہ ایک محب وطن سعودی خاتون ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ سعودی عرب کے بارے میں جو غلط اور منفی پروپیگنڈہ پھیلا ہوا ہے اسے میڈیا کے ذریعے درست کریں۔

## گود بھرائی

لیجیے جناب بہروز سبزواری دادا بنے تو جاوید شیخ نے بھی نانا بننے کی تیاری کر لی۔ جی ہاں ان کی بیٹی مومل شیخ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے پر بہت خوش ہیں اس بات کا اعلان انہوں نے ایک گرینڈ گود بھرائی کی رسم میں کیا جس میں بہت سارے فنکاروں نے شرکت کی اور فنکار گھرانے کی اس تقریب میں تھیم پر ڈریسنگ کی گئی (جی ہاں پیسوں کے چونچلے ہیں یہ سب) اس تقریب کو دیکھ کر گود بھرائی کے بجائے کسی فیشن شو کا گمان گزرتا تھا (ایک ایسے ملک میں جہاں مٹھی میں بھوک سے بچے مر رہے ہیں، ایک آنے والے بچے کا اس طرح استقبال....) جہاں پر ہونے والے بچے کی خالائیں اور پھوپھیاں بھی ایک خاص طرز کے کپڑے پہنے اپنی محبتوں کا اظہار کرتی نظر آئیں۔ ہماری دعائیں مومل اینڈ فیملی کے لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خوشی کو قائم دائم رکھے۔

شعاع کے پچھلے شمارے میں ایک قاری بہن نے تحریروں میں ہندی الفاظ کی شمولیت پر اعتراض کیا تھا۔ سائرہ رضا نے اس مضمون میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے۔

# اردو ہے جس کا نام

سائرہ رضا

کسی دانا کا قول ہے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ اور عام بول چال میں کہوں تو پرائے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ مگر کیا کیجیے کہ سارا جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ (اسی لیے جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔

کچھ قارئین کہتی ہیں "اردو کا جنازہ جا رہا ہے۔ جی ہاں۔

ہماری کچھ بہنوں کو لگتا ہے خدانخواستہ اردو مر رہی ہے۔ میری پیاریوں اردو کیسے مر سکتی ہے۔ جب تک آپ جیسی پڑھنے والی موجود ہیں۔ اور ہم جیسی (ناچیز) لکھنے والیاں "اردو کیسے مر سکتی ہے۔ ہم بھلا مرنے دیں گے۔ کہ اردو مرتی ہے تو ہمارا (لکھنے والیوں کا) تو وہی حال ہوگا۔ جو پرانے ہندو رسم و رواج کے مطابق پتی کے ساتھ پتنی کو بھی ستی کر دیا جاتا تھا۔ یعنی اردو کی موت ہم سب کو بھی چتا پر لا بٹھائے گی کہ۔

ہم سب ختم ہو جائیں گی اور بقول شاعر

ع ہمیں تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

میرے اس مکتوب کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں لکھنے والیوں کے حق میں بیان دوں گی کہ وہ ہندی کے الفاظ دھڑلے سے استعمال کرتی رہیں اور احتجاج پر قطعاً "کان نہ دھریں"۔ (ان کی اتنی ہمت۔)

مگر میں کچھ حقائق کو بیان کرنا چاہتی ہوں۔ اور حقائق بھی کیا بس کچھ غلط فہمیاں ہیں اور تاریخی تناظر میں اردو کی تاریخ بس۔

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں کئی روایات مشہور ہیں لیکن مہندر رہیو نے اپنے روزنامچے میں جس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی بنیاد حضرت نظام الدین اولیاء کے حکم پر رکھی گئی۔ مہندر رہریو لکھتا ہے۔

"ایک رات حضرت محبوب الٰہی نے اپنی مجلس خاص میں امیر خسرو، خواجہ حسن سنجری، خواجہ سید محمد ان کے بھائی خواجہ سید موسیٰ اور اپنی بہن کے پوتے خواجہ سید رفیع الدین ہارون، میرے ہم وطن سنبھل دیو، چیتل دیو، سسیل دیو اور مجھے طلب کیا۔ پھر جب لوگ جمع ہو گئے تو ارشاد فرمایا۔

"تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے اپنے اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان استعمال کریں تاکہ تمام لوگوں کو آپس کی بات چیت اور لین دین کے معاملات طے کرنے میں آسانی ہو۔

حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ سید محمد نے بیک زبان عرض کیا۔

"ہم دونوں مخدوم کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔" امیر خسرو نے مزید عرض کیا۔ "میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مختصر کتاب تحریر کر رہا ہوں۔ جس کا نام خالق باری تجویز کیا ہے۔"

"اس کتاب کا کچھ حصہ سناؤ۔" حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت امیر خسرو کو حکم دیا۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی اس منظوم کتاب خالق باری کے اشعار پیر و مرشد کو سنائے۔ حضرت محبوب الٰہی نے ان اشعار کو پسند کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"بہت مفید چیز ہے مگر ہندی زبان میں ایسے اشعار بھی لکھو جنہیں لوگ گایا کریں۔

چھاپ تلک سب چھین لی موسے نیناں ملائے کے۔ (امیر خسرو)

(تیری ایک نظر کا یہ اثر ہے کہ تو نے بت پرستی کے سارے نشانوں کو مٹا ڈالا۔)

اس کے بعد حضرت شیخ نے دوسرے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آج کل ہماری "فارسی" اور امیر خسرو کی "ترکی" زبان کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے الفاظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور محفلوں میں ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے اس لیے انہیں سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں

اور خود ان کے دلوں کی حالت کو سمجھ سکیں۔ اور یہ جب ہی ہو گا کہ وہ ضد چھوڑ دیں۔ اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہندی بول چال کو فروغ دیں۔

یہ 636ھ سے 725ھ تک کے واقعات ہیں اور الحمد اللہ اب ایسی صورت حال نہیں کہ دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ چیزیں مختصر سے مختصر ہو چکی ہیں۔ مادی حالتیں بھی اور غیر مادی بھی۔ جیسے جتنا بڑا ریڈیو اب انگلی کی پور برابر کان میں گھسا ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ جیسا بھاری بھر کم جملہ Love You I سے سمٹ کر I-L-U ہو گیا ہے۔

میں خود میسج لکھتے ہوئے آفس کی انگلش Ofc لکھتی ہوں ناول کو Nvel لکھتی ہوں۔ (اور اس کے لیے فکر مند بھی ہوں)

خیر یہ موضوع بحث نہیں۔

ہم سب کو ذہنی روشن خیالی اور عصبیت کے منفی اثرات سے بچ کر چلنا ہو گا۔

لکھاری انگلش کے الفاظ کا استعمال کرے۔ شیکسپیئر اور ملٹن کی بات کرے تو بہت پڑھا لکھا کہلائے گا۔ درجہ سب سے اوپر۔

لکھاری عربی تشبیہات لکھے تو زبان دان۔

فارسی لکھے تو علم دان۔

علاقائی زبانوں کا تڑکا لگا دے تو قدر دان۔ اور ہندی لکھیں تب اگال دان۔

سفال گر میں می رقم پڑھ کے ہم سر دھنتے ہیں۔ می رلعصم کیا پاکستان میں بولی جانے والی اردو ہے۔

قومی ترانے کے الفاظ میں سے ترکی زبان کے لفظ نکال دیں تو پیچھے صرف سانتے کا حقے بچ جاتے ہیں۔ اب گائیں۔

جنوبی ایشیاء میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کا منبع قدیم سنسکرت ہے۔ چھلنی میں لے کر اردو کو چھان لیں۔ خالص اردو کے نام پر خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

پریم چند اردو کے ناول نگار، افسانہ نگار بہت بلند مرتبہ۔ دیہات اور ہندو گھرانوں کی زبان استعمال کرنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔

محمد عظمت اللہ خان نے ہندی کی بحریں لے کر انہیں نئی نئی شکلیں دیں اور شاعری کی موسیقیت میں اضافہ کیا۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا
میرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

(وقت اور جگہ کی شدید ترین کمی۔ کاش میں یہ نظمیں غزلیں پوری لکھ سکتی)

اگر خواتین شعاع کی قارئین کا دل ٹھنڈا کرنے پر آجاؤں تو اردو اختیاری کی کتاب سے یہ اوراق پھاڑ رہی ہوں۔ اردو کی کتاب میں ہندی بحروں اور تشبیہات کا کیا کام۔ لیجئے کتاب آدھی رہ گئی۔ ہندی کے بوجھ سے آزاد۔ جلدیں جھولتے چند اوراق۔

ورق پھاڑنے پر ہی آگئی ہوں تو نسخہ ہائے وفا کا صفحہ 533 بھی نکال دیتے ہیں۔

موری ارج سنو (نذر خسرو)

چاہے وہ آئیں یا نہیں آئیں
آنکھیں موندے کے نت بل دیکھیں

اب اور کیا لکھوں ' حالانکہ اتنا کچھ ہے کہ چناؤ مشکل ہے۔ میرے اس مکتوب کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں ہندی لکھنے والوں کی ہمت بڑھا رہی ہوں کہ لگے رہو۔ قطعی نہیں۔ میری چھوٹی بیٹی بھی اس منحوس مارے چھوٹے بھیم کو دیکھ دیکھ کر "سپنے" ہی دیکھتی ہے۔ تب میں اسے خواب بتاتی ہوں۔ اس کے جملوں پر ہندی کے گہرے اثرات ہیں۔

مگر خرابی کی جڑ کو پکڑنے کی ضرورت ہے۔ شاخوں سے کیا جھولنا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے بتائیے۔ پاکستان میں میڈیا کی ترقی کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ اتنے ڈرامے بن رہے ہیں کہ دو دو سال کے فاصلے پر اداکار دستیاب نہیں۔ ایک سے ایک نامور پروڈکشن ہاؤس اور مالکان کی گردن میں سریا' کسی ایک نے بھی بچوں کے لیے سلیس اردو میں کوئی ڈراما بنایا۔ نہیں ناں۔ اور خدا کی قسم یہ لائنیں لکھتے ہوئے میرا دل بھر آیا ہے۔

بچے پھر کیا کریں گے۔ چھوٹا بھیم دیکھیں گے ناں۔ ہائی مرو' گجراتی زبان و لہجہ۔

ہم صرف ڈائجسٹ رائٹرز کو موردِ الزام کیسے ٹھہرا سکتے ہیں جو صرف اور صرف لکھنے کی روانی (ماشاء اللہ) لکھتی چلی جاتی ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ہماری کوئی بھی لکھنے والی بہن شعوری کوشش یا کسی خفیہ منصوبے کے تحت ہندی کا تڑکا لگاتی ہوگی۔ جب سائرہ رضا اری او چھوکری لکھتی ہے' تب امر کلا ہندی ہی بولے گی۔

اب امر کلا' کلام غالب بزبان ضیاء محی الدین سنانے سے تو رہی۔

جس طرح مال کی زکوٰۃ ہوتی ہے ایسے ہی جسم کی زکوٰۃ روزہ ہوتی ہے۔ ایسے ہی ہنر کی بھی زکوٰۃ نکالی جاسکتی ہے۔ میں رومانٹک ہلکی پھلکی معاشرتی کہانی لکھتی ہوں۔ لیکن میں بلدیہ فیکٹری کے حادثے سے ہی متاثر ہوتی ہوں۔ ..... تھر کا غم بھی رلاتا ہے مجھے سانحہ پشاور بھی میرے دل کو لہو کرتا ہے پھر اس عالم میں جب قلم اٹھاتی ہوں تب میں اسے اپنے ہنر کی زکوٰۃ کہتی ہوں۔

تو کیا اسی سوچ کو ذہن میں رکھ کر چینلز اور پروڈکشن ہاؤسز' رائٹرز اور اداکار کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جس سے قوم کے بچوں کی تربیت ہو سکے۔ مگر نہیں ہم نے "سب ٹی وی"' پوگو' اور کارٹون نیٹ ورک پر بچیوں کو لگا دیا ہے۔ اپنے ہنر اور کام کی بھی زکوٰۃ نکالنی چاہیے کہ کسی نیک کام میں لگایا یا صرف مال بنایا۔؟

اردو بہت سلیس اور خوب صورت زبان ہے۔ اور دن بدن نکھرتی ہی جاتی ہے۔ ہماری گلیوں بازاروں میں پوری لنگویج نہیں بولی جاتی۔

تیرے کو آنے کا نہیں۔ میرے کو جانے کا نہیں' اے کیا بولتی تو۔ ہمارے بازاروں' راستوں گھروں اسکولوں میں تو بڑی شستہ اردو بولی جاتی ہے۔ اور اردو کی خوب صورتی سے کسے انکار ہے۔ ہم تو خود اغ کے طرف داروں میں سے ہیں کہ

اردو ہے جس کا نام ہم ہی جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور پھر مشہور فلمی شاعر گلزار کی اردو شاعری۔ بس بندہ دل پکڑ لے۔

ہو جس کی زبان اردو کی طرح
میری شام رات' میری کائنات' وہ یار میرا چھیاں چھیاں

اور جاتے جاتے یہ بھی بتا دوں (مرے پہ سو درے) 2013 میں بی کام کے نصاب سے اردو کو نکال دیا کہ یہ غیر ضروری مضمون ہے۔

افسوس ناک خبر یہ بھی ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں کے نام پر ہمارے بچے اب اردو اسلامیات اور معاشرتی علوم میں سپلی لاتے ہیں۔

سو میں بھی ان ہی بہنوں کی حامی ہوں جو اردو کے لیے پریشان ہیں۔ مجھے بھی آغاز کی جگہ لفظ شروعات ناپسند ہے۔ کر کے اور لے کر کے کا فرق معلوم ہے۔ اور ناگوار گزرتا ہے۔ اور حتی الامکان کوشش کروں گی کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔ لیکن لکھنے کی روانی میں ہمیں بعض اوقات بالکل پتا نہیں چلتا کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ صحیح یا غلط' میرے ساتھ تو اکثر ایسا ہوتا ہے۔

## بقیہ دستک

"مجھے کپڑوں کا بہت شوق ہے' تو زیادہ فضول خرچی کپڑوں پہ ہی ہو جاتی ہے۔ مجھے چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پسند ہے۔ گھر میں بھی زیادہ تر یہ ہی لباس پہنتی ہوں یا پھر جینز۔"

"دبلی بہت ہیں آپ؟"

قہقہہ... "اس سے یہ نہ سمجھیے گا کہ میں کھانے کے معاملے میں کنجوس ہوں۔ بھوک تو مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتی... بس قدرت مجھ پر مہربان ہے کہ وہ مجھے موٹا ہونے نہیں دیتی۔ کچھ لوگ ہوا کھا کے بھی موٹے ہو جاتے ہیں اور کچھ کھا کے بھی موٹے نہیں ہوتے' تو میرا یہ ہی حساب ہے۔"

"عام زندگی میں کیا مزاج ہے آپ کا؟"

"تھوڑی سنجیدہ ہوں' شوخ و چنچل ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں' زیادہ تقریبات میں جانا اور ہلا گلا کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی ہوں' مگر زیادہ نہیں۔"

"ہوں گڈ... میرے خیال سے اب آپ لنچ کرلیں۔"

"جی شکریہ..."

### منشا پاشا

"کیسی ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ڈرا ڈیں' میں آپ کی پرفارمنس بہت عمدہ تھی۔ اچھا رسپانس ملا ہوگا؟"

"شکریہ... رسپانس بہت اچھا ملا... لوگوں نے میرے کام کو کافی پسند کیا ہے۔"

"کہانی حقیقت سے قریب لگی؟"

"بالکل لگی... کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی کہانی تھی اور "بے وفائی تیرے نام" اس میں بھی میرا کردار بہت اچھا ہے' دیکھ رہی ہیں آپ؟"

"جی جی بالکل دیکھ رہی ہوں۔ عام ڈراموں سے ہٹ کر آپ کا کردار ہے منفرد... اور مزید کام ہو رہا ہے؟"

"ہاں... اللہ کا شکر ہے... مگر میں ہر ڈرامہ سائن نہیں کرتی' تھوڑی **سلیکٹو** ہوں' جو کردار دل کو چھوتا ہے' وہ ہی کرتی ہوں۔"

"ماشاء اللہ کافی ڈرامے کیے' مگر لوگوں کو زندگی اور میرے اپنے میرے سپنے یاد ہیں' کیوں؟"

"اچھا... میں تو سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے' شاید اس لیے کہ وہ میرے شروع کے ڈرامے تھے اور کردار بھی اچھے تھے' اس لیے یاد ہوں گے۔ میں تو کوشش کرتی ہوں کہ میرے سب ہی ڈرامے لوگوں کو یاد رہیں۔"

"آئندہ زندگی کے کیا پلان ہیں؟"

"لمبی پلاننگ نہیں کرتی' ایک تو زندگی کا بھروسا نہیں' پھر وقت اور حالات کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا' تو اس سال کے لیے کچھ ڈرامے پلان کیے ہیں' کچھ سائن بھی کیے ہیں' تو بس یہ ہی کچھ ہے۔"

"کمرشلز بھی ساتھ ساتھ چل رہے ہوں گے؟"

"جی جی... کمرشلز کے لیے بھی چوزی ہوں... سب کو یس نہیں کرتی... بے شک پیسہ اچھا ملتا ہے' مگر سب کچھ پیسہ ہی تو نہیں ہوتا۔"

# موسم کے پکوان

## خالدہ جیلانی

### اروی کے کباب

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| اروی | ایک کلو |
| پیاز | دو عدد |
| (باریک چوپ کرلیں) | |
| بیسن (بھون لیں) | ایک کپ |
| لال مرچ پاؤڈر | ڈیڑھ چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| گرم مسالا پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ |
| انار دانہ کھٹائی | ایک ایک چائے کا چمچہ |
| ہری مرچیں | تھوڑی سی (باریک کٹی ہوئی) |
| ہرا دھنیا | آدھا گٹھی (باریک کٹا ہوا) |
| تیل | تلنے کے لیے |

ترکیب :

اروی کو ابال کر چھیل لیں اس کا بھرتہ بنالیں بھرتے میں پیاز 'لہسن کٹا ہوا' دو جوے 'بیسن' لال مرچ پاؤڈر 'نمک 'گرم مسالا پاؤڈر 'پسی کھٹائی 'انار دانہ کٹا ہوا' ہری مرچیں 'ہرا دھنیا ڈال کر مکس کرلیں اب ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا کر گرم تیل میں گولڈن ہونے تک تلیں۔ کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔ پراٹھے یا طھری کے ساتھ بھی کھاسکتے ہیں۔

### چکن دہی دھواں

اشیاء :

| | |
|---|---|
| چکن | آدھا کلو |
| دہی | ایک پاؤ |
| پیاز | دو عدد |
| پپیتا | دو کھانے کے چمچے |
| لال مرچ پسی | دو چمچے |
| پسا گرم مسالا | آدھا چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| پسا ہوا دھنیا | ایک کھانے کا چمچہ |
| ہری مرچ | تین سے چار |
| ہرا دھنیا | آدھی گٹھی |

ترکیب :

چکن میں لہسن 'ادرک 'لال پسی مرچ 'گرم مسالا' نمک 'پسا ہوا دھنیا اور پپیتا لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں اور اس میں کوئلے کی دھونی دے دیں۔ پیاز کو تل لیں سنہرا ہونے پر اس میں گوشت ڈال دیں اور اس کو بھون لیں۔ جب گوشت گل جائے اور اس کا پانی خشک ہو جائے تو اسے سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ دہی کو الگ سے پھینٹ کر اس میں چٹکی بھر نمک ملا لیں اور اس کو بھنے ہوئے گوشت پر پھیلا دیں۔ پھر اس کے اوپر کٹی ہوئی لچھے دار پیاز 'ہرا دھنیا ڈال کر حسب ذائقہ چاٹ مسالا اور ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیں۔ چپاتی یا نان کے ساتھ نوش کریں۔

### اسٹریٹ مصالحہ بریانی

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| مرغی کا گوشت | ایک کلو |
| پیاز (سلائس کاٹ لیں) | تین عدد |
| ٹماٹر | ایک پاؤ |
| ادرک 'لہسن پیسٹ | دو کھانے کے چمچے |
| ثابت گرم مسالا | ایک کھانے کا چمچہ |
| زیرہ | ایک کھانے کا چمچہ |
| دھنیا 'سرخ مرچ پاؤڈر | دو 'دو کھانے کے چمچے |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل 'دہی | ایک ایک کپ |

| | |
|---|---|
| آلو بخارے | 13-10عدد |

چاولوں کے لیے

| | |
|---|---|
| چاول | ایک کلو |
| ثابت گرم مسالا | ایک چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| کھانے کا زرد رنگ | حسب ضرورت |
| ٹماٹر (سلائس کاٹ لیں) | دو عدد |
| پودینہ | آدھا کپ |
| ادرک (جولین کٹ) | دو کھانے کے چمچے |
| ہری مرچیں | چار سے پانچ عدد |

ترکیب :

چاولوں کو آدھا گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں۔ پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز شامل کریں۔ پیاز کی رنگت سنہری ہو جائے تو نکال لیں۔ تلی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور دہی بلینڈ کر کے پیسٹ تیار کریں۔

بقیہ تیل میں ادرک، لہسن پیسٹ ڈالیں۔ ہلکا سا فرائی کر کے گوشت شامل کریں۔ گوشت کی رنگت تبدیل ہونے لگے تو اس میں تین چھوٹی الائچی، ایک بڑی الائچی، پانچ لونگیں، آٹھ ثابت سیاہ مرچیں، ایک انچ کا ٹکڑا دار چینی ڈال دیں۔ زیرہ بھی شامل کر دیں۔ پیاز اور دہی کا پیسٹ ڈال دیں سرخ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور نمک شامل کریں۔ گوشت گل جائے اور گریوی تیار ہو جائے تو اس میں آلو بخارے شامل کر کے چولہے سے اتار لیں۔

چاول تیار کرنے کے لیے پتیلی میں پانی ابلنے کے لیے رکھیں، ایک بڑی الائچی، ایک ٹکڑا دار چینی، تین لونگیں، پانچ ثابت سیاہ مرچیں اور نمک شامل کر دیں پانی ابل جائے تو چاول ڈال دیں۔ ایک کنی باقی رہ جائے تو چاول نتھار لیں۔

ایک پتیلی لے کر اس کو ہلکا سا چکنا کر لیں۔ اس میں تیار شدہ گوشت ڈالیں۔ اس کے اوپر چاولوں کی تہہ لگائیں۔ اس کے اوپر دوبارہ گوشت کی تہہ لگائیں اس طرح تہہ در تہہ گوشت اور چاول بچھا دیں خیال رہے کہ سب سے اوپر چاولوں کی تہہ ہونی چاہیے۔ اس کے اوپر ٹماٹر کے سلائس، پودینے کے پتے، ادرک اور ہری مرچیں رکھ دیں۔ کھانے کا زرد رنگ پانی یا دودھ میں گھول کر چاولوں کے اوپر چھڑک دیں۔ پتیلی کا منہ سختی سے بند کر کے 20-15 منٹ تک دم لگا دیں۔ مزیدار اسٹریٹ مصالحہ بریانی، رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

## دہی چکن سینڈوچ

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| دہی (پھینٹ لیں) | آدھا کپ |
| چکن (بون لیس) | آدھا کپ |
| ڈبل روٹی | آٹھ عدد |
| کھیرا (درمیانہ) | ایک عدد |
| ٹماٹر | دو عدد (باریک چوکور کاٹ لیں) |
| ہرا دھنیا (باریک کاٹ لیں) | دو چمچے |
| ہری مرچ | چھ عدد (باریک کاٹ لیں) |
| سیاہ مرچ پاؤڈر | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| زیرہ پاؤڈر | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |

ترکیب :

چکن اُبال کر ریشہ کر لیں۔ دہی میں چکن، کھیرا، ٹماٹر، ہرا دھنیا، ہری مرچ، سیاہ مرچ پاؤڈر، نمک اور زیرہ پاؤڈر ملا دیں۔ ایک سلائس لے کر اس پر یہ آمیزہ لگائیں اور اوپر دوسرا سلائس رکھ دیں پھر تکون شکل میں دو پیس کاٹ لیں۔ اسی طرح تمام سلائس بنائیں۔

دہی چکن سینڈوچ تیار ہیں چائے کے ساتھ سرو کریں۔ یا بچوں کو لنچ میں دیں۔

امت الصبور

## بیٹی کی محبت

لال قلعہ جس کی فصیل کے سنگ سرخ صاحبقراں شاہجہاں کی عظمت و شوکت اور جاہ و جلال کی منہ بولتی داستان تھے۔ آج نہ جانے کیوں اداس تھے۔ اچانک نوبت شاہی کی آواز گونجی' قرنا نے صدا دی۔

"بے شک شاہ جہاں ہندوستان کا عظیم بادشاہ ہے۔ بے شک سلطنت مغلیہ دنیا کی عظیم سلطنت ہے۔"

"لیکن ادھر قرنا خاموش ہوئی اور ادھر مؤذن پکارا۔"

"اللہ اکبر....."

اور شاہ جہاں نے علالت کے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم! تو ہی سچا ہے۔ تو ہی عظیم ہے اور کبریائی تیری ہی چادر ہے۔ شاہ جہاں کی عظمت کا سفینہ دریا پر تیرنے والے ایک حباب سے زیادہ نہیں ہو۔ موج اچھلی اور حباب ٹوٹا۔"

جہاں آرا..... اس کی ذہین و فہیم اور چہیتی بیٹی تھی۔ وہ اس پس منظر کو عقل کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی جو شاہ جہاں کے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ وہ باپ کے قریب آگئی کہ شاید شفیق باپ کے دل کو ڈھارس دے سکے۔ لیکن آج تو..... شاہ جہاں اپنے سایہ سے بھی بدگمان تھا کہ اس کے جگر نے اس کے دل سے بغاوت کردی تھی اور وہ محسوس کررہا تھا کہ یہ انقلاب وقت ہے اور اس کا مقدر پلٹ چکا ہے۔

شاہ جہاں نے حسرت بھری نظر سے جہاں آرا کو دیکھا۔ شاہ جہاں کے لب تھرتھرائے۔ اس نے آہستہ سے زیر لب کہا۔ "شہریار!" پھر ایک لمحہ کے لیے رکا' اور جہاں آرا کو دیکھتے ہوئے اس نے پھر کہا۔ "مراد! روشن آرا' محی الدین اور تم! سب ہی تو میری آنکھوں کا نور ہیں۔ سب ہی تو میرے دل کا سرور ہیں' لیکن یہ نور....."

پھر اس کے لبوں پر ہلکی سی ہنسی آئی۔

"ایسا لگتا ہے میری آنکھوں کی پتلیوں کو چھوڑ رہا ہے۔ دل کہتا ہے کہ سرور سے جگہ خالی ہے اور اسی خالی جگہ میں رنج والم بھر گیا ہے۔ تم یہاں کیوں ہو..... چلی جاؤ یہاں سے۔" شاہ جہاں کی آواز بلند ہوئی۔

"کیا دیکھنا چاہتی ہو کہ شاہ جہاں کے پاؤں میں بجنے والی زنجیروں کا ترنم کیسا ہے۔"

جہاں آرا اچانک جھکی اور اس نے شاہ جہاں کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

"میرے لیے ان ہی تلوؤں کے نیچے بہشت پنہاں ہے۔ زندگی صرف اقتدار نہیں ہے' زندگی صرف دولت و ثروت نہیں ہے۔ کبھی بادشاہوں کو زندانوں سے رسوائی ملتی ہے۔ کبھی یوسفوں کو قید خانوں سے اعزاز ملا ہے۔ شاہ جہاں بھی اگر پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے گا تو عبرت دنیا ہی سہی۔ صاحب اقتدار سے اقتدار چھین لینے کی ناروا کوشش سہی۔ شکست حق تو نہیں۔ ہزیمت شاہ جہاں تو نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور اس وقت تک آپ کے ساتھ ہوں کہ موت ان رشتوں کو توڑ دے جن میں فطرت نے باپ اور بیٹی کو عمر بھر کے لیے باندھ دیا ہے۔"

شاہ جہاں کے چہرے پر ایک رنگ آیا' اطمینان کا رنگ۔

اچانک باپ کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر آئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلائے۔

"جان من! میری لاڈلی۔ آ اور میرے سینے سے لگ جا۔ ہم نہیں جانتے کہ قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ ایک باپ کی محبت وہ تھی کہ بیٹا بیمار ہوا اور باپ نے دعا کی۔ "الٰہی! اس کی آئی مجھے

دے دے۔" اور اللہ نے دعا سن لی۔ "بیٹا صحت یاب ہو گیا اور باپ نے جان دے دی۔ ایک بیٹے کی محبت یہ ہے کہ باپ بیمار ہے اور وہ اس کی مزاج پرسی و عیادت کے لیے لوہے کی زنجیر لا رہا ہے۔ وہ باپ بھی ہمارے ہی خاندان کا تھا اور یہ بیٹا بھی ہمارے ہی خاندان سے ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا۔ وہ ہمارے جد امجد تھے اور ہم ان کی ذات پر ناز کرنے کا حق رکھتے ہیں اور....." جہاں آرا نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی میرے ہی بھائی ہیں اور میرے لیے پاس ادب ہے کہ میں اپنے بھائیوں کے حق میں خاموش رہوں۔"

"اور یہ ان کا پاس ادب ہے کہ وہ ہمارے لیے زنجیریں لا رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ ہمارا اقتدار دین کی راہ میں کمزور ہو گیا ہے۔ لیکن میری لاڈلی۔ یہ جامع مسجد میرے ایمان کی گواہ ہے۔ جب بھی موذن مادنہ میں اذان دے گا۔ شاہ جہاں آباد کی فضا میں اللہ اکبر کی آواز گونجے گی۔ جب بھی منبر پر خطبہ دے گا' تو لوگ کہیں گے کہ وہ ایمان دار تھا' یہ مسجد' اس کے ایمان کی گواہ ہے۔"

جہاں آرا نے گردن جھکالی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو کہو۔ ہمارے کان تمہاری ہر بات سننے کی تاب رکھتے ہیں۔"

"میری ناچیز استدعا ہے کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنے عزیز بھائی سے مل سکوں' پوچھ لوں کہ کیا ایک شفیق باپ کے لیے' قید خانہ سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔"

"نہیں! ہماری غیرت کو یہ گوارا نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم رحم کی بھیک مانگیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اپنے بیٹے کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اب تک آل تیمور کی یہ ریت رہی ہے کہ بیٹے باپ کے سامنے آتے تھے تو سرخرو ہو کر۔ لیکن اب ہماری آنکھیں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں کہ باپ' بیٹے کے سامنے جاتا ہے تو اپنے سر کے لہو میں ڈوب کر۔ بھائی بھائی کے سامنے آتا ہے تو اپنے خون میں رنگا ہوا شاہانی جوڑا پہن کر۔"

"نہیں۔ نہیں.... خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔"

جہاں آرا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"جان من! ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہو گا کہ اقتدار کی ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اب ہم شاہ جہاں نہیں ہیں۔ ایک قیدی ہیں تمہارے بھائی کے قیدی۔"

"لیکن آپ شاہ جہاں ہیں اور شاہ جہاں ہی رہیں گے۔ جب تک یہ لال قلعہ ہے۔ جب تک یہ جامع مسجد ہے۔ خدا کی قسم' سلطنت مغلیہ کی تاریخ میں آپ شاہ جہاں ہی رہیں گے۔ آپ کی عظمت ان پتھروں کی ایک لکیر ہے' جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔"

اچانک بادشاہ خاموش ہو گیا۔ فوج کے افسروں نے اسے اپنے حلقہ میں لے لیا' ایک فرمان۔

"اب آپ ہمارے قیدی ہیں۔"

"بے شک تم ہمارے جسم کو اسیر کر سکتے ہو' لیکن یاد رکھو کہ ہمارا دل' ہماری روح' ہمارا دماغ تمہارا اسیر نہیں ہے۔"

جہاں آرا یاس و حرماں کی ایک تصویر بنی کھڑی تھی۔ باپ قیدی بنا تو وہ آگے بڑھی کیا ہمارے بادشاہ کی اجازت ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ قید میں رہوں۔"

"ہاں اجازت ہے۔" ایک افسر نے جواب دیا۔

اور جہاں آرا نے اپنے ہاتھ سے اپنی کلائیوں میں ہتھکڑی ڈالی۔ اپنے پاؤں میں بیڑی پہن لی۔

اس نے سجدہ کیا۔ "اے خدا! شکر ہے' مجھے اطاعت پدری کی توفیق دے کہ میں اس راہ سے صبر کے ساتھ گزر جاؤں۔"

اور وہ اس راہ سے صبر ہی کے ساتھ گزر گئی۔ تاج محل نے اگر شاہ جہاں کو خلعت جاودانی دے دیا ہے تو اطاعت پدری نے جہاں آرا کو بھی زندہ جاوید بنا دیا ہے' جب بھی شاہ جہاں کا نام دنیا کی زبان پر آئے گا تو جہاں آرا کی وفا بھی یاد آئے گی۔

## فیشل

سب سے پہلے کولڈ کریم سے خوب اچھی طرح مساج کریں' اتنا مساج کریں کہ چہرا سرخ ہو کر دہکنے لگے۔ اب کسی برتن میں ابلتا ہوا گرم پانی لے کر چہرے اور گردن کو تولیے سے خوب اچھی طرح ڈھانپ کر بھاپ لیں۔ خیال رہے کہ برتن ذرا فاصلے پر ہونا ضروری ہے۔ جب پسینہ آجائے تو تولیے سے چہرہ صاف کرلیں۔ فیشل کے ذریعے آپ کے چہرے کے مسامات میں پھنسا میل آسانی سے صاف ہو جائے گا۔

## ماسک

سب سے پہلے اپنی جلد کی مناسبت سے ماسک کا انتخاب کرلیں' مثلاً" خشک جلد کے لیے مونسچرائزر ماسک' چکنی جلد کے لیے کلینزنگ ماسک اور نارمل جلد کے لیے کوئی بھی ماسک منتخب کیا جاسکتا ہے۔ چہرے پر ماسک اس طرح لگائیں کہ آنکھوں اور ہونٹوں کا حصہ خالی رہے۔ ماسک خشک ہو کر سکڑنے لگے تو کھیرے کے دو قتلے آنکھوں پر رکھ لیں۔ اچھی طرح ماسک خشک ہو جائے تو پانی سے چہرہ دھو کر اسکن ٹانک لگائیں تاکہ کھلے مسام بند ہو جائیں پھر مونسچرائزنگ لوشن سے اچھی طرح مالش کریں۔ چہرہ صاف ہو گیا۔ اب میک اپ کی تیاری کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے چند ٹپس ملاحظہ کیجیے جو آپ کے کام آئیں گے۔

☆ چہرے اور ہاتھوں کے نشان کو کنسیلر کے ذریعے چھپالیں۔

☆ پھٹی ہوئی اور روکھی جلد پر میک اپ سے پہلے روغن بادام لگائیں پھر آئس کیوب کا مساج کریں۔ اب چہرے کو پونچھ ڈالیں۔ چہرہ میک اپ کے لیے تیار ہے۔

☆ چکنی جلد پر پاؤڈر بیس میک اپ مناسب رہے گا۔

☆ لپ اسٹک کو ہونٹوں پر پھیلنے سے بچانے کے لیے فاؤنڈیشن ہونٹوں پر بھی لگالیں۔

## میک اپ

سب سے پہلے آنکھوں کے نیچے اور ناک وغیرہ کے دھبوں کو چھپانے کے لیے کنسیلر لگائیں۔ تھوڑی اور ناک کے دائیں بائیں حصے پر کنسیلر لگانا مت بھولیے گا۔ یہ تمام حصے چہرے کے دیگر حصوں کے مقابلے میں ذرا گہرے رنگ کے حامل ہوتے ہیں۔ اب اپنی جلد سے ایک شیڈ گہرا فاؤنڈیشن چہرے پر اچھی طرح لگائیں۔ کان اور گردن پر فاؤنڈیشن لگانا مت بھولیے گا۔ چہرے پر پف پاؤڈر لگا کر زائد پاؤڈر برش کی مدد سے جھاڑلیں۔ اب رخساروں پر ہلکا سا بلشر لگائیں' ساتھ ہی تھوڑی اور کنپٹیوں پر بھی بلشر کے ہلکے سے اسٹروک لگائیں۔ بھنوؤں پر پنسل لگانے سے قبل دیکھ لیں کہ اچھی طرح بنی ہوئی ہیں یا نہیں؟ پنسل لگانے کے بعد لباس کے رنگ سے میچ کرتا ہوا یا پھر پنسل کلر آئی شیڈو لگائیں۔ آپ آئی شیڈو کی جگہ آئی پنسل بھی لگا سکتی ہیں پھر آئی لائنر لگائیں۔ لائنر بہت احتیاط سے لگائیں۔ اب مسکارا لگائیں۔ پہلے مسکارے کا ایک کوٹ سوکھنے دیں پھر دوسرا کوٹ لگائیں۔ ہونٹوں کی آؤٹ لائن لپ پنسل سے سنوار کر برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیں۔ ٹشو ہونٹوں میں دبانے کے بعد زائد لپ اسٹک صاف ہو جائے گی۔ لیجیے آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جایئے۔

لپ اسٹک میک اپ کا فنشنگ ٹچ ہوتا ہے۔ لپ اسٹک کا رنگ چہرے پر موجود دوسرے رنگوں کا آپس میں میلان بناتا ہے اور یوں چہرہ زندگی سے بھرپور لگنے لگتا ہے۔

☆